قاضی القضاۃ تقی الدین ابوالحسن علی بن عبدالکافی السبکی

کی کتاب ''شفاء السقام'' کا تحقیقی جائزہ

سفر مدینہ کی صحیح نیت

زیارت قبر مبارک، سفر زیارت، شفاعت

توسل، اغاثہ اور سماع موتی وغیرہ

مؤلف

مولانا فضل الرحمٰن بن محمد الازہری

ایم اے عربی گولڈ میڈلسٹ، ایم اے اسلامیات

شریعہ کورس الازھر القاھرۃ

ناشر

رحمانیہ مشینری سٹور، 53 نشتر روڈ لاہور فون: 59-7641358

عقیدہ لائبریری
www.aqeedeh.com

یہ کتاب عقیدہ لائبریری سے ڈاؤن لوڈ کی گئی ہے.

www.aqeedeh.com/ur/

E-mail: book@aqeedeh.com

بعض مفید اسلامی ویب سائٹس:

www.aqeedeh.com
www.sadaislam.com
www.zekr.tv
www.kalemeh.tv
www.ahlehaq.org/hq
www.islamhouse.com
www.eeqaz.com
www.tauheed-sunnat.com
www.islamic-forum.net
www.khatm-e-nubuwwat.com
www.kitabosunnat.com
www.muhammadilibrary.com
www.islamqa.info/ur
www.quran-o-sunnah.com
www.deeneislam.com
www.nadwatululama.org

قاضی القضاۃ تقی الدین ابوالحسن علی بن عبدالکافی السبکی
کی کتاب ''شفاء السقام'' کا تحقیقی جائزہ

سفر مدینہ کی صحیح نیت

زیارت قبر مبارک، سفر زیارت، شفاعت
توسل، اغاثہ اور سماع موتی وغیرہ

مؤلف

مولانا فضل الرحمٰن بن محمد الازہری

ایم اے عربی گولڈ میڈلسٹ، ایم اے اسلامیات
شریعہ کورس الازہر القاہرۃ

ناشر

انیب الرحمٰن

ریز مشینری سٹور، 53 نشتر روڈ لاہور فون: 59-7641358

جملہ حقوق محفوظ ھیں

نام کتاب

سفر مدینہ کی صحیح نیت

علامہ السبکی کی ''شفاء السقام'' کا تحقیقی جائزہ

مصنف

فضل الرحمٰن بن محمد الازھری

ایم اے عربی گولڈ میڈلسٹ ایم اے اسلامیات، شریعہ کورس الازھر القاھرۃ

تعداد 1100

پہلا ایڈیشن .... جولائی 2010ء

ناشر .... اُنیب الرحمٰن

قیمت .... 500 روپے

طابع .... زاہد بشیر پریس

ملنے کا پتہ

۱) نعمانی کتب خانہ، حق سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:042-37321865 موبائل:0344-42229127

۲) مکتبہ قدوسیہ، رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور، فون:042-37351124,37230585

۳) دارالسلام، 36 لوئر مال سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور فون:042-3720024,37111023,37232400

۴) مکتبہ اسلامیہ، غزنی سٹریٹ بالمقابل رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور فون:042-37244973

فہرست

افتتاحی کلمات	19
پیش گفتار	31
۱۔ علمِ حدیث کے بارے میں مختصر معلومات	35
لغوی معنی	35
اصطلاحی معنی	36
قرآن حکیم کا جمع کیا جانا	38
احادیث کی جمع وتدوین	40
حدیث کی چند قسمیں	41
امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ	42
امام ابوالحسن مسلم بن حجاجؒ	45
امام ابوداؤد سلیمان بن اشعثؒ	45
امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائیؒ	46
امام ابوعیسیٰ محمد الترمذیؒ	47
امام ترمذیؒ اور حکیم ترمذیؒ میں فرق	48
امام ابوعبداللہ محمد ابن ماجہؒ	49
امام ابومحمد عبداللہ عبدالرحمٰن الدارمیؒ	49
احادیث کی پرکھ اور اس کے لیے لکھی گئی کتابیں	50

صحابہ ؓ کے احتیاط کی وجہ 52
ضعفاء ومتروکین والی کتابیں 54
جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے کا عجیب واقعہ 55
جھوٹی روایت بیان کرنے کا گناہ 58
۲- ہماری تالیف کا محرک 59
میرا مراسلہ 61
میرے مراسلہ کا جواب 64
شائع نہ ہونے والا میرا جواب 71
مسئلہ کی مزید وضاحت 78
۳- شفاء السقام فی زیارة خیر الانام 79
کتاب کے مقدمہ کا تجزیہ 82
سوال کا تجزیہ 84
۴- شفاء السقام کا پہلا باب 86
پہلی حدیث 86
مترجم کا کمال 87
دوسری حدیث 88
شفاء السقام کی ساتویں حدیث 90
شفاء السقام کی چھٹی حدیث 92
حاطب ؓ والی روایت کی حقیقت 94
شفاء السقام کی آٹھویں حدیث 98
شفاء السقام کی چوتھی حدیث 98

مترجم کا کمال	102
شفاء السقام کی پہلی حدیث	102
احادیث ضعیفہ کی نقل و روایت اور ان پر عمل	105
شفاء السقام کی دوسری حدیث	108
شفاء السقام کی تیسری حدیث	111
شفاء السقام کی نویں حدیث	114
شفاء السقام کی دسویں حدیث	118
شفاء السقام کی گیارھویں حدیث	120
شفاء السقام کی بارھویں حدیث	121
شفاء السقام کی تیرھویں حدیث	123
شفاء السقام کی چودھویں حدیث	124
شفاء السقام کی پندرھویں حدیث	125
خلاصۂ کلام	126
۵- شفاء السقام کا دوسرا باب	128
پہلی دلیل	128
درود و سلام کا معنی اور اس کی فضیلت	129
سلامٌ علیک کی وضاحت	131
مترجم کا کمال	134
حیات و ممات کی وضاحت	135
دعا کی فضیلت	138
ایک لونڈی کا واقعہ	138

غیر موجود بھائی کے لیے دعا کی قبولیت	140
درود وسلام کے لیے حاضری شرط نہیں	141
علامہ السبکی کا بحث کو آگے بڑھانا	143
مذکورہ احادیث کا جائزہ	146
محمد بن مروان کے بارے میں	147
الکدیمی کے بارے میں	148
حمید بن زیاد کے بارے میں	150
٦- شفاء السقام کا تیسرا باب	152
بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ	154
بلال رضی اللہ عنہ کے واقعہ کا تجزیہ	156
بلال رضی اللہ عنہ کا قول فیصل	158
سند کے اعتبار سے قصہ کی حقیقت	160
عجیب استدلال	160
اصل نکتہ	161
عمر بن عبدالعزیز کا واقعہ	161
امام بیہقی کی بیان کردہ سند کا تجزیہ	162
قصہ کعب احبار کا	164
زیاد بن ابی سفیان اور ابو بکرہ کا واقعہ	165
ایک اعرابی کا واقعہ	169
حکایت کا جائزہ	171
مثیر الغرام الساکن الی اشرف الاماکن	173

مدینہ طیبہ جانا حج وعمرہ کا رکن نہیں بلکہ مستحب ہے	176
۷- **شفاء السقام کا چوتھا باب**	**178**
امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حکایت	179
روایت نقل کرنے کا مقصد	183
مسئلہ شفاعت	186
شفاعت کے بارے میں وضاحت	191
خالدؓ بن ولید کا حج کرنا اور مدینہ نہ جانا	191
امام مالک رحمۃ اللہ علیہ	192
حضرت زینؒ العابدین کا فیصلہ وعلامہ السبکی کا اقرار وانکار	196
مذکورہ بحث کا تجزیہ	199
۸- **شفاء السقام کا پانچواں باب**	**204**
سورۃ النسآء کی آیات سے عجیب استدلال	204
استغفار کی فضیلت	208
عبارت کا تجزیہ	211
موت کی حقیقت	212
مردوں اور عورتوں کا قبرستان آنا	215
قبر مبارک کی زیارت کے لیے نذر ماننا	218
امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ	219
امام مالکؒ کے فتویٰ میں تاویل	220
تاویل کا عجیب پہلو	225
عجیب تاویل کا تجزیہ	226

حضرت عائشہ کا بھائی کی قبر پر آنا	229
امام الشعبی رحمہ اللہ اور امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے بارے میں	231
مصنف ابن ابی شیبہ	232
جنہوں نے قبروں کی زیارت میں رخصت دی ہے	233
مذکورہ روایات کا تجزیہ	235
جنہوں نے قبروں کی زیارت کو پسند نہ کیا	236
قاضی صاحب کی ناانصافی	138
قبروں کی تعظیم اور زیارت میں فرق	241
۹- شفاء السقام کا چھٹا باب	245
حق کا اعتراف اور انحراف	246
مذکورہ عبارت کا تجزیہ	248
پانچویں دلیل	251
مذکورہ دلیل کا تجزیہ	252
ہجرت کا معنی	253
ہجرت اور زیارت میں فرق	255
عزت والی جگہوں کی طرف سفر کرنے کی صلاحیت	257
امام الذہبی کی گواہی	258
۱۰- شفاء السقام کا ساتواں باب	260
پہلا شبہ	260
مذکورہ عبارت وتاویل کا جائزہ	262
مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی مسجد کی طرف سفر کی شرعی حیثیت	264

مذکورہ عبارت کا جوہر	266
مسجد ثلاثہ کے علاوہ کس یا اور مسجد کی نذر ماننا	266
مذکورہ عبارت کا نچوڑ	267
امام نووی رحمہ اللہ کا اختلاف کی نشاندہی کرنا	268
امام الحرمین کے بارے میں وضاحت	270
دلچسپ عبارت	271
جائزہ	271
علامہ ابن قدامۃ حنبلی کا حوالہ	272
جائزہ	273
قاضی القضاۃ السبکی کی لاعلمی یا غلط بیانی	274
قاضی صاحب کا غصہ وتعصب	275
پہلا فتویٰ	277
صریح غلط بیانی	277
دوسرا فتویٰ	279
قاضی صاحب کی ڈھٹائی	279
تیسرا اور چوتھا فتویٰ	280
قاضی صاحب کا انتہائی توہین آمیز اور گستاخانہ رویہ	280
لفظ خرافات کا معنی	283
پانچواں اور چھٹا فتویٰ	284
تعصب کا ایک اور رخ	287
جائزہ	288

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فتویٰ کا ذکر	289
جائزہ	291
زیارت کی اقسام	293
جائزہ	293
فتویٰ تکفیریہ کی حقیقت	295
ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی قبریں	301
مبالغہ آمیزی کی ممانعت	302
مفتی منیب الرحمٰن کا دلچسپ فتویٰ	303
مذکورہ عبارت کا تجزیہ	304
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک	309
قاضی السبکی کے مطابق زیارت کی تیسری قسم	312
جائزہ	313
زیارت کے بارے میں شبہ ثانیہ اور اس کا جواب	313
امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا علمی مقام وشان	316
قاضی صاحب کے مطالبے کا جواب	317
مختلف سفروں میں تأویل	319
امام ابن تیمیہ کی تحقیق کی تائید	320
زبردست علمی خیانت	323
مشہد ومقبرہ اور مکروہ افعال	324
شبہ ثالثہ	326
اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ضروری علم	327

مذکورہ عبارت کا جائزہ	328
ابن تیمیہ کے فتاویٰ کی تلاش	330
حق کا واضح ہونا	330
امام ابن تیمیہؒ سے کیا گیا سوال	334
سوال کا جائزہ	334
سوال کا جواب	335
مذکورہ فتویٰ پر قاضی السبکی کے اعتراضات	343
زبردست دھوکہ	344
ابن عقیل کا قول	346
ابن بطہ کے بارے میں	347
اَلْاِبَانَة کے بارے میں قاضی صاحب کی معلومات	353
امام ابن حزم کا فتویٰ	353
زیارت قبور کے لیے سفر کا بدعت ہونا	355
امام ابن تیمیہؒ پر بہتان	356
مسجد قباء کی زیارت سے استدلال	360
حقیقی محبت وعقیدت	364
قبروں کی زیارت کے لیے سفر کی حرمت کی وضاحت	365
قاضی السبکی کا جواب	365
شافعی قاضی کا شافعی قاضی کی تائید کرنا	366
اصل مسئلہ نیت کا ہے	367
امام مالکؒ کا قول	368

اصل مسئلہ نیت کا ہے	367
امام مالکؒ کا قول	368
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول	369
قبر کو عقیدت سے چھونا اور بوسہ دینا	371
ایک عجیب قصہ	372
تجزیہ	372
دعا کے لیے قبلہ رُخ ہونا	374
تجزیہ	374
امام ابو حنیفہؒ کا سلام کے وقت بھی قبلہ رو ہونا	375
تجزیہ	376
لفظ خاص کا ذکر	377
جائزہ	378
کتاب الشریعۃ	389
ضعیف روایات کی مثال	383
معز الدولہ کا بدعات کو رائج کرنا	386
مہنگائی اور رومی غلبہ کا عذاب	388
قرامطہ کا ظلم	390
کتاب الشریعہ کا پس منظر	392
کتاب المستوعب	392
جائزہ	392
ابراہیم حربی کا حوالہ	398

	امام مالکؒ والی حکایت کا پھر ذکر اور اس کا جواب	400
	حکایت کی سند	403
	قاضی السبکی کا خلاصہ تحریر	406
	خلاصے کا جائزہ	407
	تھوڑی سی بات	409
	جائزہ	409
	امام مالکؒ کے بارے میں پھر مغالطہ آمیزی	410
	قاضی صاحب کے علمی جوہر کا مظاہرہ	411
	اختتامی عبارت کا جائزہ	411
۱۱-	**شفاء السقام کا آٹھواں باب**	**414**
	قاضی صاحب کی صریح ناانصافی	415
	مسئلہ توسل	416
	المستدرک کی دونوں روایات کی حقیقت	418
	اللہ تعالیٰ کے بارے میں اسلامی تصور	424
	توسّل و وسیلہ کی بحث	427
	حضرت عثمان بن حنیف کی روایت	430
	روایت کا تجزیہ	431
	ضعیف و منکر واقعہ	433
	المعجم الکبیر، المعجم الاوسط اور المعجم الصغیر	435
	ضعیف و منکر واقعہ کا تجزیہ	437
	عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عباس رضی اللہ عنہ کے توسل سے دعا کرنا	438

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عمل کی حقیقت	439
قبر مبارک والے حجرے کی چھت میں سوراخ کرنا	442
اہم واقعہ کا تجزیہ	443
توسل کے دو واقعات	444
مذکورہ توسل کی حقیقت	445
استغاثہ کا معنی ومفہوم	447
مذکورہ معنی ومفہوم کا تجزیہ	448
۱۲- **شفاء السقام کا نواں باب**	**451**
موت وحیات کا مسئلہ	455
قرآنی واقعات	460
مذکورہ روایات کا تجزیہ	463
دجال کا ذکر	468
امام بخاری کا قطعی فیصلہ	469
موسیٰ علیہ السلام کا بے ہوش نہ ہونا	470
حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ثابت کرنے کا پس منظر	471
حیاۃ الانبیاء علیہم السلام	473
درود وسلام کی روایات	475
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات	475
شہداء کی زندگیوں سے استدلال	478
قاضی صاحب کے استدلال کا جائزہ	480
انتہائی غیر معقول استدلال	489

	رسول اللہ ﷺ کی ملکیت کا مسئلہ	490
	سماع موتیٰ سے استدلال	497
	مترجم کا کمال	503
	سماع موتیٰ کی حقیقت	503
	حافظ ابن حجر عسقلانی کا بہترین تبصرہ	506
	بنی اسرائیل کے ایک مردہ کا واقعہ	507
	قبروں میں عذاب کی خبر	510
	قاضی السبکی کی حق بات	511
	ارواح کی بحث	512
	امام الحاکم اور امام البیہقی	514
	دلائل النبوۃ اور حیاۃ الانبیاء کا پس منظر	517
	قبر میں کلام کرنا	518
	سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کا ادب واحترام	523
۱۳-	شفاء السقام کا دسواں باب	529
	اختتامی کلمات	530
	مصادر ومراجع	535

افتتاحی کلمات

لکھنے پڑھنے والوں میں یہ بات مشہور ہے کہ ہر کتاب کے لکھے جانے کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ پھر اس کی نوعیت و اہمیت لکھنے والے کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اس کو ایسے اجاگر کرے کہ پڑھنے والے اس سے مستفید ہوں۔

میری اس کتاب کا سبب اللہ تعالیٰ نے یہ بنایا کہ 7 دسمبر 2007ء کے نوائے وقت میں سفر مدینہ کے سلسلے میں دو ایسی حدیثیں شائع ہوئیں کہ جن کے بارے میں ائمہ حدیث نے کلام کیا ہے۔ میں نے انتہائی خلوص سے ان کے ضعف کی نشاندہی کرتے ہوئے مدینہ طیبہ جانے اور سید الانبیاء ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرنے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ مسجد نبوی کی نیت کیا کریں اور مسجد میں تحیۃ المسجد پڑھنے کے بعد قبر مبارک پر حاضر ہو کر درود و سلام عرض کرنے کے بعد آپ کے دونوں رفیقوں کو بھی سلام کیا کریں۔ پھر قبلہ رو ہو کر اپنے اور اپنے عزیز و اقارب کے لیے دعا کریں۔ کیونکہ بخاری و مسلم وغیرہ کی صحیح احادیث کے مطابق مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ اجر و ثواب کے حصول کی خاطر سفر کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ لیکن دنیاوی مقاصد کے لیے سفر کرنے کی کوئی ممانعت نہیں۔

بات تو بہت ہی معمولی سی تھی۔ مگر میرے مراسلے کے جواب میں ایک مفتی صاحب نے اپنے مراسلے میں وہی رویہ اختیار کیا جو تقریباً سات سو سال پہلے اس وقت کے شافعی قاضی القضاۃ ابوالحسن علی بن عبدالکافی السبکی نے امام ابن تیمیہ کے خلاف اختیار کرتے

ہوئے شفاء السقام نامی کتاب لکھ دی تھی۔ مفتی صاحب کو شاید علم نہ تھا کہ جب شفاء السقام کتاب منظر عام پر آئی تو اس کا جواب امام ابن تیمیہ کے مایہ ناز شاگرد الحافظ الامام ابن عبدالھادی (المتوفی 744ھ) نے اَلصَّارِمُ المُنکی فِی الردِّ عَلَی السُّبکِی کی صورت میں ایسا لکھ دیا تھا کہ اس کا جواب الجواب دینے کی قاضی القضاۃ السبکی صاحب کو جرأت نہ ہوئی۔ حالانکہ وہ ابن عبدالھادی کی وفات کے بعد بارہ سال زندہ رہے اور قاضی صَاحب کے بعد ان کی جگہ لینے والے ان کے بیٹے ابوالنصر عبدالوہاب السبکی (المتوفی 771ھ) نے بھی اس کا جواب لکھنے کی کوشش نہ کی۔ کیونکہ ابن عبدالھادی نے علم الرجال اورعلم الحدیث سے ثابت کر دیا تھا کہ شفاء السقام ضعیف وموضوع روایات، خوابوں وحکایات اور تاویلات کا مجموعہ ہے اور علمی اعتبار سے اس کی کوئی وقعت نہیں۔

صحیح بخاری: کتاب العلم اور صحیح مسلم: کتاب الزھد کی روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے عمداً میرے بارے میں جھوٹ بولا یعنی کوئی ایسی بات مجھ سے منسوب کردی جو میں نے نہ کہی ہوتو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔ یعنی اس کا انجام جہنم کی آگ ہوگی۔

جامع الترمذی: کتاب العلم، سنن ابن ماجۃ: المقدمۃ اور مسند احمد ج5 ص14 اور ص20 میں مغیرہؓ بن شعبہ، علی اور سمرۃؓ بن جندب سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مجھ سے کوئی حدیث بیان کی یہ جانتے ہوئے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

امام ابن الجوزی کی کتاب الموضوعات: ج1 الباب الثانی ص56 میں الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ پہلی روایت کے بارے میں مروی ہے کہ اس کے راوی 61 جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

ستمبر 2004ء میں نوریہ رضویہ پبلی کیشنز لاہور کی شائع کردہ شفاء السقام مع اردو ترجمہ کے ٹائٹل پر رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی جو تصویر لگائی گئی ہے وہ خیالی اور جعلی ہے۔ کیونکہ کسی بھی حدیث اور تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کی قبر مبارک کبھی بھی کسی دور میں پکی بنائی گئی تھی اور نظر آنے میں ایسی تھی کہ جیسے اس تصویر میں دکھائی دیتی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی الشافعی (المتوفی 852ھ) نے تلخیص الحبیر (ج2 ص305) میں ابوداؤد اور الحاکم کے حوالے سے قاسم بن محمد سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

اماں جان! میرے لیے رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے دونوں ساتھیوں کی قبروں کو کھول دیں یعنی ان کو دیکھنے کی اجازت دے دیں۔ انہوں نے تینوں قبروں سے پردہ ہٹا دیا۔ وہ قبریں زمین سے نہ اونچی تھیں اور نہ ہی زمین سے ملی ہوئی تھیں۔ ان پر بطحاء کی سرخ کنکریاں پڑی ہوئی تھیں۔

صحیح بخاری: کتاب الجنائز، باب ماجاء فی قبر النبی ﷺ و ابی بکرؓ و عمرؓ میں سفیان التمّار سے مروی ہے: انہوں نے نبی ﷺ کی قبر دیکھی وہ اونٹ کے کوہان کی طرح مسنّم تھی۔

ابوداؤد کی مراسیل میں صالح بن ابی الاحضر کا قول ہے میں نے نبی ﷺ کی قبر مبارک دیکھی۔ وہ زمین سے ایک بالشت یا اتنی ہی زمین سے اونچی تھی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور الحاکم سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ جابرؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے قبر کو چونا گچ کرنے، اس پر عمارت بنانے اور اس پر کچھ لکھنے سے منع فرمایا تھا۔

تلخیص الحبیر (ص308) میں یہ بھی منقول ہے: ابوالھیاج الاسدی نے علیؓ بن

ابی طالب سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بھیجا کہ جو بت و تصویر دیکھو تو اس کو مٹا دو اور جو قبر زمین سے اونچی دیکھو تو اس کو زمین کے برابر کر دو۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کا کہنا ہے کہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے امام الشافعی قبروں کو زمین کے برابر رکھنے کے حق میں تھے۔

علیؓ والی حدیث کو امام مسلمؒ، امام ابوداوُدؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ، امام احمدؒ بن حنبل، امام ابوداوُدؒ الطیالسی، امام الحاکمؒ اور امام بیہقیؒ نے اپنی اپنی کتاب کے کتاب الجنائز میں نقل کیا ہے۔

اس حقیقت کے باوجود نوریہ رضویہ پبلی کیشنز نے شفاء السقام کے ٹائٹل پر جعلی بناوٹی جھوٹی تصویر جڑ دی اور ان کو سید الانبیاء ﷺ کے ارشاد مبارک کا کوئی خیال نہ آیا کہ آپؐ پر جھوٹ باندھنے والے کا انجام جہنم ہوگا اور جھوٹ سے آگاہ ہونے کے باوجود جھوٹ نقل کرنے والا جھوٹوں میں سے ایک ہوگا۔

فقہ جعفریہ کی مشہور کتاب الفروع من الکافی (ج 3 ص 201) ابوجعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق الکلینی (المتوفی 328 یا 329ھ) کی تالیف ہے۔ اس میں ابوعبداللہؒ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر سرخ کنکریاں پڑی ہوئی ہیں۔

الشیخ ابوجعفر محمد بن علی بن الحسین بابویہ القمی المتوفی (381ھ) نے اپنی کتاب مَنْ لَّا یَحْضُرُہُ الْفَقِیْہُ (روایت 576) میں امام الصادق رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

كُلَّمَا جُعِلَ عَلَى الْقَبْرِ مِنْ غَيْرِ تُرَابِ الْقَبْرِ فَهُوَ ثِقْلٌ عَلَى الْمَيِّتِ

قبر کی مٹی کے علاوہ جو بھی قبر پر ڈالا یا بنایا جائے گا وہ میت پر بوجھ ہوگا۔

روایت 579 میں امیر المومنین علیؑ کا قول ہے: جس نے قبر کی تجدید کی یا کوئی بدعت کا کام کیا تو وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔

الفتاوی الھندیۃ (فتاویٰ عالمگیریہ) الفصل السادس فی القبور و الدفن:
(ج1 ص166) میں فتویٰ ہے۔ قبر کو اونٹ کے کوہان کی صورت میں ایک بالشت اونچی بنایا جائے۔ چورس نہ بنائی جائے۔ نہ گچ کیا جائے۔ قبر پر عمارت بنانا، بیٹھنا، سونا اور اس کو پھلانگنا، اس پر بول و براز کرنا یا معلوم ہونے کے لیے کوئی علامت مثل کتابت وغیرہ بنانا مکروہ ہے۔

مذکورہ حوالوں سے ثابت ہو جاتا ہے۔ رسول ﷺ کی قبر مبارک کبھی بھی پختہ اونچی نہ بنائی گئی تھی اور نہ اب ہے۔ لہٰذا جو بھی تصویر ایسی ہوگی کہ جس میں آپ کی قبر مبارک کو پختہ اونچا اور بڑا دکھایا گیا ہو اور اس پر بڑی سی پگڑی رکھی ہوئی ہو تو وہ بلاشک وشبہ جعلی اور خیالی ہوگی۔ اس کو چھاپنے، بیچنے اور خرید کر گھر یا دفتر میں سجانے والا جھوٹا اور جہنمی ہوگا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔

یہاں یہ بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، ائمہ امتؒ اور علماء متقدمین میں قبر کو پختہ بنانے کا کوئی تصور نہ تھا۔ بڑے بڑے مزار اور مشاہد حکمرانوں اور امراء نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بنائے۔ اس میں ترکیوں اور مصریوں نے اہم کردار ادا کیا اور ان کی پیروی کرتے ہوئے ہندوستان میں بھی اولیائے کرام کے مزار بن گئے۔

مصری حکومت کی انفرمیشن منسٹری کی شائع کردہ کتاب EGYPTIAN AN ISLAMIC HERITAGE (ص54,55,82,83) میں منقول ہے۔ فاطمی وزیروں اور امراء نے اپنی ڈوبتی ہوئی حکمرانی کو بچانے کے لیے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے گھرانے سے اپنا تعلق ثابت کرنے کے لیے سیدہ زینب، سیدہ نفیسہ، سید زین العابدین اور سید محمد الاصغر کے ناموں پر مقبرے اور مشاہد بنائے، جو مقبروں اور مشاہد کی

تعمیر سے صدیوں پہلے وفات پا چکے تھے۔ عموماً ان کی وفات اور ان کے مقبروں کی تعمیر میں دو سو سے پانچ سو سال کا فرق تھا۔

ان مشاہد میں سے اہم ترین حضرت حسینؓ کے سر مبارک کی قبر ہے۔ جو فاطمی دور حکومت کے اختتام (567ھ) سے صرف دس سال پہلے بنائی گئی۔ ان کے سر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عسقلان سے لایا گیا۔ جبکہ احمد ذکی پاشا کی تحقیق کے مطابق حضرت حسینؓ کا سر مبارک کبھی بھی قاہرہ لایا نہیں گیا۔

کتاب مذکور میں یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ فاطمی حکومت کے سنہری دور میں کوئی بھی مقبرہ یا مشہد تعمیر نہ کیا گیا تھا کیونکہ وہ حکومت اتنی مضبوط تھی کہ اس کو ایسے کسی سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ ایسے ہی فاطمی حکومت کے خاتمے کے بعد سنی حکمرانوں نے بھی کوئی مقبرہ یا مزار نہیں بنایا۔

عجیب بات یہاں یہ ہے کہ حضرت حسینؓ کے سر مبارک پر نہ صرف مشہد تعمیر ہوا بلکہ اس پر عالی شان مسجد بھی بنا دی گئی ہے۔ جو عین مسجد الازھر کے بالکل قریب اور سامنے ہے۔ اس کو بنانے والے بھی فاطمی ہی تھے۔ یہ بہت بڑی اور خوبصورت مسجد ہے۔

الازھر کے ہزار سالانہ جشن کے موقع پر الازھر کی تاریخ پر مشتمل بڑی تختی میں چھپنے والی کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس کی تعمیر جوہر الصقلی نے 359ھ میں شروع کر کے دو سالوں میں مکمل کر دی۔ مگر مشہد حسینی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

مؤرخ ابوالعباس احمد بن علی المقریزی (المتوفی 845ھ) نے اپنی کتاب المواعظ والاعتبار المعروف بالخطط المقریزیة (ج1 ص 427) میں "المشهد الحسینی" کے تحت لکھا ہے: کہا جاتا ہے عسقلان میں مشہد کی تعمیر کا آغاز لشکر کے امیر بدر الجمالی نے کیا اور اس کے بیٹے افضل نے اس کو پورا کیا۔ 548ھ میں وہی سر مبارک کو عسقلان سے قاہرہ لایا

تھا۔ جبکہ یہ بھی منقول ہے کہ یہ کام طلائع کے ہاتھوں 549ھ میں ہوا۔

ڈاکٹر زاہد علی نے تاریخ فاطمیینِ مصر (ج2 ص46) میں لکھا ہے: 491ھ میں جب افضل فلسطین پہنچا تو اس نے حسینؓ کے سر کی قبر پر قبہ بنوایا۔ بعض کہتے ہیں کہ قبہ بنوانے والا اس کا باپ بدر الجمالی تھا۔

حافظ ابن کثیر نے البدایة والنهایة (ج8 ص204) میں حضرت حسینؓ کے سر مبارک کا باب باندھ کر نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک زیادہ مشہور یہ ہے کہ حضرت حسین کا سر مبارک دمشق بھیجا گیا۔ محمد بن سعد کے مطابق مدینہ بھیجا گیا اور اس کو نائب مدینہ نے ان کی والدہ ماجدہ کے پہلو میں دفن کر دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب سلیمان بن عبدالملک کا زمانہ آیا تو اس نے اس کو اسلحہ خانہ سے نکلوا کر مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ قاہرہ میں دفنائے جانے کے انکار کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ یہاں صرف یہ وضاحت مقصود ہے کہ قبروں کو پختہ کرنے اور ان کو مزاروں اور مشاہد کی شکل دینے کا رواج خیر القرون اور علمائے متقدمین کے زمانے میں قطعاً نہ تھا۔ لہٰذا جس کتاب کے ٹائٹل پر جھوٹی جعلی بناوٹی تصویر لگانے والوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا خوف نہ آیا اس میں مروی روایات کا کیا حال ہوگا۔

انہی روایات کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے مجھ سے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے یہ کتاب لکھوا دی ہے حالانکہ مجھے اس کے لکھنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ شفاء السقام میں عموماً ایسی کتابوں کے حوالے ہیں کہ جو ہمارے ہاں معروف و مشہور نہیں اور ان کے حصول میں دقت بھی ہوئی اور خاصا وقت بھی لگ گیا۔ ائمہؒ حدیث و رجال اور امام ابن تیمیہؒ نے صحیح فرمایا کہ قبر مبارک کی زیارت اور سفر زیارت کے عین عبادت ہونے میں ایک بھی صحیح حدیث مروی نہیں اور نہ یہ حج کا حصہ ہی ہے۔ مسجد نبوی کی نیت کر کے مدینہ

جانے والوں کے لیے یقینی طور پر مستحب ہے۔

قاضی السبکی صاحب نے جن روایات و حکایات اور خوابوں سے استدلال کیا ہے، راقم نے ہر ایک کا جواب دیا ہے۔ اب پڑھنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ حق کیا ہے جبکہ حق کو پانا اور اسی کے مطابق عمل کرنا ہی ہماری نجات کا سبب ہوگا۔ کیونکہ جو عمل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیم کے مطابق نہ ہوگا وہ عنداللہ مقبول اور باعث اجر و ثواب نہ ہوگا۔

راقم کی اس کتاب سے علم الحدیث اور فن الرجال کی عظمت کا بھی پتا چلے گا کہ ائمہ حدیث و رجال نے سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث کو غیر صحیح سے کتنی محنت شاقہ اور عرق ریزی سے الگ کر کے ان کو کتابوں میں جمع کر دیا اور ہمارے لیے ضعیف و مرفوع سے آگاہ ہونے میں آسانی پیدا کر دی اور دنیا کے اہل علم پر واضح کر دیا کہ مسلمانوں کا علم الحدیث ایسا فن ہے جو دنیا کی کسی قوم میں موجود نہیں۔

اسی لیے میں نے کتاب کے آغاز میں علم الحدیث کے بارے میں اختصاراً مفید معلومات مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی چند مشہور ائمہ حدیث کے مختصر حالات بھی رقم کر دیے ہیں۔ اگر ان کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو احادیث کی پرکھ میں بہت آسانی ہو جائے گی۔

شفاء السقام اگرچہ امام ابن تیمیہ کے اس فتوی کے رد میں لکھی گئی جو انہوں نے قبر مبارک کی زیارت اور سفر زیارت کے بارے میں علماء کے دو گروہوں کے حوالے سے دیا تھا۔ بلکہ اس وقت کے قاضیوں نے چالاکی سے ان سے لیا تھا۔ تاکہ سلطان اور عوام ان کے خلاف ہو جائیں اور ان کو قید میں ڈال دیا جائے۔ اس کی پوری تفصیل ہماری کتاب امام ابن تیمیہ – ایک عظیم مصلح میں دیکھی جا سکتی ہے۔

تقریباً چھ صفحات پر مشتمل فتویٰ کے رد میں قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی صاحب نے تقریباً تین سو صفحات کے دس ابواب میں ان مسائل پر بھی خوب بحث کی کہ جن کا امام ابن تیمیہؒ کے فتویٰ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ امام ابن تیمیہؒ نے اپنی زندگی میں مختلف موقعوں پر قرآن وسنت کی روشنی میں فتوے دیے تھے۔ اصل میں امام ابن تیمیہ کو جب 726ھ میں قید میں ڈال دیا گیا اور وہاں ان کو ان کی کتابوں اور تحریروں سے بھی محروم کر دیا گیا اور ان کی وفات 728ھ میں ہوگئی تو ان کی کتابیں شافعی قاضی جلال الدین القزوینی کے قبضہ میں آگئیں۔ جب ان کے فوت ہونے پر 739ھ میں دمشق پر قاضی القضاۃ کا عہدہ علامہ تقی الدین السبکی کو ملا تو امام ابن تیمیہؒ کی کتابیں اور تحریریں ان کو منتقل ہوگئیں جس کی وجہ سے امام ابن تیمیہ کی کتابیں اور تحریریں دیکھنے کا ان کو خوب موقع میسر آیا۔

البدایۃ والنہایۃ (ج14 ص197-198) میں منقول ہے: 742ھ میں قاضی القضاۃ السبکی سے دمشق کے نائب امیر سلطنت قطلو بغا فخری نے وہ کتابیں اور تحریریں جب واپس طلب کیں تو قاضی صاحب نے بڑی کوشش کی کہ وہ کتابیں ان کے پاس رہیں لیکن امیر نے جب ان کو معزول کرنے کا ارادہ کیا تو قاضی صاحب نے واپس کرتے ہوئے کہا: ان میں زیارت قبور کے مسئلے پر بھی تحریریں ہیں۔

نائب امیر نے اس کے جواب میں کہا: كَانَ الشَّيْخُ اَعْلَمُ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ مِنْكُمْ...... الشیخ امام ابن تیمیہؒ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بارے میں تم سے زیادہ جاننے والے تھے۔

چنانچہ امیر نے امام ابن تیمیہؒ کی کتابیں اور تحریریں قاضی صاحب سے لے کر ان کے بھائی الشیخ زین الدینؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ کے سپرد کر دیں۔

لہٰذا تین سالوں میں قاضی صاحب کو جو موقع ملا، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امام

ابن تیمیہ کے اغاثہ اور توسل جیسے مسائل پر بھی مخالفت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ایک علمی مسئلہ کو جذباتی رنگ دے کر امام ابن تیمیہؒ کی وفات کے بعد ان کے خلاف کتاب لکھنا کسی بھی صورت میں مناسب نہ تھا۔ اگر قاضی صاحب حق پر تھے تو ان کو حافظ ابن عبدالھادی کی کتاب الصارم المنکی فی الرّدّ علی السبکی کا جواب بھی لکھنا چاہیے تھا، جو انہوں نے نہ لکھ کر ثابت کر دیا کہ امام ابن تیمیہؒ نے جو لکھا اور جو کہا وہ حق اور سچ تھا۔

شفاء السقام کے دس ابواب میں مذکور مسائل و دلائل کا تتبع کرتے ہوئے میں نے حق کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں ان بزرگوں کی کتابوں کا جواب بھی ہے جنہوں نے کاروانِ سبکی میں شامل ہو کر ایک عظیم مصلح امام ابن تیمیہ کی مخالفت کرنے میں قاضی السبکی صاحب کی کتاب سے راہنمائی لی اور قرآن و سنت کی تعلیم کو نظر انداز کر دیا۔ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ سے عقیدت و محبت کے نام پر آپ کے واضح احکام کے مطابق عمل کرنے کی بجائے غیروں کی پیروی کرنے کو ترجیح دی۔

یہاں یہ بھی ذہن میں بات رہنی چاہیے کہ ہر بدعت کی ابتدا ہمیشہ محبت و عقیدت سے ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے۔ بدعت کا معنی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر کامل ہونے والے دین میں کسی نیک عمل کو اس کا حصہ بنانے کی کوشش کی جائے۔

اس سے لازم آتا ہے کہ دین کو مکمل کرنے والے اور جن پر مکمل کیا گیا، ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ نیک عمل بھی دین کا حصہ ہونا چاہیے تھا۔ یعنی بدعت کے مرتکب اپنے آپ کو غیر شعوری طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے رکھتے ہیں۔ بدعت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ جب رائج ہو جائے تو مٹنے کی بجائے اس میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور لوگ اس کو عین دین حق سمجھ کر اس کے مطابق عمل کر کے اللہ سے اجر پانے پر یقین رکھتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ اپنے خطاب میں فرمایا کرتے تھے: كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَّ كُلُّ ضَلَالَةٍ

فِي النَّار (سنن النسائی، کتاب صلوۃ العیدین، ج1 ص188) ہر بدعت گمراہی ہوگی اور ہر گمراہی جہنم کی آگ میں ہوگی۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا لوگوں کو ایک امام کے پیچھے تراویح کے لیے جمع کر کے اس کو نعم البدعۃ کہنا۔ اس زمرے میں نہیں آتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو باجماعت تراویح پڑھائیں اور ان کے فرض ہونے سے بچنے کے لیے آپ نے وہ عمل ترک کر دیا تھا۔ جب فرضیت کا خطرہ نہ رہا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو پھر سے جاری کر دیا۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ نے زیارت اور سفرِ زیارت کے بارے میں جو فتویٰ دیا اس میں وہ منفرد نہیں تھے۔ بلکہ ان سے پہلے بھی ائمہ کرام میں ایسے علماء تھے جنہوں نے ویسا ہی فتوی دیا تھا۔ امام صاحب نے ان کا ذکر بھی کیا جو محض زیارت اور سفر زیارت کے حق میں تھے اور ان کا بھی جو حق میں نہ تھے۔ لیکن امام صاحب کو قید کرنا اور ان کو ان کے علمی سرمایہ سے زبردستی محروم کرنا سراسر ظلم اور ناانصافی تھی۔ جس کو انہوں نے صبر جمیل سے برداشت کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا اجر یہ دیا کہ دمشق کی تاریخ میں ان کا جنازہ بے مثال ہوا۔ البدایة و النہایة کے مطابق لوگوں کی تعداد اتنی تھی کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ امام برزالی کا کہنا تھا کہ ساٹھ ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان جنازے میں شریک ہوئے۔ حافظ ابن کثیر کا قول ہے: تین دشمنوں کے علاوہ تمام اہل شہر اور قبائل جنازے میں موجود تھے۔

اس وقت کے مشہور اور جلیل القدر ائمہ کرام امام مزیؒ، امام الذہبیؒ، امام حافظ ابن کثیرؒ جیسے حضرات ان کو نہلانے کفنانے، ان کے لیے دعا کرنے اور ان کو اللہ کے سپرد کرنے میں شریک تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

شفاء السقام کے مترجم نے قاضی صاحب کی سادہ سی کتاب کو عنوانوں اور ذیلی عنوانات سے مزین کرنے کے ساتھ یہ کمال بھی دکھایا ہے کہ جہاں اضافے کی ضرورت تھی اضافہ کر دیا اور جہاں مسلکی مفاد پر زد پڑتی تھی اس عبارت کو حذف کر دیا۔

شفاء السقام میں دین حق کی تعلیم کو جس طرح مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے میں نے دو سو سے اوپر عنوان قائم کیے ہیں تا کہ کتاب پڑھنے والوں کو کتاب میں بیان ہونے والے مختلف مسائل کو تلاش کرنے میں آسانی ہو جائے۔ کتاب سمجھنے میں اگر کہیں دقت پیش آئے تو بھی پڑھتے جائیں۔ ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔

میں ان عزیزوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے پاکستان میں نہ ملنے والی کتابیں مجھے سعودی عرب سے لا کر دیں۔ ان کا بھی جنہوں نے لاہور میں مہیا ہونے والی کتابوں سے مستفید ہونے کا کھلے دل سے مجھے موقع دیا اور ان کا بھی ممنون ہوں کہ جنہوں نے اس علمی اور دینی کار خیر میں میری معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو بہترین جزا سے نوازے۔ وما توفیقی الا باللّٰہ

فضل الرحمٰن بن محمد

187- اپر مال سکیم، لاہور

پیش گفتار

مولانا فضل الرحمٰن بن محمد ازہری کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خصوصیات سے نوازا ہے۔ وہ مشہور عالم دین اور ممتاز مصنف ہیں۔ تقریر وخطابت میں بھی ان کا ایک خاص اسلوب ہے جو سامعین کے لیے باعث کشش ہے۔ وہ بنیادی طور پر کاروباری شخصیت ہیں، لیکن کاروبار کے ساتھ ساتھ اللہ نے ان کو توفیق دی کہ علوم دینی کی تحصیل کو مرکز توجہ ٹھہرایا۔ پہلے پاکستان کے بعض رفیع المنزلت علماء سے استفادہ کیا پھر موقع ملنے پر جامعہ ازہر مصر کے نامور اساتذہ سے بھی اخذ فیض کیا۔

اپنے علم سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اٹھا رہے ہیں۔ اس کی نشر واشاعت کے لیے کمر ہمت باندھی اور مختلف موضوعات کی متعدد کتابیں تصنیف کیں کہ اربابِ علم کا اصل کام یہی ہے۔ تفسیر قرآن لکھنے کا جذبہ ان کے قلب صافی میں ابھرا تو پانچ جلدوں میں سورۂ فاتحہ سے لے کر سورہ الانعام تک پہنچ گئے۔ دعا ہے کہ جلد تکمیل کو پہنچے اور لوگ اس سے مستفید ہوں۔

کتاب وسنت کی خدمت کو انہوں نے اپنا مقصد حیات ٹھہرا رکھا ہے۔ اس کے خلاف کسی کونے سے کوئی آواز اٹھتی اور ان کے کانوں میں پڑتی ہے تو دل تڑپنے لگتا اور قلم حرکت میں آجاتا ہے۔ اس کتاب کا محرک بھی ان کا یہی جذبۂ صادقہ ہے۔

ہم ہر روز اخبار پڑھتے ہیں اور ان میں بعض ایسے مضامین بھی ہماری نظروں سے گزرتے ہیں جن کا قرآن وحدیث، صحابہ وتابعین اور ائمہ دین کے قول وعمل سے کوئی

تعلق نہیں ہوتا۔ ان مضامین کا جواب دینا اور ان کے مقابلے میں صحیح نقطۂ نگاہ پیش کرنا تو رہا ایک طرف ہم اس کا احساس بھی نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ دل میں یہ خیال کر لیتے ہیں یا کسی مجلس میں کہہ بھی دیتے ہیں کہ فلاں مضمون میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ فقط یہ کہہ کر خاموش ہو جانا ہماری دوں ہمتی اور بہت بڑی عملی کمزوری ہے۔ محترم مولانا فضل الرحمٰن ازہری نے ایک اخبار کے ایک مضمون میں ایک غیر شرعی بات پڑھی اور اس کے جواب میں ایک ضخیم کتاب معرض تصنیف میں آ گئی۔ مضمون کا جواب مضمون کی صورت میں بھی دیا جا سکتا تھا اور اس پر زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر وہ مضمون اس اخبار میں نہ چھپتا تو کسی اور اخبار میں چھپوایا جا سکتا تھا۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے اس کتاب کو سامنے رکھا جس کے حوالے سے مضمون لکھا گیا تھا اور کتب حدیث و فقہ کی روشنی میں اس کے مندرجات کا اس انداز سے تجزیہ کیا کہ بے شمار اہم مسائل صفحاتِ کاغذ پر مرتسم ہو گئے، جن سے موجود اور آئندہ نسلیں استفادہ کریں گی۔

بات بہ ظاہر اتنی تھی کہ مدینہ منورہ کا سفر کس نیت سے کیا جائے محض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت کے لیے یا مسجد نبوی (ﷺ) کی بے پناہ اہمیت کے پیش نظر اس میں نمازیں پڑھنے اور بارگاہِ خداوندی میں دعائیں کرنے کے لیے، جب کہ روضۂ اقدس واطہر کی زیارت کا شرف بھی وہیں حاصل ہو جاتا ہے اور نبی ﷺ کی ذاتِ بابرکات پر درود وسلام بھی پڑھا جاتا ہے جو ہر مسلمان کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے متعلق قرآن مجید کا واضح الفاظ میں حکم ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (الاحزاب:۵۶)

"اے مسلمانو! تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجا کرو۔"

نبیؐ کی ذات ستودہ صفات کو مرکزِ محبت قرار دینا مسلمان کا بنیادی فرض ہے اور دنیوی واخروی کامرانیوں کا دارومدار اسی پر ہے، لہٰذا نبی ﷺ پر درود وسلام بھیجنا لازمی ٹھہرا۔

مولانا فضل الرحمٰن ازہری نے اپنی اس کتاب میں اس مسئلے کو منقح کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کتاب میں متعدد مسائل پر بحث کی ہے اور ہر موضوع کو دلائل سے واضح کیا ہے۔ کتاب بہت سے مباحث پر مشتمل ہے اور علمی اعتبار سے بحث بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ ابتدا میں جمع قرآن، تدوین حدیث اور اقسام حدیث کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام دارمی، امام ابن ماجہ تمام مرتبین حدیث اور اس سلسلے میں ان کی مساعیِ جمیلہ کا خوب صورت انداز میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

اس کے بعد خاص ترتیب کے ساتھ یہ سلسلہ آگے چلتا ہے اور کتاب قارئین کو بہت سی باتوں سے آگاہ کرتی اور ان کی معلومات میں اضافے کا موجب بنتی ہے۔ کتاب کے مندرجات کی روشنی میں اس کا نام ''سفر مدینہ کی صحیح نیت'' رکھا گیا ہے۔ کتاب تیرہ ابواب پر محیط ہے اور ہر باب میں معلومات کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔

فاضل مصنف مولانا فضل الرحمٰن ازہری نے ''افتتاحی کلمات'' میں وضاحت کی ہے کہ انہوں نے قاضی تقی الدین سبکی کی تصنیف ''شفاء السقام فی زیارت خیر الانام'' کے جواب میں یہ کتاب لکھی ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن ازہری نے قاضی سبکی کی بیان کردہ ہر 'حدیث' کا محققانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ علم حدیث کے متعلق ان کا مطالعہ کتنا وسیع ہے اور رجال حدیث کے بارے میں ان کی معلومات کا دائرہ کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ احادیث کی تخریج بہت اہم اور نازک کام ہے جس پر مولانا موصوف گہری نظر رکھتے ہیں۔

مولانا کو داد دینی چاہیے کہ کتاب تصنیف کرتے وقت انہوں نے ایک سو بیس

کتابوں کو سامنے رکھا اور یہ تمام کتابیں تفسیر، حدیث، شروح حدیث، فقہ و اصول، رجال حدیث اور تاریخ کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں شیعہ فقہ کی اہم کتابیں بھی شامل ہیں۔ تحقیقی انداز کی کتابوں میں چونکہ بہت سے مشکل مقامات بھی آتے ہیں اور موضوع کا تعلق احادیث سے ہو تو اس میں اصول حدیث کی دقیق بحثیں اور اقسام حدیث کی اصطلاحات سے بھی واسطہ پڑتا ہے، اس لیے بسا اوقات قاری کو بات کی تہہ تک پہنچنے میں دقت پیش آتی ہے لیکن مولانا فضل الرحمٰن نے ہر بات آسان پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تجربہ کار مصنف ہیں اور قاری کی نفسیات کو خوب سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ قاری کی قوت فہم کہاں ٹھوکر کھا سکتی ہے اور کس مرحلے کو آسانی سے طے کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے قاری کی پوری پوری رعایت کی ہے اور پیرایۂ اظہار کے لیے آسان تر الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔

ہمیں یقین ہے ان کی پہلی تصانیف کی طرح قارئین اس کتاب کا بھی بڑے شوق سے خیر مقدم کریں گے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کو پذیرائی حاصل ہوگی۔ اس لیے کہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ حج اور عمرے کے لیے جاتے ہیں اور مدینہ طیبہ کی حاضری کا شوق بھی ان کے دل میں موجزن ہوتا ہے۔ یہ کتاب ان کی وہاں حاضری کے اصل مقصد کی وضاحت کرتی ہے اور انہیں بتاتی ہے کہ سفر مدینہ کی نیت کیا ہونی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر معاملے میں صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ نیز محترم مولانا فضل الرحمٰن ازہری کو مزید خدمت دین سے نوازے۔ آمین یارب العالمین!

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی، ساندہ لاہور

۱

علمِ حدیث کے بارے میں مختصر معلومات

اس کتاب میں چونکہ احادیث اور ان کی اسناد کے بارے میں بحث ہوگی۔اس لیے ضروری ہے کہ قاری کو اتنی معلومات سے ضرور آگاہی ہونی چاہئے کہ جس سے بحث کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے اور وہ فیصلہ کر سکے کہ کون سی بات صحیح اور حق ہے۔

لغوی معنی

حدیث کی جمع احادیث ہے اور اس کا لغوی معنی کلام ہے۔قرآن حکیم چونکہ اللہ کا کلام ہے اس لیے اللہ نے اس کو حدیث کہا ہے۔سورۃ الزمر میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۲۳)﴾

اللہ نے بہترین حدیث کتاب کی صورت میں نازل فرمائی جو ملتی جلتی دوہرائی جاتی ہے۔اس سے رونگٹے ان کے کھڑے ہوتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر ان کے جسموں کے چمڑے اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی وہ ہدایت ہے کہ جس کو چاہتا ہے اس ہدایت سے نواز دیتا ہے اور جس کو وہ (اس کے برے اعمال کی وجہ سے) گمراہ کر دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

سورۃ المرسلات کی آخری آیت ہے:

﴿فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ (۵۰)﴾

پس وہ اس حدیث کے بعد کون سی حدیث پر ایمان لائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ جب اہل مکہ کو قرآن سنایا کرتے تو وہ کہا کرتے کہ یہ خود بنا کر لے آتا ہے، اس پر اللہ کی طرف سے کچھ نازل نہیں ہوتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے خود سورۃ الطور میں ان کے بارے میں فرمایا:

﴿فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِہٖۤ اِنۡ کَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ (۳۴)﴾

ان کو چاہئے کہ اس کی مثل وہ بھی کوئی حدیث بنا لائیں اگر وہ سچے ہیں۔

سورۃ النساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیۡثًا (۸۷)﴾

اور بات کرنے میں اللہ سے زیادہ سچا کون ہوگا۔

اصطلاحی معنیٰ

لیکن اصلاحی طور پر سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کے لیے حدیث کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم وصحابیات رضی اللہ عنہن نے آپ سے جو کچھ سنا، یا آپ کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کو آگے بیان کر دیا۔ کیونکہ یہ آپ ہی کا حکم تھا، جس پر صحابہ نے دیانت و امانت سے عمل کیا۔

صحیح بخاری کی کتاب الانبیآء کے باب مَا ذُکِرَ عَنۡ بَنِیۡ اِسۡرَآئِیۡل میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھ سے جو سنو اس کو آگے پہنچاؤ اگرچہ وہ ایک ہی آیت ہو۔ بنی اسرائیل کے حوالے سے کچھ بیان کرنا پڑے تو کرو،

لیکن جس نے عمداً مجھ سے جھوٹی بات منسوب کی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

عربی کے الفاظ ہیں: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ علم حدیث کا یہ جوہر ہے۔ علم حدیث ایک ایسا بے مثال علمی فن ہے کہ جو اسلام کی حقانیت کا بہترین ثبوت ہے۔ صحابہؓ وصحابیاتؓ نے آپ سے جو کچھ سنا، اس کو نہ صرف اپنے سینوں میں محفوظ کرلیا بلکہ لاکھوں شاگردوں میں اس کو پھیلا دیا۔ پھر ان کے شاگردوں نے یاد کرنے کے ساتھ اپنے پاس لکھ کر محفوظ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اس طریقہ کا آغاز حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک ہی میں کردیا تھا۔ سنن ابو داؤد کتاب العلم باب کتابة العلم (ص513) اور مسند احمد (ج2 ص162-192) میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

میں رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنتا، یاد کرنے کے ارادے سے لکھ لیا کرتا تھا۔ قریش نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تم محمد رسول اللہ ﷺ سے جو سنتے ہو لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ ﷺ بشر ہیں۔ کبھی غصے میں بات کرتے ہیں اور کبھی رضامندی میں۔ چنانچہ میں لکھنے سے رک گیا، لیکن میں نے جب رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: تم لکھتے جاؤ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں جو بات بھی کہتا ہوں وہ حق ہی ہوتی ہے۔

اس کی تائید اللہ تعالیٰ نے سورۃ النجم میں خود فرمائی ہے:

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (٣) إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (٤)﴾

اور وہ اپنی خواہش سے بات نہیں کرتے، بلکہ وہی کہتے ہیں جو ان پر وحی کیا جاتا ہے۔

اُسد الغابة (ج ص 246)، الاصابة (الجزء الرابع ص 112)، الاستیعاب (ج1 ص) میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی بھی مجھ سے

زیادہ حدیثوں کو یاد کرنے والا نہیں تھا۔ کیونکہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

طبقات ابن سعد (ج4، ص262) کے مطابق عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنے لکھے ہوئے صحیفے کو الصادقة کہا کرتے تھے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے درمیان کوئی واسطہ نہ تھا۔

قرآن حکیم کا جمع کیا جانا

قرآن حکیم جب نازل ہوتا تھا تو رسول اللہ ﷺ صحابہ کو یاد کراتے اور لکھوا لیتے تھے۔ یوں آپ کی زندگی مبارک میں ہی ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن حفظ کرلیا تھا اور مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس تحریر شدہ صحیفے بھی موجود تھے۔ لیکن کتابی یا مجموعہ کی صورت میں کسی کے پاس نہ تھا۔ قرآن حکیم کے جمع ہونے کا عظیم کام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوا۔

صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن (ص745) میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جنگ یمامہ کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے بلایا۔ میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا عمر بن الخطاب ان کے پاس موجود ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا: یمامہ کے دن لڑائی نے ایسی شدت اختیار کی کہ قرآن کے بہت سے قراء شہید ہوگئے، مجھے ڈر ہے اگر دوسری جگہوں میں بھی اسی طرح قرآن کے قراء شہید ہوتے رہے تو قرآن کا اکثر حصہ گم ہوجائے گا۔ میری رائے ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں۔ میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: رسول اللہ ﷺ نے جو کام نہ کیا وہ ہم کیسے کرسکتے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر کہا: یہ کارِ خیر ہے، وہ برابر مجھے آمادہ کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے اس کارِ خیر کے لیے میرا سینہ کھول دیا یعنی

قرآن جمع کرنے کی حکمت میری سمجھ میں آگئی اور عمر کی رائے ہی میری رائے بن گئی۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم نوجوان عقلمند انسان ہو اور ہم تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتے اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی لکھا کرتے تھے۔ لہٰذا جن جن کے پاس لکھا ہوا یا جن کے سینوں میں محفوظ ہے، ان کے پاس جاؤ اور قرآن حکیم کو ایک مجموعے کی صورت میں جمع کردو۔

زید رضی اللہ عنہ بن ثابت کا بیان ہے: اللہ کی قسم، اگر وہ میرے ذمہ یہ فریضہ لگا دیتے کہ ایک پہاڑ کو کاٹ کر اس کو دوسری جگہ منتقل کردو تو وہ کام مجھ پر اتنا بھاری نہ ہوتا جتنا قرآن جمع کرنے والا حکم تھا۔ چنانچہ میں نے کہا: آپ وہ کام کیسے کریں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ مجھے سمجھاتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ بھی کھول دیا اور قرآن جمع کرنے کی حکمت میری سمجھ میں آگئی اور میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق ہوگیا۔ پھر میں نے قرآن کو جمع کرنا شروع کیا۔ کسی سے مجھے کھجور کی ٹہنیوں پر اور کسی سے پتھر کی باریک سلیٹوں پر لکھا ہوا ملا اور لوگوں کے سینوں میں سے بھی جمع شدہ مل گیا۔ یہاں تک کہ سورۂ توبہ کی آخری آیات مجھے خُزیمہ انصاری سے ملیں، جو ان کے علاوہ کسی اور کے پاس موجود نہ تھیں۔

وہ جمع شدہ صحیفہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ جب اللہ نے ان کو فوت کردیا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ ان کی وفات کے بعد وہ صحیفہ ان کی بیٹی ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آگیا۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحابہ رضی اللہ عنہم کو یاد یا ان کے پاس لکھی ہوتی تھیں اسی طرح قرآن حکیم بھی مختلف سورتوں اور آیات کی صورتوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس ہی موجود تھا۔ یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم جس طرح احادیث کے راوی ہیں اسی طرح قرآن حکیم کے بھی راوی ہیں۔ زید رضی اللہ عنہ بن ثابت نے انہی سے

قرآن کو جمع کیا تھا۔ اگر احادیث کے بارے میں ان پر اعتبار نہیں کیا جائے گا تو قرآن بھی مشکوک ہو جائے گا۔

احادیث کی جمع وتدوین

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں قرآن حکیم کی حفاظت پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ جس طرح یہود ونصاریٰ نے آسمانی صحیفوں میں بگاڑ پیدا کردیا تھا ویسا ہی قرآن کے بارے میں بھی معاملہ نہ ہو جائے، لیکن جب قرآن حکیم کی حفاظت کا مناسب بندوبست ہوگیا تو احادیث جمع کرنے والوں کو بھی اجازت مل گئی۔ جیسا کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو کے بارے میں لکھا جا چکا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کا لکھا اور جمع کردہ صحیفہ الصادقہ آج بھی مسند احمد میں ویسے ہی موجود ہے۔

ان میں سمرہؓ بن جندب (المتوفی 60ھ)، جابرؓ بن عبداللہؓ (المتوفی 78ھ)، حضرت علیؓ (المتوفی 40ھ)، عبداللہؓ بن عباسؓ (المتوفی 101ھ)، ان کے شاگرد سعدؓ بن جبیر (المتوفی 95ھ) بھی تھے ابوھریرہ کا صحیفہ برائے ھمام بن منبہ (المتوفی 101ھ)، خیال رہے حضرت ابوھریرہؓ 58ھ میں فوت ہوئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیفہ مذکورہ ان کی وفات سے پہلے لکھوایا گیا۔

جب قرآن حکیم کتابی صورت اختیار کرگیا اور بے شمار حفاظ وقراء کے سینوں میں محفوظ ہوگیا تو اہل علم نے تدوین حدیث کی طرف توجہ مبذول کی اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے علمائے اسلام کو اس کی دعوت دی تو امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری (المتوفی 124ھ) نے حدیث کی ایک کتاب مرتب کی۔ پھر یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔

امام مالکؒ بن انس 93ھ میں پیدا ہوئے اور 179ھ میں رب حقیقی سے جا ملے۔

لیکن مؤطا کے نام سے حدیث کی ایسی کتاب لکھ دی کہ خلیفہ منصور نے جبراً لوگوں سے اس کے مطابق عمل کرانا چاہا لیکن امام مالکؒ اس پر راضی نہ ہوئے۔ اس کے بعد بڑی بڑی کتابیں منظر عام پر آ گئیں۔

حدیث کی چند قسمیں

علم حدیث ایسا فن ہے کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ائمہ حدیث نے اس کی پرکھ کے قاعدے اور قوانین مرتب کر دیئے تھے کہ حدیث اس وقت قابل قبول ہوگی جب حدیث کا متن یعنی اصل عبارت اور اس کا مضمون شک وشبہ سے بالا ہو اور اس حدیث کو بیان کرنے والے عادل، عاقل، صحیح العقیدہ مسلم، امانت و دیانت کا خیال رکھنے والے، قرآن وسنت کے مطابق زندگی بسر کرنے والے، مضبوط حافظے والے ہوں اور ان کی طرف کبھی جھوٹ بولنے کی نسبت بھی نہ ہوئی ہو، یعنی ہمیشہ سچ کہنے والے ہوں۔ محدثین کے قائم کردہ معیار کے مطابق جب بھی کوئی بیان ہونے والی حدیث پوری نہ ہوتی تو اس کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔

علم حدیث بہت وسیع فن ہے۔ احادیث کی کئی قسمیں اور کئی اصطلاحات ہیں لیکن اس کتاب میں چند ضروری قسموں کا ذکر کرنا ہی مناسب ہوگا۔

1- <u>صحیح حدیث</u> سے مراد وہ حدیث ہے کہ جس کا متن یعنی مضمون قرآن وسنت کے مطابق ہو اور اس کو بیان کرنے والے سب راوی نیک صالح سچے ہوں۔ ان میں سے کسی پر ائمہ حدیث نے کوئی جرح نہ کی ہو۔ سند بھی متصل ہو اور اس میں کسی قسم کا کوئی نقص نہ ہو۔

2- <u>ضعیف حدیث</u> سے مراد وہ حدیث ہے کہ جس کے بیان کرنے والوں میں سے کسی

ایک یا زیادہ پر ائمہ حدیث نے جرح کی ہو یا اس کی سند میں انقطاع ہو یعنی کوئی راوی غائب ہو یا کسی راوی کا پورا حال معلوم نہ ہو یا جھوٹا ہونے کا اس پر اتہام ہو، ایسی حدیث آئمہ حدیث کے نزدیک قابل قبول نہ ہوگی۔

3- موضوع یا گھڑی ہوئی حدیث: ظاہر ہے کہ ایسی حدیث صریحاً جھوٹ ہوگا اور رسول اللہ ﷺ نے عمداً جھوٹی حدیث بیان کرنے والے کو جہنم کی وعید سنائی ہے۔

4- چوتھی حدیث وہ ہے کہ جو متن اور سند کے اعتبار سے صحیح ہو لیکن کسی راوی کے حافظے کی کمزوری عیاں ہو، تو ایسی حدیث کو حسن کہا جاتا ہے۔ جو صحیح سے کمتر اور ضعیف سے اعلیٰ ہوتی ہے۔ صحیح کی غیر موجودگی میں قابل قبول ہوتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں مرجوح ہوگی۔

امام ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ

ہمارے ہاں بہت سے پڑھے لکھے لوگ حدیث کے فن سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے احادیث کے بارے میں شک وشبہ کا شکار رہتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ آئمہ حدیث نے کس طرح سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث کو ضعیف وموضوع اور غیر ثابت شدہ روایات وحکایات سے الگ کرنے کے لیے دور دراز کے سفر کیے۔ دن رات انتہائی محنت ومشقت کے ساتھ کتابوں میں جمع کیا۔ احادیث کے مقبول اور غیر مقبول راویوں کے حالات زندگی الگ الگ کتابوں میں محفوظ کر دیئے تاکہ قیامت تک صحیح اور غیر صحیح حدیث میں فرق کرنے میں آسانی رہے۔

جن جلیل القدر ائمہ نے اس عظیم کارِ مقدس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں ان میں سب سے ممتاز امام بخاری کا نام ہے۔ 194ھ میں پیدا ہوئے۔ سمرقند

کے ایک چھوٹے قریہ فرتنگ میں 256ھ یکم شوال یعنی چاند رات میں دین کی خدمت میں زندگی گزارنے کے بعد اپنے رب کے پاس چلے گئے اور عید کے دن نماز ظہر کے بعد دفن کیے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو کمال حافظہ سے نواز رکھا تھا۔ ہزار سے اوپر اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ 20 سے زائد کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ صحیح بخاری ایسی حدیث کی کتاب لکھ دی کہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب امام بخاری کی صحیح بخاری ہے۔ کیونکہ امام کا حدیث نقل کرنے کا معیار بہت سخت تھا۔ رسول اللہ ﷺ سے حدیث بیان کرنے والوں کے درمیان ان کے نزدیک سماع ہی کافی نہیں تھا بلکہ ہر دو کے درمیان ملاقات کا ہونا بھی شرط تھا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے صحیح بخاری کی شرح فتح الباری کے مقدمہ میں نقل کیا ہے کہ امام بخاری ہر حدیث لکھنے سے پہلے دو نفل پڑھتے تھے یعنی اللہ سے اس کے صحیح ہونے کا مشورہ کیا کرتے تھے۔

صحیح بخاری کو کتب احادیث میں جو اونچا مقام حاصل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کو صحیح اور غیر صحیح میں اللہ نے فرق کرنے کی قدرت عطا کردی تھی۔

تدریب الراوی (ج1 ص293) میں حدیث مقلوب کے حوالے سے منقول ہے:

امام بخاری بغداد آئے تو وہاں اصحاب حدیث نے ایک سو احادیث لے کر ان کے متنوں اور سندوں کو آپس میں خلط ملط کر کے دس آدمیوں میں بانٹ دیا۔ پھر انہوں نے امام بخاری سے ایک مجلس کے انعقاد کا ایک وقت مقررہ پر وعدہ لے لیا۔ اہل علم کے علاوہ بغداد کے بہت سے لوگ بھی مجلس میں شریک ہوئے۔

امام بخاری جب اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو ان دس آدمیوں میں سے ایک کھڑا ہوا، اور خلط

ملط یعنی مقلوب روایات ان کو سنا دیں۔ امام صاحب نے کہا: میں ان روایات کو نہیں جانتا۔ دوسرے نے جب روایات سنائیں تو امام صاحب نے وہی بات کہی۔ میں ان کو نہیں جانتا۔ جب دس آدمی ایک سو روایات سنا چکے تو امام صاحب نے پہلے آدمی سے کہا: تم نے مجھے جو روایات سنائی ہیں وہ اس طرح نہیں جس طرح تو نے بیان کی ہیں بلکہ ان کی سندیں اور ان کے متن اس طرح ہیں۔

پھر دوسرے، تیسرے بلکہ بقیہ نو آدمیوں کی روایات درست کر کے امام صاحب نے سنا دیں۔ اہل بغداد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حافظہ اور حفظ حدیث پر بہت متعجب ہوئے۔

مذکورہ واقعہ سے ملتا جلتا واقعہ سمرقند میں بھی امام بخاری کو پیش آیا تھا۔ ملا علی القاری الحنفی (المتوفی 1014ھ) نے اس کو مشکوۃ کی شرح مِرقاۃ (ج1، ص14) میں نقل کیا ہے:

سمرقند میں چار سو محدث نو دن جمع ہو کر شامی اور عراقی احادیث کی اسناد و متون کو آگے پیچھے کرتے رہے تاکہ امام بخاری کو مغالطے میں ڈالیں۔ لیکن وہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر غالب نہ آسکے۔ ملا علی قاری نے یہاں بڑے اعلیٰ نکتے کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے حیرت اس بات پر نہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سو حدیثیں سند و متن کے ساتھ سنا دیں بلکہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے خلط ملط کی گئی روایات کو اسی طرح دوہرا دیا جس طرح ان کو سنائی گئی تھیں یعنی ایک ہی مرتبہ سننے سے انہوں نے یاد کرلیں اور سب کے سامنے سنا دیا۔

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی زیادہ تر کتابیں فن حدیث ہی پر ہیں اور انہوں نے صحیح بخاری کی 97 کتابوں میں 3350 ابواب قائم کر کے 7563 احادیث نقل کی ہیں جو تکرار کے بغیر چار ہزار رہ جاتی ہیں۔

امام ابوالحسن مسلم رحمۃ اللہ علیہ بن حجاجؒ

206ھ میں خراسان کے شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے۔حصول علم کے لیے کئی سفر کئے اور وقت کے بڑے بڑے اماموں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔امام بخاری جب نیشاپور آئے تو ان کی مجالس میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ بلکہ ایک موقع پر امام بخاری کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے اپنا پاؤں چومنے کی اجازت دیں۔فن حدیث پر انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔(امام نووی کا مقدمہ صحیح مسلم پر ص 12)

صحیح بخاری کی طرح صحیح مسلم کی شرائط زیادہ سخت نہ تھیں۔ان کے باوجود صحاح ستہ میں عموماً اس کو بخاری کے بعد دوسرا مقام دیا جاتا ہے۔اس میں مروی روایات کی تعداد تقریباً 5800 ہے۔جلیل القدر امام مسلم نے 50 سال کی عمر میں 261ھ کے رجب کے مہینے میں نیشاپور میں وفات پائی۔

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعثؒ

202ھ میں خراسان کے مشہور علاقہ سجستان میں پیدا ہوئے۔ازد قبیلے سے ان کا تعلق تھا جس کی وجہ سے ان کو ازدی بھی کہا جاتا تھا۔اس زمانے کے معمول کے مطابق انہوں نے بھی علم کی خاطر کئی سفر کئے۔ان کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب تھی اس وقت کے بلند پایہ محدثین وفقہاء امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بن حنبل، امام اسحاق رحمۃ اللہ راہویہ، امام یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ بن معین، ہشام بن رحمۃ اللہ علیہ عبدالملک طیالسی، ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ بن ابی شیبہ اور عثمان رحمۃ اللہ علیہ بن ابی شیبہ جیسے ائمہ کی شاگردی میں رہنے کا ان کو موقع ملا۔

حفظ وضبط اور نقابت وعدالت کی طرح جرح وتعدیل کے فن میں بھی ان کا بلند

مقام تھا۔صحیح وسقیم،قوی وضعیف،مشہور ومنکر اور حسن وشاذ جیسی روایات کو پرکھنے کا ان کو ملکہ حاصل تھا۔

275ھ میں كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ والا قانون ان پر جاری ہوا۔دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے 20 کے قریب اہم کتابیں لکھ دیں جن میں سنن ابی داؤد صحاح ستہ میں شامل ہے اور اس کی 40 کتابوں کے 1811 باب بنا کر 5374 احادیث لکھی گئی ہیں۔

امام ابوداؤد نے اس کی ترتیب وتالیف کا کام 241ھ سے پہلے بغداد میں انجام دیا تھا۔چار ہزار کے قریب احادیث احکام ومسائل کے متعلق ہیں۔

امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیبؒ النسائی

صحاح ستہ کے مصنفین ومؤلفین میں شامل ہونے والے امام النسائی خراسان کے مشہور شہر نساء میں 214یا215ھ میں پیدا ہوئے۔

حافظ ابن کثیر نے البداية والنهايه (ج 11 ص 123) میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے دور دراز شہروں کے سفر کئے۔سماع حدیث اور اس فن کے ان ماہر ائمہ اور کبار مشائخ سے ملاقاتیں کرنے میں مشغول رہے کہ جن سے بالمشافہ انہوں نے روایت کی ہیں۔

حافظ ابوعلی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا تھا کہ حدیث روایت کرنے کی شرط امام مسلم سے زیادہ سخت ان کی تھی۔امام الدار قطنی کا بیان ہے کہ امام نسائی اپنے دور کے تمام علمائے حدیث سے زیادہ افضل وبرتر تھے۔

حدیثوں کی پرکھ کے فن جرح وتعدیل میں بھی اللہ نے ان کو خاص مقام پر فائز

کررکھا تھا۔ احادیث کے سقم وصحت اور رجال کی معرفت میں سب سے آگے تھے۔ صبر و رضا، ضبط وتحمل اور شجاعت و بہادری جیسی صفات سے بھی آراستہ تھے۔ طبیعت میں ایسی بے نیازی تھی کہ کبھی عزتِ نفس کا سودا نہ کیا۔ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں شریک رہے لیکن اس کی مجلس کی ہم نشینی سے دور رہے۔ ان کے علم وفضل کی بنا پر ان کو حمص کا قاضی بھی مقرر کیا گیا۔ 303ھ میں وفات پا گئے۔ آپ نے احادیث کے راویوں کی پرکھ کے فن پر بڑی اہم کتابیں لکھیں۔ سنن النسائی کی 51 کتابوں کے 2526 ابواب میں 5761 احادیث مروی ہیں۔

امام ابوعیسیٰ محمد الترمذیؒ

امام موصوف 209ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم کے بعد مزید علم کی طلب میں اس وقت کے مشہور ائمہ حدیث وفقہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حجاز، عراق، خراسان، ماوراء النہر، شام، مصر مغرب وغیرہ میں بڑے بڑے علمی مراکز قائم ہو چکے تھے۔ قرآن وحدیث کے علم کے حصول کا ذوق شوق اپنے عروج پر تھا۔ امام ترمذی نے بھی ہر مرکز اور ہر ماہر فن سے خوب فائدہ حاصل کیا۔ اسی لیے ان کی جامع الترمذی فن تفسیر، احادیث اور فقاہت کی وجہ سے ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

تذکرۃ الحفاظ (ج 2 ص 130 رقم 658) میں امام الذہبی نے عمر بن علک کے حوالے سے امام الحاکم سے نقل کیا ہے، امام بخاری فوت ہو گئے لیکن علم وحفظ اور ورع و زہد کے اعتبار سے خراسان میں ابوعیسیٰ ترمذی کی مثل کوئی نہیں چھوڑا۔

خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ روتے روتے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی لیکن اللہ نے دل کی آنکھیں روشن کردیں۔

امام ترمذی کے زمانے میں ائمہ اربعہ کا چرچا ہو چکا تھا لہٰذا مختلف مسائل کا ذکر کرتے ہوئے وہ ائمہ کے حوالے بھی دیتے ہیں۔

ترمذ میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں 279ھ میں وفات پائی۔ ان کی جامع کی 46 کتابوں کے 2117 ابواب میں 3956 احادیث جمع کردی گئی ہیں۔

امام ترمذی، حکیم ترمذی اور ترمذی کبیر میں فرق

امام ابوعیسیٰ ترمذی کے علاوہ نوادر الاصول فی معرفۃ احادیث الرسول کے مؤلف ابوعبداللہ محمد الحکیم کا تعلق بھی ترمذ سے تھا اور وہ حکیم ترمذی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی کتاب میں بہت سی احادیث غیر معتبر، ضعیف اور کئی موضوع ہیں۔ کتاب میں الاصل کے نام پر 291 ابواب قائم کئے گئے ہیں اور صفحات کی تعداد 432 ہے۔ نوادر الاصول کے حواشی پر مشتمل 142 صفحات کی کتاب مرقاۃ الوصول ساتھ لگا دی گئی ہے۔

ضعیف اور مرفوع روایات کا سہارا لینے والے ایسے بھی ہیں جو روایت تو نوادر الاصول کی نقل کرتے ہیں لیکن تاثر یہ دیتے ہیں کہ اس کے راوی امام ابوعیسیٰ جامع الترمذی والے ہیں۔ نوادر الاصول میں منقول تمام احادیث بغیر اسناد کے ہیں۔ صرف پہلے راوی کا نام دیا جاتا ہے جس سے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ صحابی کی روایت ہے اور شک و شبہ سے بالا ہے۔ جبکہ امام ابوعیسیٰ الترمذی نہ صرف سند نقل کرتے ہیں بلکہ اس کے راویوں کے بارے میں جرح و تعدیل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے فیصلہ بھی دیتے ہیں۔ سند میں کمزوری ہو تو اس کو بھی واضح کرتے ہیں۔

ایک اور بزرگ ابوالحسن ترمذی تھے جن کا ذکر امام الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ

(ج2،ص536، رقم 553) میں الترمذی الکبیر کے عنوان سے کیا ہے۔ وہ العلل والرجال اور الفقہ میں مہارت رکھنے والے تھے۔ امام احمد بن حنبل کے اصحاب میں سے تھے۔ امام بخاری، امام ابوعیسیٰ ترمذی، امام ابن خزیمہ وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ 240ھ کے بعد انہوں نے وفات پائی۔

امام ابوعبداللہ محمد ابن ماجہ

یہ بلند پایہ امام 209ھ میں قزوین میں پیدا ہوئے جو علماء ومحدثین کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ دین کے جتنے علوم کی تحصیل وہاں ممکن تھی، جب کر چکے تو مزید علم کی تلاش وجستجو نے وطن سے باہر نکل کر ان مراکز کی طرف رخ کرا دیا جو خراسان، عراق، حجاز، مصر، شام، بصرہ، مکہ اور رے وغیرہ میں قائم ہو چکے تھے۔ جہاں درس وتدریس کا معیار اپنے عروج پر تھا۔ چونکہ اللہ نے زبردست حافظے سے نواز رکھا تھا اس لیے حدیث کے فن کی طرف ان کا زیادہ میلان تھا۔

امام الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو عظیم الشان حافظ وضابطہ، صادق القول اور وسیع العلم قرار دیا ہے۔ جبکہ علامہ ابن جوزی کے مطابق وہ حدیث وتاریخ اور تفسیر کے ممتاز ماہر تھے۔ علامہ ابن خلکان کا کہنا ہے کہ وہ فن حدیث کے امام اور اس کے متعلقات پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ 273ھ یا 275ھ میں رب حقیقی سے جا ملے۔

اپنی سنن ابن ماجہ کی 37 کتابوں کے 1513 ابواب میں انہوں نے 4341 احادیث کو جمع کیا ہے۔

امام ابومحمد عبداللہ عبدالرحمٰن الدارمیؒ

181ھ میں خراسان کے مشہور شہر سمرقند میں پیدا ہوئے۔ حدیث کی طلب وتکمیل

کے لیے تمام بڑے بڑے اسلامی تعلیمی مراکز کی طرف کئی سفر کیے۔

امام صفی الدین احمد بن عبداللہ الخزرجی نے اپنی کتاب خلاصۃ تھذیب لتھذیب الکمال (رقم 3618 ج 2 ص 74) میں امام الدارمی کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ کبار علماء میں سے ایک صاحب مسند، تفسیر اور جامع تھے۔ امام احمد بن حنبل کے نزدیک وہ اپنے زمانے کے امام تھے۔

ابن حبان نے ان کے بارے میں کہا کہ وہ ان میں سے تھے جنہوں نے حفظ کیا اور حفظ شدہ جمع کیا۔ اس کو سمجھا اور لکھا، پھر بیان کیا۔ اپنے شہر میں سنت کو غالب کیا اور لوگوں کو اس کی دعوت دی۔ شکوک و اعتراضات کا جواب دیا۔ جھوٹ کی آمیزش سے پاک کر کے عوام وخواص کے دلوں میں اس کی اہمیت وعظمت کو اجاگر کیا۔

75 سال کی عمر میں اپنے ہی وطن سمرقند سے 8 ذوالحجہ 255ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کو جب ان کی وفات کی خبر ملی تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور سر جھکا کر انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کہا۔

سنن الدارمی کی 35 کتابوں کے 1364 ابواب میں 3456 احادیث جمع کی گئی ہیں۔

احادیث کی پرکھ اور اس کے لیے لکھی گئی کتابیں

احادیث کے بارے میں شک وشبہ کا شکار ہونے والوں کو معلوم ہی نہیں کہ ائمہ حدیث نے سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی صحیح احادیث کو غیر صحیح اور من گھڑت احادیث و روایات اور حکایات سے کس طرح الگ کیا۔ ائمہ حدیث نے سالہا سال کی محنت و مشقت سے احادیث کے راویوں کے حالات جمع کیے۔ جن کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ پھر ان میں ان کی بیان کردہ احادیث کو کتابوں میں جمع کیا کہ جن کے بارے میں ان کو

یقین ہوگیا کہ ان میں جھوٹ یا کسی کمزوری کی کوئی آمیزش نہیں۔ ضعیف اور احادیث گھڑنے والوں کو الگ کتابوں میں جمع کردیا۔

مذکورہ جلیل القدر ائمہ کی کتابوں میں جمع کی گئی احادیث کی تعداد اس لیے لکھی گئی ہے تاکہ معلوم ہوسکے کہ ان میں تکرار کے بغیر مشترک اور غیر مشترک کو جمع کیا جائے تو دس بارہ ہزار بھی تعداد نہیں بنے گی۔ بخاری مسلم کی جن روایات پر دونوں کا اتفاق ہے ان کی تعداد 2326 ہے جبکہ دس سالہ اچھے حافظ قرآن بچے کو نماز تراویح پڑھانے کے لیے کھڑا کیا جائے تو قرآن حکیم کی چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات آسانی سے سنادے گا۔

پاکستان میں اب بھی لاکھوں انسان ایسے ہوں گے جو پاکستان بننے کے حالات بیان کرسکتے ہیں۔ پاکستان کے بانی محمد علی جناح پر کتنا کچھ لکھا جاچکا ہے اور اخبارات میں ہر سال ان کی پیدائش اور وفات کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جاتا ہے۔ گزرے ہوئے واقعات کی یاد کو تازہ کیا جاتا ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جس سے تعلق رکھنے والے ان کو پیش آئے واقعات قطعی طور پر بھول چکے ہوں۔ جن واقعات کے وہ شاہد تھے اس کو وہ ضرور بیان کرسکتے ہیں۔

کسی بوڑھے کھلاڑی سے مل کر اس کے ماضی کے تجربات و واقعات کی بات کریں تو وہ سب کچھ بیان کرے گا کہ جیسے وہ ان کا مشاہدہ اب کررہا ہے۔

بہت سے لوگ سفر پر جاتے ہیں اور واپس آکر سفرنامہ تحریر کرتے ہیں۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تحریر تو نہیں کرتے لیکن بہت سی باتیں ان کے ذہن و دماغ میں محفوظ ہوجاتی ہیں۔

علمی دنیا سے تعلق رکھنے والوں کے حافظے تو بہت تیز ہوتے ہیں۔ شعراء ہزاروں اشعار زبانی یاد کرلیتے ہیں۔ افسانہ نویسی سے تعلق رکھنے والے کتابوں کے ڈھیر لگادیتے

ہیں۔لیکن جب احادیث کی بات ہوتی ہے تو اس کے بارے میں شیطانی وسوسوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ایسی شیطانی سوچ رکھنے والے بھول جاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک میں لکھنے کا رواج نہیں تھا۔صدیوں پرانی باتیں لوگوں کو ویسے ہی یاد تھیں، ان کو اپنے آباؤاجداد کے نام اور خاندانی واقعات خوب یاد رکھنے کی عادت تھی۔

آج کے کسی نوجوان کو روک کر آپ اس سے اس کے دادا، پڑدادا، دادی، پڑدادی، نانا نانی، پڑنانا اور پڑنانی کے نام پوچھیں تو بہت کم نوجوان ہوں گے جن کو یہ نام یاد ہوں۔ اس سے اوپر تو سوچا ہی نہیں جاسکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی 23 سالہ زندگی کے شب و روز کا مشاہدہ کرنے والوں کے بارے میں یہ سوچنا کہ جو انہوں نے سنا اور دیکھا اس کو سچ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔کیونکہ بیچ میں عرصہ دراز حائل تھا۔یہ بات درست نہیں۔کیونکہ احادیث کے راویوں نے روایات کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیا۔صحابہ رضی اللہ عنہم وصحابیات رضی اللہ عنہن نے تابعین کو اور تابعین نے تبع تابعین کو اور انہوں نے پھر اس سلسلے کو ائمہ حدیث کے حوالے کردیا جنہوں نے احادیث کے پاک سلسلہ کی حفاظت کا حق ادا کردیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے احتیاط کی وجہ

صحابہ کی عادت تھی کہ جن احادیث کے بارے میں شک ہوجاتا تو اس پر شہادت طلب کرلیا کرتے تھے۔

اس کی ابتدا صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ ہی سے ہوگئی تھی۔ صحیح بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم والاستیذان ثلثاً (ص923) اور صحیح مسلم باب الاستیذال (ج2ص210) میں ابوسعید الخذری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔میں انصار کی ایک

مجلس میں تھا کہ ابوموسیٰ خوفزدہ حالت میں وہاں آئے۔ انہوں نے کہا: میں نے عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہونے کی اجازت کے لیے تین مرتبہ السلام علیکم کہا، جب مجھے اجازت نہ ملی تو میں واپس لوٹ آیا۔ انہوں نے بعد میں مجھ سے پوچھا، حاضر ہونے سے تجھے کس بات نے روکا۔ میں نے کہا: میں نے تین بار سلام کیا، جب اجازت نہ ملی تو میں واپس آ گیا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین بار تمہارا کوئی سلام کرے اور اس کو اجازت نہ ملے تو وہ واپس چلا جائے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! تم کو ضرور اس پر گواہی قائم کرنی ہوگی۔ (مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے: اِلَّا اَوجَعْتُكَ ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا) تم میں سے کوئی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا سنا ہو۔

ابی بن کعب نے کہا: اللہ کی قسم! تمہارے ساتھ وہی کھڑا ہوگا یعنی گواہی دے گا جو قوم میں سب سے چھوٹا ہے چونکہ میں ہی سب سے چھوٹا تھا، لہٰذا کھڑا ہوا اور عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر گواہی دے دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی فرمایا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا یہود و نصاریٰ نے جھوٹی روایت کو اپنے اپنے دین میں شامل کر لیا تھا۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر اعلان کر دیا: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم کی آگ میں بنا لے۔

اس روایت کو امام ابن جوزی (التوفی 597ھ) نے اپنی کتاب الموضوعات (ج1 ص56 تا92) میں 61 جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے۔ ان میں سے دس وہ ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی مبارک میں جنت کی بشارت دی تھی۔ ان میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ام ایمن بھی شامل ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ایک ہی تھی لیکن سننے والوں کی تعداد 61 ہوگئی۔ پھر جب وہی ایک حدیث دوسرے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ذریعے علم حدیث کے طالبوں تک پہنچی ہوگی تو ہزاروں سننے والے اس کے راوی بن گئے۔

اس سے مسئلہ یہ بھی صاف ہوتا ہے کہ محدثین نے لاکھوں حدیثوں میں چند چند ہزار اپنی اپنی کتابوں میں جمع کیں۔ درحقیقت حدیثوں کے متن یا مضامین لاکھوں میں نہ تھے بلکہ سننے اور سنانے والے لاکھوں میں تھے۔ جن میں ثقہ، ضعیف اور ضعف کی کئی قسموں سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ محدثین نے راویوں کو دیکھا، احادیث کی سندوں کو پرکھا، تو ان میں سے ثقہ راویوں والی سندوں کو اپنی اپنی کتابوں کے لیے منتخب کرلیا۔

محدثین کا یہی کمال تھا کہ لاکھوں راویوں کے حالات ان کو حفظ تھے۔ امام احمد بن حنبل، امام الشافعی، امام ابن حبان، امام ابن خزیمہ، امام الدارقطنی اور ابوعبداللہ الحاکم جیسے ائمہ نے ان کی بیان کردہ احادیث کو اپنی اپنی کتاب میں جمع کردیا۔ انسان ہونے کے ناتے جو کمی کوتاہی رہ گئی اللہ نے اس کو دور کرنے کے لیے ایسے ائمہ پیدا کیے جنہوں نے احادیث کی پرکھ کے لیے باقاعدہ اصول بنائے۔ ثقہ راویوں سے ضعیف و متروک اور احادیث گھڑنے والوں کو الگ کتابوں میں جمع کردیا اور ان کی کمزوریاں تفصیل سے بیان کردیں۔

ضعفاء و متروکین والی کتابیں

(1) امام بخاری کی کتاب التاریخ الکبیر 8 مجلدات۔ (2) التاریخ الصغیر (3) حافظ ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابی حاتم (المتوفی 327ھ) کی الجرح والتعدیل 9 مجلدات (4) حافظ ابوجعفر محمد بن عمرو بن موسیٰ بن حماد العقیلی (المتوفی 322ھ) 4 مجلدات (5) حافظ عبداللہ بن عدی الکامل (المتوفی 365ھ) کی الکامل فی ضعفاء الرجال 8

مجلدات (6) حافظ ابن حجر عسقلانی (التوفی 852ھ) کی تہذیب التہذیب 12 مجلدات (7) حافظ امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی (التوفی 303ھ) کی کتاب الضعفاء والمتروکین 1 جلد (8) امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان الذہبی (التوفی 748ھ) کی میزان الاعتدال 4 مجلدات (9) امام خطیب البغدادی (التوفی 463ھ) کی الکفایۃ 1 جلد (10) امام الرازی کی العلل 2 مجلدات (11) امام ابن صلاح (التوفی 643ھ) کا مقدمہ 1 جلد (12) ملا قاری علی الحنفی (التوفی 1014ھ) کی الموضوعات الکبری ج1 (13) امام ابوالفرج ابن الجوزی (التوفی 597ھ) کی کتاب الموضوعات 3 مجلدات (14) علامہ محمد بن علی الشوکانی (التوفی 1350ھ) کی الفوائد المجموعۃ 1 جلد (15) حافظ ابن حجر کی لسان المیزان (16) امام ابوالنعیم الاصبہانی (التوفی 420ھ) کی کتاب الضعفاء (17) امام ابوالفضل محمد بن طاہر بن احمد (التوفی 807ھ) کی تذکرۃ الموضوعات (18) امام ابو زرعۃ الرازی (التوفی 264ھ) کی کتاب الضعفاء (19) علامہ السیوطی (التوفی 911ھ) کی اللآلی، (20) امام ابن حبان (التوفی 739ھ) کی کتاب المجروحین اور کتاب الثقات۔ مذکورہ کتابوں میں ان تمام ضعیف اور کذاب راویوں کے حالات دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس تمام سوانحی سرمایے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ائمہ حدیث نے رسول اللہ ﷺ کی پاک احادیث کی حفاظت کس طرح کی، ساری امت جمع ہوکر ان کے احسان کا بدلہ نہیں دے سکتی۔

جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے کا عجیب واقعہ

ہمیشہ سے بات چلی آرہی ہے کہ جھوٹ بولنے والا بڑا دلیر اور بے حیا ہوتا ہے۔ کوئی اس پر گرفت کرے تو اس کو جھٹلا دیتا ہے۔ جھوٹ بولنے پر لحہ بھر کے لیے بھی شرمسار نہیں

ہوتا۔ جو اسے جھوٹا کہے الٹا اس کو ہی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن ابن جوزی نے اپنی کتاب الموضوعات (ج 1 ص 46) اور ملا علی قاری حنفی نے الموضوعات (ص 54-53) میں نقل کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل اور امام یحیی بن معین نے الرصافہ کی مسجد میں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ایک قصہ گو کھڑا ہوا اور اس نے کہا: ہم سے احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے بیان کیا۔ دونوں نے کہا: ان سے عبدالرزاق اور اس سے معمر نے اور اس سے قتادہ نے اور اس سے انس رضی اللہ عنہ اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے لا الہ الا اللہ کہا تو اللہ تعالیٰ ہر کلمہ سے ایک ایسا پرندہ پیدا کر دیتا ہے کہ جس کی چونچ سونے کی اور پر مرجان کے ہوتے ہیں۔'' پھر اس نے بیس صفحات کے برابر الفاظ اس قصہ کو مزین کرنے پر صرف کر دیئے۔

امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ امام احمد بن حنبل نے یحییٰ بن معین سے کہا: کیا آپ نے یہ حدیث اس سے بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم میں نے آج ہی اسی وقت یہ حدیث سنی ہے۔

جب وہ قصہ گو اپنی تقریر سے فارغ ہوا اور عطیات دینے والوں کے عطیات وصول کر چکا تو امام یحییٰ بن معین نے اس کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید یہ بھی کچھ دے گا اس لیے آ گیا۔ یحییٰ بن معین نے اس سے پوچھا: یہ حدیث تجھ سے کس نے بیان کی۔ کہنے لگا: احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے۔ اس نے یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل کو پہلے دیکھا ہوا نہ تھا۔ ان کی شہرت کی بنا پر ان کا نام استعمال کر رہا تھا۔

یحییٰ بن معین نے کہا: میں یحییٰ بن معین ہوں اور یہ امام احمد بن حنبل ہیں۔ ہم نے یہ حدیث رسول ﷺ کے حوالے سے نہیں سنی۔ اگر تو نے ضرور جھوٹ ہی بولنا ہے تو ہماری بجائے کسی اور کا نام لیا کر۔

اس قصہ گو نے کہا: کیا تم ہی یحییٰ بن معین ہو، یحییٰ بن معین نے کہا: ہاں میں ہی یحییٰ بن معین ہوں۔ کہنے لگا: میں نے سنا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ وہ واقعی احمق ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں احمق ہوں۔

قصہ گو نے کہا: کیا دنیا میں یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل کے علاوہ کوئی اور یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل نہیں۔ میں نے سترہ یحییٰ بن معین اور سترہ احمد بن حنبل سے روایات لکھ رکھی ہیں۔

اس قصہ گو کی بات سن کر امام احمد بن حنبل نے اپنے کُرتے کی آستین سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور یحییٰ بن معین نے کہا: اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور دونوں عظیم امام وہاں سے اٹھ گئے۔

امام ابن جوزی نے اس وقت کے کئی وضاعین کی نشاندہی کی ہے بلکہ ان میں سے ان بعض کا بھی ذکر کیا ہے جو بعد میں نادم ہو کر تائب ہو گئے۔

ج 1 ص 49 میں امام محمد بن عثمان بن ابی شیبہ کے حوالے سے ایک وضّاع کی توبہ کا قصہ بیان کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ کا کہنا ہے کہ میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا کہ ایک آدمی میرے آگے آگے کہہ رہا تھا: اے اللہ! مجھے بخش دے، میرا خیال ہے کہ تو مجھے نہیں بخشے گا۔

میں نے اس شخص سے کہا: تیرے گناہ سے بڑا گناہ تو یہ ہے کہ تو اللہ سے مایوسی کا اظہار کر رہا ہے۔ اس نے کہا: مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جب میں نے اس کے گناہ کے جاننے پر اصرار کیا تو اس نے بتایا کہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے پچاس جھوٹی حدیثیں گھڑ کر بیان کیں جو لوگوں میں پھیل گئیں۔ اب میں ان کی نفی کرنے یا ان کو واپس لوٹانے پر قادر نہیں ہوں لہٰذا اللہ مجھے کیا بخشے گا۔

جھوٹی روایت بیان کرنے کا گناہ

پہلے بیان ہو چکا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مجھ سے جھوٹی حدیث بیان کی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔ (ابوداؤد الطیالسی ج2 کتاب الحدیث)

صحیح مسلم (ج1 ص6)، ترمذی: ابواب العلم (ج2 ص106)، ابن ماجہ (مقدمہ ص5)، مسند احمد (ج1 ص113) مسند احمد (ج5 ص14-20) میں علی رضی اللہ عنہ، سمرۃ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ حَدَّثَ عَنِّیْ حَدِیْثًا وَھُوَ یُرٰی اَنَّہٗ کِذْبٌ فَھُوَ اَحَدُ الْکَاذِبِیْنَ۔ مسند احمد (ج1 ص113) میں اَحَدٌ کی بجائے اَکْذَبُ جس نے مجھ سے کوئی حدیث بیان کی اور اس کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک ہوگا۔ مسند احمد (ج1 ص113) میں ''ایک'' کی بجائے ''جھوٹوں میں سے سب سے زیادہ جھوٹا ہوگا'' کا لفظ ہے۔

افسوس ہے کہ اس کے باوجود ضعیف و موضوع روایات کو نہ صرف بیان کیا جاتا ہے بلکہ ان کو بیان کرنے اور ان کو حسن و صحیح ثابت کرنے میں علم و تحقیق کی بجائے جذباتی وابستگی کا سہارا لیا جاتا ہے۔امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا جس کی گواہی حافظ ابن کثیر کی تاریخ البدایہ میں موجود ہے اور علماء حق نے بھی ان پر ہونے والے ظلم پر سخت احتجاج بھی کیا تھا۔

۲

ہماری تالیف کا محرک

7 دسمبر 2007ء کی بات ہے روزنامہ نوائے وقت لاہور کے ملی ایڈیشن میں ''حج بیت اللہ کے بعد مدینہ منورہ کا سفر'' کے عنوان سے لکھا گیا مضمون نظر سے گزرا۔ جس میں مضمون نگار نے لکھا تھا۔ آپ حج بیت سے فارغ ہو گئے۔ اب مدینہ طیبہ کا قصد ہے۔ یہ بڑا مبارک سفر ہے۔ روضہ اقدس (علی صاحبها الصلوة والسلام) کی زیارت کی نیت کر لیجئے۔ حضرت ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ بالاتفاق تمام مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے روضہ اقدس کی زیارت اہم ترین نیکیوں اور افضل ترین عبادات میں سے ہے اور اعلیٰ درجات تک پہنچنے کے لیے کامیاب ذریعہ اور پر امید وسیلہ ہے۔ افضل المستحبات اور واجب کے قریب ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی جذب القلوب میں لکھتے ہیں: یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کے روضہ اقدس کی زیارت کا قصد کرنا اور آپ کی مسجد شریف کی زیارت سے مشرف ہونا حج مقبول کے برابر ہے بلکہ جو حج کیا ہے اس کی قبولیت کا سبب اور ذریعہ بھی ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی نیز ارشاد فرمایا: جس نے میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی، اس نے گویا میری زندگی میں زیارت کی۔

مضمون تو خاصا طویل تھا لیکن میرا ذہن مذکورہ عبارت میں ہی اٹک گیا جبکہ شفاعت والی روایت کو عنوان کے نیچے سرخ رنگ میں نمایاں کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک

انتہائی مؤقر اخبار میں یوں شائع ہونے والی حدیث کے ضعیف یا موضوع ہونے کا گمان کون کرے گا۔ جبکہ ائمہ حدیث کے نزدیک مذکورہ دونوں بلکہ ایسی جتنی بھی روایات ہیں ان میں سے کوئی بھی صحیح مرفوع نہیں۔ بعض ضعیف اور بعض موضوع (من گھڑت) ہیں۔

صحیح مسلم: کتاب الایمان (ج1ص5)، جامع الترمذی: ابواب الفتن (ج2ص49)، سنن النسائی کتاب الایمان (ج2ص265)، مسند احمد (ج3 ص20، 49)، سنن ابو داؤد (ص 162) میں ابوسعید الخدری سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ رَاٰی مِنکُمْ مُنکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔

تم میں سے کوئی برائی دیکھے (طاقت والا یا صاحب اختیار ہو) تو طاقت سے اس کو ختم کر لے۔ اگر طاقت والا نہ ہو تو زبان استعمال کرے اور اگر زبان استعمال نہ کر سکے تو پھر اس کو دل میں برا سمجھے اور یہ ایمان کی انتہائی کمزوری کی علامت ہے۔

سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے ارشاد مبارک کے مطابق میں خود نوائے وقت کے ایڈیٹر کی خدمت میں 11 دسمبر 2007ء کے دن حاضر ہوا اور عوام الناس کو مذکورہ روایات کی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے ایک مراسلہ پیش کیا۔ جس کے شائع ہونے میں 43 دن لگ گئے حالانکہ مجید نظامی صاحب نے اس کے شائع کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ جب ایک مہینہ گزرنے پر شائع نہ ہوا تو فون کرنے پر معلوم ہوا، غلطی سے رہ گیا ہے۔ اس کی کاپی بھجوا دیں۔ جب کاپی بھجوائی گئی تو بھی مزید دس دن لگ گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے اس کا جواب لکھوا کر اس کو شائع کیا گیا کیونکہ اس کا جواب تیسرے ہی دن

اس اختتام کے ساتھ شائع ہوا کہ اب یہ بحث ختم کی جارہی ہے۔اس حوالے سے مزید کوئی تحریر شامل اشاعت نہیں ہوگی یعنی بحث کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کردیا گیا حالانکہ جواب کا جواب دینے کا میرا حق تھا لیکن جواب دینے والوں نے بحث کو آگے بڑھنے نہ دیا لہٰذا میرے پاس پمفلٹ یا کتابی صورت میں جواب دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔اس لیے پہلے اپنا مضمون نقل کرتا ہوں پھر اس کا جواب نقل کرکے اس کی حقیقت سے ان شاء اللہ آگاہ کروں گا۔

میرا مراسلہ

23 جنوری 2008ء بعنوان ''ایک حدیث پر علمی تحقیق''

مکرمی! اہل علم پر واجب ہے کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث مبارک کا حوالہ دیں تو اچھی طرح تسلی کرلیں کہ وہ ضعیف یا موضوع تو نہیں کیونکہ جس قول وفعل کی نسبت سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جارہی ہے اس کی سند ہر قسم کے شک و شبہ یا جھوٹ کی آمیزش سے پاک ہونی چاہیے۔

7 دسمبر 2007ء کے ملی ایڈیشن میں حج بیت اللہ کے حوالے سے دو حدیثیں نقل کی گئی تھیں:

1- جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگی۔

2- جس نے میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی اس نے گویا میری زندگی میں زیارت کی۔

یہ دونوں روایات سنن الدار قطنی ج2 باب المواقیت (رقم 193 اور رقم 194) میں مروی ہیں۔پہلی روایت کے راویوں میں سے موسیٰ بن ہلال العبدی کے بارے میں

حدیث کے فن جرح وتعدیل کے ائمہ ابو حاتم اور العقیلی کا کہنا ہے کہ وہ مجہول تھا اور اس کی بیان کردہ حدیث صحیح نہیں ہوتی۔ امام الذہبی کے مطابق مذکورہ حدیث کے مرفوع ہونے کا انکار کیا گیا ہے۔

دوسری روایت کے ایک راوی ہارون بن قزعة یا ہارون ابی قزعة کے بارے میں امام بخاری کا فیصلہ ہے کہ اس کی بیان کردہ حدیث کی اتباع نہیں کی جائے گی۔ ہارون کا استاد بھی مجہول ہے۔ یہ تخریج سنن الدار قطنی کے حاشیے میں منقول ہے۔

امام ابن تیمیہ سے ان کے مجموعہ فتاویٰ (ج 27 ص 25) میں پہلی حدیث کے بارے میں منقول ہے کہ یہ ضعیف سند کے ساتھ الدار قطنی نے روایت کی ہے جس کی بنا پر ایک سے زیادہ ائمہ حدیث نے اس کا ذکر گھڑی گئی روایات میں کیا ہے اور کسی معتمد صحیح کتابوں، السنن اور مسانید میں ائمہ حدیث نے اس کو نقل نہیں کیا۔

رہی بات روضہ اقدس کی زیارت کا قصد تو یہ بھی کسی حدیث کی کتاب میں مذکور نہیں کیونکہ یہ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی واضح ہدایت کے خلاف ہے۔ صحیح بخاری: باب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ (ص 158) اور مسلم (ج 1 باب فضل المساجد الثلاثہ ص 447) میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تین مساجد کے علاوہ کجاوے نہ باندھے جائیں یعنی اجر وثواب کے حصول کے لیے سفر نہ کیا جائے۔ وہ مسجد حرام، رسول اللہ ﷺ کی مسجد اور مسجد الاقصیٰ ہیں۔

اسی باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری مسجد میں پڑھی جانے والی ایک نماز مسجد حرام کے علاوہ دوسری مساجد میں پڑھی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے بہتر ہوگی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان والی جگہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے۔

صحیح بخاری کتاب الجنائز باب ماجاء فی قبر النبی ﷺ وابی بکر و عمر (ص 168) میں عائشہ ؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری میں فرمایا کہ جس سے آپ صحت یاب نہ ہوئے، اللہ کی لعنت یہود و نصاریٰ پر جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔ عائشہ ؓ کا قول ہے: اگر آپ کا یہ فرمان نہ ہوتا تو میں آپ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے عام اجازت دے دیتی۔ خطرہ اس بات کا ہے کہ کہیں اس کو سجدہ گاہ نہ بنالیا جائے۔

لٰہذا مدینہ طیبہ جانے والوں کو قصد مسجد نبوی کا کرنا چاہئے اور وہاں جا کر آپ کی قبر مبارک کے پاس درود وسلام کہنے کے بعد دعا کرنے کے لیے چہرہ بیت اللہ کی طرف کر کے اللہ سے مانگنا چاہئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جس عمل سے دن میں سید الانبیاء ﷺ کی شفاعت پانچ مرتبہ نصیب ہوسکتی ہے اہل اسلام اس کی پرواہی نہیں کرتے۔

صحیح بخاری باب الدعاء عند النداء (ص 86) میں جابر بن عبداللہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور اس نے دعا کی۔ اے اللہ! اس دعوت تامہ اور قائم ہونے والی نماز کے رب: محمد ﷺ کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور مقام محمود پر پہنچا جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔

یہ دعا کرنے والے کو بشارت دی گئی ہے کہ اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگی یعنی وہ اس کا مستحق ہوگیا۔

صحیح مسلم (ج 1 ص 166) میں عبداللہ بن عمرو ؓ بن العاص سے وضاحت یوں منقول ہے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے سنا: جب تم مؤذن کی اذان سنو تو تم بھی وہ کہو جو وہ کہے۔ پھر مجھ پر درود بھیجو جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ اس پر دس مرتبہ درود بھیجے گا۔ (یہاں خیال رہے کہ آپ پر درود بھیجنے سے مراد آپ کے

لیے دعا ہے اور اللہ کے درود سے مراد اس کی رحمت ہے) اس کے بعد میرے لیے اللہ سے وسیلہ کا سوال کرو۔ وہ جنت میں ایک جگہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کے لیے ہوگی۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہوں گا جو میرے لیے اللہ سے وسیلہ کا سوال کرے گا اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگی۔ صحیح مسلم کی دوسری روایت میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ جب مؤذن حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے الفاظ کہے تو تم اس کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہا کرو۔

امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی اپنی کتاب کے کتاب الایمان میں نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارا کوئی اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اس کے والد اور اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ لہٰذا آپ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی قول وفعل آپ کی طرف منسوب نہ کیا جائے کہ جو سنداً ثابت نہ ہو۔ وما علینا الا البلاغ

میرے مراسلہ کا جواب

میرے مراسلے کے جواب میں علمی تحقیق کو جذباتی رنگ دینے کے لیے عنوان "بارگاہ نبوی کی حاضری" قائم کر کے دو حدیثوں کی صحت ثابت کرنے کی بجائے بحث کو طول دے کر مسئلے کو الجھا دیا لیکن احادیث کا ضعف پھر بھی دور نہ ہوا۔ حسب ذیل مقالہ اس تحقیق کا جواب تھا:

بارگاہ نبوی ﷺ کی حاضری (علم وتحقیق کی روشنی میں)

مفتی محمد خان قادری

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور (23 جنوری) مولانا فضل الرحمٰن بن محمد کی طرف

سے ''ایڈیٹر کی ڈاک'' کے کالم میں ''ایک حدیث پر علمی تحقیق'' کے عنوان سے ایک خلاف حقیقت خط چھپا ہے جس میں انہوں نے بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضری کے بارے میں امت مسلمہ کو مغالطے میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ:

1- رسالت مآب ﷺ کی بارگاہ کی حاضری قصداً ممنوع ہے۔

2- زیارت نبوی ﷺ پر حدیث من گھڑت ہے۔

3- بارگاہ نبوی ﷺ پر دعا آپ کی طرف منہ کر کے نہ کی جائے بلکہ قبلہ رخ ہو کر کی جائے۔

ان تینوں اعتراضات کا علمی و تحقیقی جواب حاضر ہے۔

1) رسالت مآب ﷺ کی بارگاہ عالی میں حاضری کے حوالے سے تمام دلائل شریعہ قرآن و سنت، اجماع و قیاس اس پر متفق ہیں کہ یہ حاضری مستحب اور واجب کے قریب ہے اور ایک امتی کے لیے آپ ﷺ کی شفاعت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے:

ولو انهم اذ ظلموا............

ترجمہ: ''الخ، یعنی اگر لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر لیں تو وہ آپ کی خدمت میں آجائیں، اللہ سے معافی مانگیں اور رسول اللہ ان کی سفارش فرما دیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا پائیں گے۔ (پارہ 5، سورۃ النساء)

اس آیت سے واضح ہو رہا ہے کہ بارگاہ نبوی ﷺ کی حاضری ہر شخص کے لیے فضیلت کا درجہ رکھتی ہے، خواہ وہ شخص قریب کا رہنے والا ہو یا دور کا باسی نیز ظاہری حیات اور بعد از وصال دونوں حالتوں میں کوئی تفریق نہیں، مزید یہ کہ اس آیت مبارکہ میں واضح طور پر لوگوں کو ترغیب اور کامل شوق دلایا ہے کہ وہ آپ ﷺ کی خدمت عالیہ میں

حاضر ہوتے رہیں خواہ انہیں کتنا ہی سفر کرنا پڑے۔

اس آیت کا یہی معنی و مفہوم امت کے تمام محدثین، فقہا، مفسرین، صوفیاء اور اہل علم نے سمجھا، بیان کیا اور آج تک اسی پر عمل پیرا ہیں اور انہوں نے اس آیت کی تفسیر کے تحت واضح طور پر یہ تصریحات کی ہیں کہ یہ حکم صرف آپ ﷺ کی ظاہری حیات کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تا قیامت آنے والے مسلمانوں کے لیے ثابت ہے۔ مثلاً اس مغالطہ دینے والے کے مسلمہ مفسر حافظ ابن کثیر نے اسی آیت کے تحت امام عتبی (استاد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ) سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک روز میں آپ ﷺ کے مزار کے پاس حاضر تھا۔ ایک اعرابی آیا، اس نے آپ ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کیا اور کہا: میں نے اللہ تعالیٰ کا مذکورہ فرمان پڑھا ہے تو میں آپ کے پاس گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے آپ ﷺ کو بارگاہ ایزدی میں شفیع بنانے کے لیے آیا ہوں۔ اس کے بعد اعرابی نے کچھ اشعار پڑھے (جو آج بھی مواجہہ شریف کے مبارک ستونوں پر کندہ ہیں) اور اس کے بعد لوٹ گیا اور مجھے نیند آ گئی۔ خواب میں حضور ﷺ نے مجھے فرمایا: عتبی! اس اعرابی سے ملو اور اسے یہ خوشخبری سناؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا ہے۔"

قابل توجہ امر یہ ہے کہ جب قرآن سے یہ بات ثابت ہے تو رسالت مآب ﷺ اس کے منافی کیسے منع فرما سکتے ہیں؟ اگر اس ممانعت کو درست سمجھا جائے تو پھر شریعت تضادات کا مجموعہ قرار پائے گی۔ رہی وہ روایت جس میں امام ابن تیمیہ نے مغالطہ پیدا کیا اس کا تعلق فقط مساجد کی طرف سفر ہے، بارگاہ نبوی ﷺ سے نہیں، کیونکہ مسند احمد میں رسالت مآب کا یہ فرمان موجود ہے کہ کسی نمازی کے لیے ان تین مساجد کے علاوہ سفر جائز نہیں مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی ﷺ۔

دوسری روایت میں ہے کہ کسی سوار کے لیے جائز نہیں کہ وہ ثواب کی خاطر ان

مساجد کے علاوہ کسی اور کا سفر کرے۔ مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی ﷺ۔

یہ روایات واضح کردیتی ہیں کہ فرمان نبوی ﷺ: لا تشد الرحال ای مسجد الاالی ثلاثة مساجد کجاوے نہ باندھیں کا تعلق فقط مساجد کی طرف سفر سے ہے، اس سے بارگاہ نبوی ﷺ کی حاضری کی ممانعت نہیں کیونکہ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ قبور کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں جب ہر قبر کی زیارت جائز ہے تو سید الانبیاء ﷺ کی حاضری تو بطریق اولیٰ جائز ہوگی۔

پھر یہ بات بھی سامنے رہنی چاہئے کہ شد الرحال والی روایت سے ہر سفر مراد لیا جائے تو پھر طلب علم تجارت وغیرہ کے لیے سفر بھی حرام ہوجائے گا۔

مغالطہ دینے والے کا حدیث ضعیف اور موضوع کو ایک ہی درجہ دینا لاعلمی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ موضوع روایت سے استدلال تو بلاشبہ جائز نہیں لیکن حدیث ضعیف کو تمام امت فضائل اعمال اور ترھیب وترغیب میں قبول کرتی ہے۔ جن احادیث کو اس خط میں من گھڑت قرار دیا گیا ہے وہ ضعیف تو ہوسکتی ہیں مگر من گھڑت نہیں۔ مثلاً ارشاد نبوی ﷺ ''جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگی'' اس کے ایک راوی موسیٰ بن ھلال العبدی پر اعتراض اٹھایا ہے۔ کاش انہوں نے امام سبکی کی ''شفا السقام'' کا مطالعہ کیا ہوتا جنہوں نے اس راوی کی امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے روایات اور توثیق نقل کی ہے اور امام سبکی لکھتے ہیں کہ پوری محدثین کی جماعت نے اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے ان سے روایت کی ہے اور توثیق کے لیے امام احمد کا روایت کرنا ہی کافی ہے جو صرف ثقہ سے ہی روایت لیتے ہیں امام ذہبی نے لکھا ہے کہ اگرچہ اس روایت کی اسناد کمزور ہیں لیکن وہ متعدد ہیں اور ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں۔ جس سے انہوں نے واضح کردیا کہ یہ روایت حسن کے درجے پر ہے۔ مغالطہ دینے والے ابو

حاتم کے حوالے سے راوی کو مجہول تسلیم کر لینا آئمہ محدثین کی رائے کے منافی ہے۔ انہیں علم ہونا چاہئے کہ دیگر اہل فن کے مجہول اور ابو حاتم کے مجہول قرار دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے کیونکہ امام ابو حاتم نے تو بخاری اور مسلم تک کے مسلمہ راویوں کو بھی مجہول قرار دیا ہے مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی اور قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ ابن یونس، حضرت عبداللہ غانم القاضی کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ثقہ اور نہایت مضبوط راوی ہیں لیکن ابو حاتم نے عدم معرفت کی وجہ سے انہیں بھی مجہول قرار دے دیا ہے۔ امام عبدالرحمٰن سخاوی کا کسی شخص کو مجہول کہنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس سے ایک ہی آدمی نے روایت کی ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ابو حاتم ایسے شخص کو مجہول کہہ دیتے ہیں جس سے متعدد ثقہ راویوں نے روایت کیا ہوتا ہے۔ یہ دو احادیث (اگرچہ ضعیف ہی کیوں نہ ہوں) تب بھی ان سے قرآن کی تفسیر بالاتفاق جائز ہے۔ گو یہ دونوں احادیث اس آیت مبارکہ کی تفسیر بن رہی ہیں کہ جو شخص آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا اسے بارگاہ الٰہی میں حضور ﷺ کی شفاعت اور سفارش نصیب ہوگی۔

دعا کے حوالے سے قبلہ کی شرط لگانا قرآن وسنت پر زیادتی ہے خانہ کعبہ قبلۂ نماز تو ہے قبلۂ دعا نہیں ہے۔ قبلۂ دعا آسمان ہے لہٰذا کسی بھی طرف منہ کر کے دعا کی جاسکتی ہے۔ خصوصاً جب انسان سرور عالم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو تو دعا کرتے ہوئے بھی اس طرح کھڑا ہو کہ دعا کرتے ہوئے بھی سرور عالم ﷺ کی طرف پشت نہ ہو کیونکہ آپ ﷺ کی بارگاہ کے آج بھی وہی آداب ہیں جو آپ ﷺ کی ظاہری حیات کے آداب تھے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول پیش نظر رہے جو انہوں نے بادشاہ وقت سے فرمایا تھا۔ بادشاہ نے ان سے پوچھا کہ میں بارگاہ نبوی میں حاضر ہو رہا ہوں۔ میں منہ قبلہ کی طرف

کروں یا حضور ﷺ کی طرف انہوں نے جواب دیا کہ میں تجھے حضور ﷺ کا مقام بتا دیتا ہوں اس کے بعد جس طرف چاہو منہ کرو۔ حضور ﷺ صرف تیرے لیے ہی وسیلہ نہیں بلکہ تیرے جدامجد حضرت آدم علیہ السلام کا بھی وسیلہ ہیں۔

آخر میں گزارش ہے کہ امت مسلمہ 14 صدیوں سے جن معمولات کو اختیار کئے ہوئے ہیں، ان مسلمہ معمولات کو انتشار اور اپنی اناؤں کی بھینٹ نہ چڑھایا جائے۔ امام ابن تیمیہ کے بعض ایسے تفردات ہیں جنہیں نہ تو امت نے پہلے قبول کیا تھا نہ بعد میں، بارگاہ نبوی ﷺ کی حاضری کا مسئلہ بھی انہیں تفردات میں سے ہے۔
(اب یہ بحث ختم کی جارہی ہے اس حوالے سے مزید کوئی تحریر شامل اشاعت نہیں ہوگی)

....

میرا خیال تھا کہ مفتی صاحب کے جواب کے بعد اس سلسلے میں کوئی اور مراسلہ شائع نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود میں نے مفتی صاحب کے جواب کا جواب لکھ لیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایڈیٹر نوائے وقت کے پاس جاؤں کہ 16 فروری 2008ء کو ڈاکٹر محمد سلیم الدین صاحب کا حسب ذیل مراسلہ بھی میرے مراسلہ کے جواب میں شائع کیا گیا۔

ایک حدیث پر علمی تحقیق کے جواب میں!

مکرمی! 23 جنوری 2008ء کے شمارہ "نوائے وقت" ایڈیٹر کی ڈاک میں محترم فضل الرحمان محمد صاحب کا مراسلہ "ایک حدیث پر علمی تحقیق" شائع ہوا ہے۔ مراسلہ نگار نے زیارت قبر نبی ﷺ اور شفاعت نبی ﷺ کے متعلق احادیث پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ انہی احادیث کے متعلق انہوں نے امام بخاری اور ابن تیمیہ کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں چند معروضات مندرجہ ذیل ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم شریف میں احادیث کی کل تعداد کم وبیش 10 ہزار ہے اگر تکرار کو نکال دیا جائے تو کل تعداد کم وبیش

پانچ ہزار رہ جاتی ہے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری چھ لاکھ احادیث میں سے ترتیب دی ان سات لاکھ احادیث کی سماعت کے لیے انہوں نے بے شمار شیوخ سے اکتساب کیا اور دور دراز کا سفر بھی کیا۔ اگر بخاری شریف کے علاوہ تمام احادیث ضعیف اور غیر مرفوع ہیں تو سوال یہ ہے کہ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث جمع کیوں کیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک انسان ضعیف اور موضوع احادیث کے لیے اتنی تگ و دو کرے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم نے اپنے اپنے مسلک اور مشرب کے مطابق اپنے مجموعوں سے احادیث لے لی ہیں اب یہ ضروری نہیں کہ ایک حدیث بخاری یا مسلم میں نہ ہو تو اس کی صحت کے بارے میں شکوک پیدا کیے جائیں۔ پھر یہ اصول کہاں سے آیا ہے کہ صرف بخاری اور مسلم کی احادیث ہی صحیح ہیں کیا نبی کریم ﷺ سے صرف پانچ ہزار احادیث ہی مروی ہیں، اصل بات یہ ہے کہ اگر ایک حدیث اپنے متن، سند اور روائت کے اعتبار سے صحیح ہے تو وہ صحیح ہے چاہے حدیث کی جس کتاب میں بھی محدثین نے اپنے ذوق اور مشرب کے مطابق کتب حدیث میں ابواب قائم کر کے متعلقہ احادیث لکھ دیں۔ ایک مخصوص مکتب فکر مناقب، فضائل و شمائل نبوی ﷺ سے متعلقہ احادیث کو ضعیف اور موضوع قرار دے کر شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے۔ آج تک کسی کی ہمت تو نہیں ہو سکی ہے کہ ان احادیث کو کتب سے نکال دیا جائے۔ آپ کے ذکر کریم کو رب کریم نے خود بلند فرمایا۔ قرآن کریم آپ کا مدحت سرا ہے۔ ساری دنیا کا خالق و مالک اور اس کے فرشتے آپ پر درود بھیجتے ہیں۔ تمام مومنین و مسلمین ہمہ وقت درود و سلام کے نذرانے آپ کی بارگاہ اقدس میں پیش کرتے ہیں۔ مسجد نبوی ﷺ کی ساری فضیلت اور بزرگی و احترام آنحضور ﷺ سے تعلق کی وجہ ہے۔ زیارت قبور کی اجازت نبی کریم ﷺ نے مرحمت فرمائی۔ سکونت مدینہ اور فضائل مدینہ کے بارے میں مشکوۃ شریف میں احادیث

موجود ہیں۔ ان احادیث کو امام ترمذی اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں مدینہ منورہ کی بالقصد اور عمداً زیارت کے لیے بھی احادیث موجود ہیں اگر کسی کا دل روضہ اقدس کی زیارت کے لیے نہیں کرتا تو نہ کرے تاہم ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کی بھی دلی تمنا اور خواہش ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں کم از کم ایک بار آپ ﷺ کے در اقدس پر حاضر ہو کے درود و سلام کے نذرانے پیش کر سکے۔ (ڈاکٹر محمد سلیم الدین)

....

چنانچہ 19 فروری 2008ء منگل کے دن میں جناب مجید نظامی صاحب کے پاس گیا اور ان کے دفتر میں تینوں مراسلوں کے تراشے ان کے سامنے رکھ دیئے۔ پھر اپنا لکھا ہوا جواب بھی پیش کر دیا جس کو انہوں نے بڑے غور سے پڑھا۔ میرے ان سے بڑے اچھے تعلقات ہیں ہم ایک دوسرے کی عزت و احترام کا خوب خیال رکھتے ہیں۔ اسی عزت و احترام کے حوالے سے انہوں نے جس انداز میں بحث کو آگے نہ بڑھانے کی درخواست کی، اس نے مجھے حیران و پریشان کر دیا کیونکہ وہ پاکستان کی بہت ہی اہم شخصیت ہیں۔ بڑے بڑے آمروں سے وہ ٹکر لیتے رہے ہیں، میں تو اللہ کے دین کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔

انہوں نے ریٹائرڈ جسٹس آفتاب فرخ اور ڈاکٹر ایم اے صوفی کی موجودگی میں دو مرتبہ ہاتھ جوڑ کر کہا کہ بحث کو آگے نہ بڑھایا جائے۔ مجھے نہیں معلوم انہوں نے ایسا کیوں کیا، ان کی کیا مجبوری تھی لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ لاکھوں مسلمان حق سے آگاہ ہونے سے محروم ہو گئے۔

شائع نہ ہونے والا میرا جواب

چونکہ میرا جواب ایک مراسلہ کی صورت میں چھپنا تھا لٰہذا ممکنہ حد تک اختصار سے

مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ مراسلہ حسب ذیل ہے:

ایک حدیث پر علمی تحقیق

23 جنوری 2008ء کے نوائے وقت میں چھپنے والے انتہائی خلوص اور نیک جذبے سے لکھے گئے میرے مراسلہ کے جواب میں تین دن بعد مفتی محمد خان قادری صاحب نے اس کو مغالطہ قرار دے کر ایسا رنگ دینے کی کوشش کی جو علمی افہام وتفہیم کی بجائے ایک عامیانہ بحث ومباحثہ کی صورت تو ہوسکتی ہے لیکن علمی تحقیق سے اس کا تعلق کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر محمد سلیم الدین نے اس رنگ کو مزید گہرا کردیا ہے۔

مسئلہ تو مروی دو حدیثوں کی سند کا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

1- جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگی۔

2- جس نے میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی اس نے گویا میری زندگی میں زیارت کی۔

چونکہ ائمہ علوم حدیث نے مذکورہ حدیثوں کی صحت میں کلام کیا ہے اس لیے مدینہ طیبہ جانے والوں کے لیے میرا مخلصانہ مشورہ تھا کہ وہ نیت مسجد نبوی کریں اور وہاں جاکر آپ کی قبر مبارک کے پاس درود وسلام کہنے کے بعد بیت اللہ کی طرف چہرہ کرکے اللہ سے دعا کریں۔

محترم مفتی صاحب ائمہ حدیث کی طرف سے عائد ہونے والے اعتراضات اگر دور کردیتے اور ان کا صحیح مرفوع ہونا ثابت کردیتے تو ان کا بہت بڑا کارنامہ ہوتا اور تمام اہل ایمان پر اس کے مطابق عمل کرنا فرض ہوجاتا اور ان کو فضائل اعمال کا سہارا نہ لینا پڑتا۔

فتاوی شامی (ج 1 ص 62) میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے

کہ انہوں نے فرمایا: اِذَا صَحَّ الْحَدِیْثُ فَھُوَ مَذْھَبِی۔ جب حدیث صحیح ہوگی تو وہی میرا مذہب ہوگا۔

ایک ایسا ہی قول امام الشعرانی نے المیزان الکبریٰ (ج 1 ص60) میں امام الحاکم رحمۃ اللہ علیہ اور امام البیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے امام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں نقل کیا ہے۔ ابن حزم کا کہنا ہے یہ اصول تمام ائمہ کرام کے نزدیک مسلمہ ہے۔ مفتی صاحب اپنے تمام تبحر العلم کے باوجود مذکورہ حدیثوں کے ضعف کو دور نہ کر سکے بلکہ امام ذہبی کا ایسا حوالہ دے دیا کہ جس سے اسناد کی کمزوری مزید ثابت ہوگئی۔ ان کا کہنا ہے: امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ روایت کی اسناد اگرچہ کمزور ہیں لیکن متعدد ہیں اور ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں۔ ساتھ ہی اپنی طرف سے یہ وضاحت شامل کردی کہ جس سے انہوں نے واضح کردیا کہ یہ روایت حسن کے درجے پر ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ چند غیر اعتباری افراد مفتی صاحب کی طرف وہ بات منسوب کردیں جو انہوں نے نہ کہی ہو لیکن کمزوری کے باوجود متعدد ہونے کی بنا پر قابل قبول ہوجائے۔ بات قبر مبارک کی زیارت کی نہیں، وہ تو یقیناً مستحب ہے۔ بات تو نیت کی ہے حالانکہ قبر مبارک کی زیارت کی نیت کرنے والے بھی مسجد نبوی میں داخل ہوکر قبر مبارک تک پہنچتے ہیں تو کیوں نہ صحیح حدیث کے مطابق نیت مسجد نبوی کرکے درود وسلام سید الانبیاء پر پیش کیا جائے۔

مفتی صاحب نے سورۃ النساء کی آیت 64 کے ایک حصے سے جس معنی و مفہوم کو سمجھنے میں امت کے تمام محدثین، فقہاء، مفسرین، صوفیہ اور اہل علم کا ذکر کیا ہے وہ بھی ان کا اپنا دعویٰ ہے جو حقیقت کے خلاف ہے۔ سیاق وسباق اور شان نزول کو نظر انداز کرتے ہوئے ترجمہ بھی اپنی سوچ کے مطابق کیا ہے۔ پوری آیت یوں ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ وَ لَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا

اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَ اسۡتَغۡفَرَ لَہُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا (۶۴)﴾

اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر یہ کہ اس کی اطاعت اللہ کے حکم سے کی جائے۔ کاش جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، تو وہ آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے بخشش طلب کرتے اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو اللہ تعالیٰ کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور بڑا ہی رحم کرنے والا پاتے۔

اس آیت مبارکہ سے پہلے اور اس میں اور اس کے بعد والی آیت میں منافقوں کا ذکر ہوا ہے جو اپنا جھگڑا رسول اللہ ﷺ کے پاس لانے کی بجائے کعب بن اشرف یہودی کے پاس لے گئے چنانچہ تفسیر الطبری، تفسیر کبیر، تفسیر الخازن، تفسیر الکشاف، تفسیر النسفی، تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی میں وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ کا معنی بِالتحاکُمِ اِلَی الطَّاغوت یعنی ''طاغوت سے فیصلہ کرانا'' کیا گیا ہے۔

آیت نمبر 65 میں ارشاد ہوتا ہے: قسم ہے آپ کے رب کی، وہ ہرگز ایمان والے نہیں ہوسکتے جب تک آپ کو اس میں فیصل نہ مان لیں کہ جو ان کے درمیان جھگڑا ہوا ہو، پھر آپ جو فیصلہ کردیں تو اس کی وجہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور دل و جان سے اس کو قبول کرلیں۔

اگر کسی مفسر نے اس کو عام بھی رکھا ہے تو چند علماء وفقہاء کا اجماع بالکل بے حقیقت ہے امت کے ایک گروہ کی تفسیر پوری امت کی تفسیر نہیں ہوسکتی۔

لہٰذا منافقوں کے بارے میں نازل ہونے والی ایات کے ایک حصے سے سید الانبیاء کی قبر مبارک کی زیارت کا شوق ورغبت کا ثبوت دینا کیسے مناسب ہوسکتا ہے۔

مفتی صاحب نے ابن کثیر کے حوالے سے ایک اعرابی کا واقعہ بھی نقل کیا ہے۔

امید ہے وہ اس حقیقت سے ضرور آگاہ ہوں گے کہ ائمہ حدیث خوابوں اور حکایتوں کی بجائے احادیث بیان کرنے والے راویوں کو جرح و تعدیل کے قائم کردہ اصولوں کے مطابق پرکھتے ہیں۔

معلوم نہیں، مفتی صاحب کو یہ وہم کیوں ہوگیا کہ مسجد نبوی کی نیت سے مدینہ طیبہ جانے والے سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس جاکر درود و سلام پیش نہیں کرتے یا ان کے دلوں میں آپ کی محبت اور آپ کی قبر مبارک پر حاضری کی چاہت نہیں ہوتی۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ بھی جب مدینہ طیبہ کے قریب پہنچتے ہیں تو ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں اور مسجد کے مینار جیسے ہی نظر آتے ہیں ان کی آنکھوں سے محبت و عقیدت کے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ مدینہ طیبہ میں اپنی رہائش گاہ پر پہنچتے ہی پاک صاف ہوکر مسجد نبوی میں مسنون طریقہ سے داخل ہوکر دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کے بعد سیدھے رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس مؤدب کھڑے ہوجاتے ہیں۔ درود و سلام کے کلمات ان کی زبانوں پر جاری ہوجاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر الصدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو سلام کہتے ہوئے ذرا ہٹ کر کعبہ کی طرف چہرہ کرکے سید الانبیاء ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ سے آپ کو مقام محمود اور مقام وسیلہ دیئے جانے کی دعا کرتے ہیں اور اپنے لیے بھی جو مانگنا ہوتا ہے خوب مانگتے ہیں۔

جب تک مدینہ میں قیام ہوتا ہے اس میں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ چالیس نمازیں باجماعت پڑھیں کیونکہ مسند احمد (ج 3 ص 155) میں مروی ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے میری مسجد میں چالیس نمازیں پڑھیں جس میں سے ایک بھی قضا نہ ہوئی تو اس کے لیے جہنم کی آگ سے برأت اور عذاب سے نجات اور نفاق سے بری ہونا لکھ لیا جاتا ہے۔'' (ایضا الطبرانی فی الاوسط، مجمع الزوائد ج3 ص8)

فرض نمازوں کے علاوہ ریاض الجنہ میں نوافل اور قرآن کی تلاوت کرنے کے ساتھ سید الانبیاء ﷺ پر کثرت سے درود و سلام بھیجنے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ مدینہ سے واپس ہونے سے پہلے پھر قبر مبارک پر الوداعی سلام کہتے ہوئے نمناک آنکھوں کے ساتھ مسجد نبوی سے نکلتے ہیں۔

مفتی صاحب کا فرمان تھا کہ دعا کا قبلہ بیت اللہ نہیں بلکہ آسمان ہے۔ اس سلسلے میں صحیح بخاری: کتاب الحج: باب اذا رمی الجمرتین یقوم مستقبل القبلة ویسهل، باب رفع الیدین عند الجمرة الدنیا والوسطی اور باب الدعا عند الجمرتین کے تحت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے۔ وہ جمرة الدنیا کو سات کنکریاں مارتے ہوئے ہر کنکری کے بعد اللہ اکبر کہتے پھر اونچی سے نیچی جگہ آ کر قبلہ رو ہو کر لمبے قیام میں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا کرتے۔ پھر جمرة الوسطی کو کنکریاں مارنے کے بعد بائیں جانب ہو کر پہلے کی طرح دعا کرتے اور بطن وادی میں جمرة ذات العقبة کو کنکریاں مار کر وہاں کھڑے نہ ہوتے بلکہ واپس لوٹ جاتے اور کہتے: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا۔

تیسری روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے کے بغیر رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہے: مزید دو فیصلہ کن حوالے بھی پیش خدمت ہیں۔

جامع الترمذی (ج 2 ابواب التفسیر: سورة الانفال ص 156) جنگ بدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی دعا کے بارے میں مروی ہے:

فمازال یهتف بربه مَادّاً یَدَیْهِ مستقبل القبلة حتیٰ سقط ردائه من منكبيه۔

آپ قبلہ کی طرف رخ کئے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے اپنے رب سے دعا کرتے

رہے۔ یہاں تک کہ آپ کی چادر مبارک آپ کے کندھوں سے گر گئی۔

الادب المفرد (ص 214) میں امام بخاری نے ابوھریرہ سے روایت نقل ہے کہ طفیل دوسی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

اللہ کے رسول! دوس نے نافرمانی کرتے ہوئے انکار کیا پس آپ ان کے لیے بددعا کردیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قبلہ رو ہو کر ہاتھوں کو اٹھایا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ آپ دوس کے لیے بددعا کرنے لگے ہیں۔ لیکن آپ نے دعا کی: اَللّٰهُمَّ اَهْدِ دَوْسًا وَائْتِ بِهِمْ۔ اے اللہ! دوس کو ہدایت دے اور اس کو یہاں لے آ۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی نیل الاوطار (ج 5 ص 101 تا 104) میں مذکورہ روایات کے ضعیف اور موضوع ہونے کی بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین سلام کرتے ہوئے چہروں کو قبر مبارک کی طرف رکھتے لیکن دعا کے لیے قبلہ رو ہو جاتے۔ قبر مبارک کی طرف رخ نہیں کرتے تھے۔ ائمہ کرام کی اکثریت کا عمل بھی یہی تھا۔ جو حکایت امام مالک رحمہ اللہ کی طرف منسوب کی گئی ہے، ان کا اپنا عمل اس کے خلاف تھا لہٰذا وہ قابل قبول کیسے ہوگی۔

مفتی صاحب نے علامہ تقی الدین السبکی کی جس کتاب شفاء السقام کا حوالہ دیا ہے۔ ان کو شاید معلوم نہیں کہ ان کی دس ابواب پر مشتمل کتاب میں مذکورہ ان تمام روایات کا ضعف ان کے ہمعصر علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عبدالہادی الحنبلی المقدسی (المتوفی 744ھ) نے اپنی کتاب الصارم المنکی میں ائمہ حدیث کے حوالوں سے خوب واضح کیا ہے۔ خیال رہے: سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے بارے میں علامہ السبکی نے جن روایات کے ضعف کو دور کرنے کی کوشش کی تھی، اگر ان میں سے ایک بھی صحیح مرفوع ہوتی تو مسند احمد اور صحاح ستہ میں ضرور منقول ہوتی

کیونکہ صحیح حدیث کے مطابق عمل کرنا تو ہر مسلمان کا فرض ہے۔

جس ہستی اقدس کو اللہ تعالیٰ نے اس شان و عزت سے نوازا جو اس کی تمام مخلوق میں سے کسی کو نصیب نہ ہوئی تو ان کی طرف منسوب کی جانے والی حدیث صحیح اور مرفوع ہونی چاہئے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ہم کو آپ کی شفاعت نصیب فرمائے۔

وما علینا الا البلاغ

مسئلہ کی مزید وضاحت

ڈاکٹر محمد سلیم الدین کے مراسلہ میں بھی اگرچہ مسلکی گروہی تعصب کا رنگ غالب ہے لیکن انہوں نے ایک بڑی اچھی اصولی بنیادی بات کی ہے کہ اگر ایک حدیث اپنے متن سند اور روایت کے اعتبار سے صحیح ہو تو وہ صحیح ہی ہوتی ہے لہٰذا اسی اصول کے مطابق دو مذکورہ حدیثوں کو صحیح تسلیم نہیں کیا گیا کیونکہ ان کو روایت کرنے والے بعض راویوں کا ثقہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ان شاء اللہ اس پر تفصیل سے بحث آگے آئے گی۔

رہی بات مفتی صاحب کی تو انہوں نے علامہ تقی الدین السبکی کی کتاب شفاء السقام میں کی گئی بحث کو فخریہ انداز میں اپنا رنگ چڑھا کر نوائے وقت میں شائع کرایا تھا لہٰذا مناسب ہوگا کہ اصل کتاب کے حوالے سے مسئلہ کی حقیقت کو واضح کیا جائے۔

۳

شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام

علامہ تقی الدین السبکی نے یہ کتاب امام ابن تیمیہ کے رد میں لکھی تھی۔ علامہ موصوف 783ھ میں پیدا ہوئے جبکہ امام ابن تیمیہ کی پیدائش 761ھ میں ہوئی۔ یوں وہ امام ابن تیمیہ سے عمر میں 22 سال چھوٹے تھے۔ ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی امام ابن تیمیہ اس زمانے کے تمام علوم کے حصول اور اپنے باپ کی وفات کے بعد ان کی جگہ سترہ سال کی عمر میں درس و تدریس اور فتاویٰ نویسی میں مشغول و مصروف ہو گئے اور انہوں نے علامہ سبکی کے پیدا ہونے سے پہلے ہی علمی میدان میں اپنا مقام بنالیا تھا اور ان کے فارغ التحصیل ہونے تک لسانی اور سیفی جہاد میں اعلیٰ کردار ادا کرنے کے ساتھ کئی کتابوں کے مصنف و مؤلف بن چکے تھے۔ ان کی شہرت اور ناموری اپنے عروج پر تھی۔ اس وقت کے مشہور و معروف علماء ان سے مناظرہ کرنے سے کتراتے تھے۔ سوال کرنے یا اعتراض کرنے والوں کو خوب جواب دیتے تھے۔ قرآن وسنت کی تعلیم کو رائج کرنے میں کوشاں رہتے جس کی وجہ سے ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

البدایۃ و النہایہ (ص 106) کی روایت کے مطابق ابوالحسن السبکی 723ھ میں اپنا پہلا اہم درس قاضی جمال الدین الزرعی کی جگہ منصوریہ قاہرہ میں دیا اور امام ابن تیمیہ کی وفات کے گیارہ سال بعد ان کو دمشق کا قاضی القضاۃ بنایا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے دمشق میں اپنے قیام کے دوران میں لکھی کیونکہ اگر امام ابن تیمیہ کی زندگی میں یہ کتاب لکھی جاتی تو وہ اپنی عادت اور معمول کے مطابق اس

کا جواب ضرور تحریر کرتے جیسا کہ انہوں نے مالکی قاضی کا جواب قید خانے میں ہی لکھا اور وہ عوام میں پہنچ کران کی کتابوں، تحریروں اور قلم ودوات کی ضبطگی کا سبب بنا تھا۔

امام ابن تیمیہ کے شاگرد حافظ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عبدالہادی (المتوفی 744ھ) کو جب وہ کتاب ملی تو انہوں نے فوراً اس کا جواب الصارم المنکی فی الرد علی السبکی کے عنوان سے لکھ دیا۔ حافظ ابن عبدالہادی نے اپنی اس کتاب کے آغاز میں تحریر کیا ہے کہ مجھے شافعی قاضیوں میں سے ایک قاضی کی کتاب کے بارے میں علم ہوا جو اس نے شیخ الاسلام تقی الدین ابو العباس احمد بن تیمیہ کے مسئلہ قبور کی طرف کجاوے باندھنے یعنی سفر کرنے کے رد میں لکھی اور اس نے اس کا نام شنُّ الغارة علیٰ مَنْ اَنکر سفر الزیارة رکھا۔ یعنی جس نے زیارت کے سفر کا انکار کیا اس پر چاروں طرف سے حملہ، پھر اس نے اس کا نام شفاء السقام فی زیارة خیر الانام رکھ دیا۔ اَلسَّقَام کی سین کو اگر زبر سے پڑھا جائے تو یہ باب سَمِعَ اور کَرُمَ سے مصدر ہوگا اور اس کا معنی بیمار ہونا ہوگا۔ بیماری کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اگر سین کو زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو پھر صفت سَقِیْم کی جمع ہوگا۔ عنوان کا ترجمہ ہے اللہ کی مخلوق میں سب سے بہتر کی زیارت میں بیماروں یا بیماری کی شفاء ہے۔ اس کتاب کے مترجم نے اس کا معنی قلبی امراض کیا ہے۔

قاضی صاحب کی طرف منسوب کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کتاب لکھی گئی اس وقت لکھنے والے قاضی تھے۔ لیکن آگے جا کر امام ابن تیمیہ کے بارے میں جھوٹی بات منسوب کرنے کے سلسلے میں حافظ ابن عبدالہادی کا کہنا ہے کہ ان کو ایک قابل اعتماد شخص نے بتایا کہ یہ کتاب قاضی صاحب نے قاضی بننے سے بہت پہلے مصر میں لکھی تھی۔ تا کہ اس قاضی کے قریب ہو جائیں جس نے جھوٹا الزام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر لگایا تھا۔ یہ اشارہ اس جھوٹ کی طرف ہے جس کی بنا پر ان کو قید کیا گیا تھا۔ یعنی نبی ﷺ اور تمام

انبیاء علیہم السلام کی قبروں کی زیارت قطعی طور پر معصیت ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے قطعاً یہ نہیں کہا تھا جبکہ شافعی قاضی نے اپنی طرف سے الزام لگا دیا تھا۔

اس کی تصدیق میں البدایۃ والنہایۃ کے مصنف کی گواہی (ج14، ص 124) موجود ہے، جو خود بھی شافعی تھے۔

علامہ السبکی نے اپنی کتاب میں دس حسب ذیل ابواب میں اپنی طویل بحث کو پھیلایا ہے جبکہ مسئلہ قبروں کی زیارت کی نفی نہیں بلکہ صحیح حدیث کے مطابق قبروں کی طرف سفر کرنے کا تھا۔ جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھی، اس کی وہ نفی کیسے کر سکتے تھے اور امام ابن تیمیہ بھی علمائے امت کی طرح اس کو مستحب کہتے تھے۔ لہٰذا مسئلے کو سلجھانے کی بجائے الجھایا ہے۔

پہلا باب: ان احادیث کے بارے میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔

دوسرا باب: ان احادیث مبارکہ کے بیان میں ہے جو زیارت قبرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر دلالت تو کرتی ہیں مگر ان میں لفظ زیارت مذکور نہیں۔

تیسرا باب: ان احادیث مبارکہ کے بارے میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کے متعلق ہیں۔

چوتھا باب: علمائے کرام کے ان اقوال کے بارے میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کے مستحب ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

پانچواں باب: اس بحث کے بارے میں ہے کہ قبر مبارک کی زیارت باعث قربت ہے۔

چھٹا باب: قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کرنا بھی قربت کا سبب ہے۔

ساتواں باب: مخالفت کرنے والے کے شبہات کا ازالہ اور اس کے کلمات کا تتبع۔

آٹھواں باب: توسل اور استغاثہ کے متعلق۔

نواں باب: انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

دسواں باب: رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے بارے میں۔

کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

علامہ السبکی کا اپنا بیان ہے: پہلے میں نے اس کا نام شن الغارة علی من انکر سفر الزیارة رکھا۔ پھر اس کا مذکورہ نام رکھ دیا۔ میں نے اس کتاب میں ان لوگوں کی تردید کی ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کے متعلق تمام احادیث کو موضوع قرار دیتے ہوئے زیارت کے لیے سفر کو بدعت اور ناجائز کہا ہے۔ یہ اس طرح کا فساد انگیز قول ہے کہ علمائے کرام کو اس کی تردید کی ضرورت ہی نہیں لیکن میں نے اس کتاب میں مستقلاً زیارت نبی ﷺ اور اس کے جملہ امور کو جمع کر دیا ہے۔

کتاب کے مقدمہ کا تجزیہ

حضرت علامہ السبکی نے مذکورہ کتاب لکھنے کا جو مقصد بیان کیا ہے وہ ان روایات کا دفاع ہے جن کے بارے میں ائمہ حدیث نے کلام کیا ہے کہ وہ تمام احادیث موضوع یعنی من گھڑت نہیں ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ضعیف روایات بھی حسن اور صحیح کے درجے میں ہوتی ہیں، جیسا کہ 250 صفحات میں پھیلی ہوئی ان کی بحث سے ثابت ہوتا ہے اور انہوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زیارت کے لیے سفر بالقصد بدعت و ناجائز نہیں۔ انہوں نے ایسا کہنے والوں کے قول کو فساد انگیز قرار دیا ہے۔ دراصل ان کی یہ کتاب امام ابن تیمیہ کے اس فتویٰ کا رد ہے جو انہوں نے الباب السابع (عربی کتاب

ص 117، ترجمہ ص 153) میں نقل کیا ہے۔

الفصل الثانی (عربی ص 138)، (اردو ص 175) میں علامہ موصوف کا کہنا ہے۔

امام ابن تیمیہ کے کلمات کی تلاش کے سلسلہ میں پہلے بات ہو چکی ہے کہ میں نے ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے فتویٰ سے نقل کیا ہے۔ ان سے زیارت بالقصد کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا تھا بلکہ ضمناً مزارات و مشاہد کے متعلق اس کا ذکر ہوا تھا۔ جو نسخہ ان کے فتویٰ کا حکومت کے پاس پہنچا، اس کے اوپر والے حصے پر قاضی القضاۃ جمال الدین کا یہ نوٹ تھا: میں نے مکتوب سوال کے جواب کا مقابلہ جب تقی الدین ابن تیمیہ کے ورقہ سے کیا تو میں نے اس کو صحیح پایا۔ سوائے ان الفاظ کے کہ جن پر سرخ نشان لگے ہوئے ہیں۔ اس کے لکھے ہوئے ورقہ کے کئی مقامات کو معیار سے گرے ہوئے پایا۔ جو کسی آلہ سے نہیں بلکہ اس کی سختی اور درشتی کا نتیجہ ہیں۔ اس نے نبی ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام کی قبور کی زیارت کو قطعی طور پر بالاجماع معصیت قرار دیا ہے۔ اس نسخہ کو محمد بن عبدالرحمٰن القزوینی الشافعی نے لکھا اور اب اس پر سیاہ نشان لگا دیئے ہیں۔

علامہ السبکی نے اپنے اس بیان سے ثابت کر دیا کہ امام ابن تیمیہ کے حاسدوں اور دشمنوں نے حیلہ سے اپنے مطلب کا فتویٰ حاصل کر کے اس پر شافعی قاضی نے ایسا حاشیہ چڑھایا جو دنیا میں امام ابن تیمیہ کی آخری ابتلا کا سبب بنا۔ ساتویں باب کی دوسری فصل کے اس حصہ کا ترجمہ اردو میں شائع ہونے والی کتاب میں موجود نہیں۔

علامہ صاحب نے پھر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے کیے گئے سوال کو یوں نقل کیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام! اللہ ان سے مسلمانوں کو نفع پہنچائے ایک شخص نے انبیاءؑ میں سے کسی نبی کی قبر مثل ہمارے نبی ﷺ اور ان کے علاوہ کسی اور کی قبر کی زیارت کی نذر مانی۔ کیا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس سفر میں نماز قصر

کرے۔کیا یہ زیارت شرعی ہوگی یا نہیں۔

نبی کریم ﷺ سے روایت ہے: جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی، اس نے مجھ سے جفا کی اور جس نے میرے مرنے کے بعد میری زیارت کی، وہ اس شخص کی طرح ہوگا کہ جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کجاوے نہ باندھے جائیں مگر مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ اور میری اس مسجد کے لیے، فتویٰ دیں آپ کو اللہ اجر دے گا۔

سوال کا تجزیہ

علامہ صاحب نے خود ہی فرما دیا کہ سوال براہ راست نہ تھا۔ اگر سیدھا ہی سوال کرتے یا کیا جاتا تو امام صاحب نے جواب اسی طرح دینا تھا کہ جس طرح انہوں نے کئی مرتبہ پہلے اسی طرح کے سوالوں کا دیا تھا۔

سوال میں پہلی بات زیارتِ قبور کی نیت سے کیئے جانے والے سفر میں نماز قصر کا مسئلہ ہے۔

دوسری بات: ایسی زیارت شرعی یا غیر شرعی ہوگی۔

تیسری بات: تین احادیث کا حوالہ ہے جن میں سے پہلی دو کے بارے میں ائمہ حدیث نے کلام کیا ہے اور تیسری صحیح مرفوع متصل ہے۔

سوال میں اصل مسئلہ دو حدیثوں کا ہی ہے جن کو صحیح ثابت کرنے کے لیے علامہ موصوف نے 250 صفحات پر مشتمل کتاب رقم کر دی۔ حالانکہ امام ابن تیمہ کا جواب شفا السقام کے عربی اور اردو کے تقریباً پانچ صفحوں میں منقول ہے۔ جس کا جواب الجواب علامہ السبکی نے 16 صفحات میں دیا اور اس کا ترجمہ بھی تقریباً 16 صفحات میں ہوا ہے۔

کتاب کے باقی حصوں میں جو کچھ بیان ہوا وہ زیادہ تر تأویلات کا مجموعہ ہے اور ضعیف و موضوع احادیث کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش ہے جس میں دھکا شاہی اور عہدہ قضاء کا عنصر غالب ہے اور تضادات کا جو مظاہرہ اس کتاب میں ہوا ہے شاید ہی کسی اہل علم کی علمی کتاب میں ہوا ہو۔

علامہ ابوالحسن السبکی ضعیف روایات کے ضعف کا اقرار بھی کرتے ہیں اور ان کے صحیح ہونے پر مصر بھی رہتے ہیں۔ مخالف کی تائید اور تردید بھی کرتے ہیں۔ مسائل کے بارے میں ہر اہل علم کو حق ہے کہ وہ اپنی تحقیق ایسے انداز میں کرے۔ جیسے وہ مناسب سمجھتا ہو۔ لیکن تحقیق کرتے ہوئے مسئلے کو آسان الفاظ میں واضح کرنا مقصود ہونا چاہئے۔ مسلکی مجبوری یا ذاتی مفادات کو قرآن وحدیث پر راجح کرنے کی کوشش نہیں ہونی چاہئے۔

میری اس کتاب کے دسویں باب میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے کئے گئے سوال کا جواب مذکور ہے۔ اس لیے طوالت سے بچنے کے لیے علامہ السبکی نے جو رد فرمایا اس کا ذکر کرنا مناسب ہوگا چونکہ اصل مسئلہ زیارت اور سفر زیارت ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں منقول احادیث کے بارے میں ائمہ حدیث نے جو کہا ہے اس کو بیان کرنا ضروری ہے۔

۴

شفاء السقام کا پہلا باب

پہلی حدیث

مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْنِي فَقَدْ جَفَانِي

''جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی اس نے جفا کی۔''

علامہ ابو الحسن السبکی نے اس موضوع حدیث کو اپنی کتاب کے پہلے باب میں پانچویں اور چودھویں حدیث کے طور پر نقل کر کے تسلیم کیا ہے کہ وہ منکر ہے اور امام ابن الجوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔ ان کے مطابق یہ امام ابن الجوزی کی زیادتی تھی۔ (الموضوعات ج2ص218)

ائمہ حدیث کے نزدیک منکر حدیث کی تعریف یہ ہے کہ ضعیف راوی کسی ثقہ راوی کی مخالفت کرتے ہوئے حدیث بیان کرے۔

علامہ السبکی نے حدیث کے واضع نعمان بن شبل کی ثقاہت کو ثابت کرنے کے لیے عمران بن موسیٰ کی روایت کا حوالہ دیا ہے۔ جس سے بیان کرنے والے صالح بن احمد بن ابی مقاتل القیراطی کے بارے میں امام الدارقطنی کی کتاب الضعفاء والمتروکین (ص 107 رقم 293) کے حاشیہ میں ابن حبان سے منقول ہے کہ یہ حدیث چرا کر اس کی عبارت کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ کسی حال میں بھی اس کی بیان کردہ حدیث کو دلیل بنانا جائز نہیں۔ الدارقطنی نے اس کو متروک، کذاب اور دجال کہا۔ برقانی کا کہنا ہے: وہ حدیثوں کو لیجانے یعنی چرانے والا ہے۔

امام ابن الجوزی کا سن وفات 597ھ ہے وہ 510ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان سے پہلے تذکرۃ الموضوعات کے مؤلف الحافظ ابو الفضل محمد بن طاہر بن احمد المقدسی (پیدائش 448ھ- وفات 507ھ) نے مذکورہ حدیث کو (ص 116- رقم 790) نقل کر کے لکھا ہے:

فیه النعمان بن شبل، يَأتِي عَنِ الثِّقَاتِ بِمَا لَيسَ مِنُ حَدِيثِهِمُ

اس میں راوی نعمان بن شبل ہے جو ثقہ راویوں سے وہ احادیث بیان کرتا ہے جو ان کی بیان کردہ نہیں ہوتیں۔

آخر میں علامہ تقی الدین ابو الحسن السبکی کے بیٹے علامہ تاج الدین ابو النصر السبکی کے استاد مکرم و محترم امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عثمان الذہبی (المتوفی 748ھ) کا فیصلہ ان کی کتاب میزان الاعتدال (ج4 ص 265: رقم 9095) میں مذکورہ حدیث کے بارے میں یوں ہے: هٰذَا مَوُضُوعٌ "یہ موضوع (من گھڑت) روایت ہے۔"

مترجم کا کمال

مترجم نے علامہ السبکی کی کتاب "شفاء السقام" کا نہ صرف ترجمہ کیا ہے بلکہ ترجمہ کرتے ہوئے ان کی معاونت بھی خوب کی ہے۔ جہاں عبارت بڑھانے یا مزیّن کرنے یا محذوف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی دلیری سے یہ فریضہ ادا کر دیا اور عبارتوں کو عنوانات سے بھی سجایا ہے۔

علامہ السبکی نے تو اپنی بات ابن عدی سے شروع کی لیکن مترجم نے ابن حجر مکی اور النبهانی کے حوالے لگا کر لکھ دیا۔ اس کے علاوہ اس حدیث کو ابن عدی نے الکامل میں بھی روایت کیا ہے۔

مترجم نے جن دو بزرگوں کے حوالے دیئے ہیں ان میں سے ابن حجر مکی (المتوفی 973ھ) سے مراد محدث حافظ ابن حجر عسقلانی نہیں ہیں بلکہ مکہ میں مقیم رہنے والے اور امام ابن تیمیہ کی مخالفت کرنے والے ایک فقیہ تھے۔

دوسرے بزرگ قاضی ابوالمحاسن یوسف بن اسمٰعیل النبہانی کی جس کتاب شواھد الحق فی الاستغاثة بسید الحق کا حوالہ دیا ہے اس کا جواب غاية الامانی فی الرد علی النبهانی کی صورت میں علامہ ابوالمعالی محمود شکری الآلوسی نے دے دیا تھا۔ اس کا تین جلدوں میں انگریزی ترجمہ کرنے کی سعادت ڈاکٹر رانا ایم - این - احسان الٰہی کو حاصل ہوئی اور مولانا حافظ عبدالغفور جہلمی نے اس کو چھپوا کر دینی کتابوں کے انگریزی تراجم میں مفید اضافہ کر دیا تھا۔

دوسری حدیث

مَنْ زَارَنِي بَعْدَ مَوْتِي كَمَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي

"جس نے میرے مرنے کے بعد میری زیارت کی وہ اس کی طرح ہوگا کہ جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔" (شفاء السقام میں یہ آٹھویں حدیث ہے)

حضرت علامہ السبکی کے مطابق انہوں نے امام ابن تیمیہ سے کئے گئے سوال کو اس نسخہ سے نقل کیا ہے جو سرکاری تحویل میں تھا اور اس نسخہ میں دوسری حدیث کا ذکر سند کے بغیر ہوا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اپنے جواب میں اس حدیث کو الدارقطنی کے حوالے سے بیان کیا ہے جس کی سند وہاں سے شروع کی جاتی ہے جہاں سے متکلم فیہ راویوں پر بحث ہوگی۔ علامہ السبکی کی طرح سند کو طول دے کر مسئلے کو الجھانے کی بجائے سلجھانے کی کوشش کی جائے گی۔

الاسود بن میمون نے ہارون ابی قزعۃ سے ال حاطب کے ایک آدمی سے اور اس نے حاطب سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے میری موت کے بعد میری زیارت کی اس نے گویا میری زندگی میں میری زیارت کی اور دو حرموں میں سے جو ایک حرم میں فوت ہوگا قیامت کے روز وہ ان میں اٹھایا جائے گا جو امن میں ہوں گے۔

حدیث کے علم سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا اس حدیث کی سند میں جب ایسے آدمی کا ذکر دیکھے گا جس کا نام وغیرہ بیان نہیں ہوا تو وہ اس حدیث کو صحیح تسلیم نہیں کرے گا کیونکہ علمِ حدیث کے مطابق صحیح حدیث وہی ہوگی جس کو بیان کرنے والے ہر راوی کی امانت و دیانت مسلّم اور معروف و مشہور ہو۔ کسی بحث کے بغیر ہی یہ روایت مجہول یعنی معروف نہ ہوگی اور اس کی اسی علت کی بنا پر قابل قبول نہ ہوگی۔

بے نام راوی سے بیان کرنے والے ہارون ابو قزعہ کے بارے میں امام ابو احمد عبداللہ بن عدی الجرجانی (المتوفی 365ھ) نے اپنی کتاب الکامل فی ضعفاء الرجال (ج 7 ص 2588) میں اور امام ابو جعفر محمد بن عمرو بن موسی بن حماد العقیلی المکی (المتوفی 322ھ) نے کتاب الضعفاء الکبیر میں امام بخاری کے حوالے سے نقل کیا کہ ہارون کی متابعت نہ کی جائے یعنی اس کی بیان کردہ حدیث کو بیان نہ کیا جائے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کا لسان المیزان (ج 6 ص 183 رقم 647) میں ہارون ابو قزعۃ کے بارے میں بیان ہے لا یُعرف اس کی کوئی پہچان نہیں۔ بقول الازدی وہ متروک ہے اور اسی بنا پر اس کی بیان کردہ حدیث چھوڑ دی جاتی ہے۔ امام بخاری نے کہا: اس سے میمون بن سوار نے روایت کی ہے اس کی متابعت نہ کی جائے۔

کتاب الضعفاء کے حاشیہ میں منقول ہے: یعقوب بن شیبہ، الساجی اور ابن الجارود نے بھی اس کو ضعفاء میں شمار کیا ہے۔

علامہ تقی الدین السبکی کے بیٹے ابوالنصر تاج الدین السبکی کے استاد امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج 4 ص 285، رقم 9168) میں امام بخاری کا فیصلہ کن قول نقل کر کے اس کے ضعیف ہونے کو ثابت کیا ہے۔

علامہ تقی الدین السبکی نے دارقطنی کی مروی حدیث کو اپنی کتاب شفاء السقام میں آٹھویں حدیث کے طور پر نقل کیا ہے اور ان دو موضوع روایتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے مزید 13 ضعیف اور موضوع روایات کو لمبی لمبی سندوں کے ساتھ درج کیا ہے۔

شفاء السقام کی ساتویں حدیث

مَنْ زَارَنِی مُتَعَمِّدًا کَانَ فِی جِوَارِی یَوْمَ الْقِیَامَةِ

"جس نے عمداً میری زیارت کی قیامت کے روز وہ میری ہمسائیگی میں ہوگا۔"

اس حدیث کو ابوجعفر العقیلی نے سوار بن میمون سے روایت کیا ہے۔

علامہ السبکی اپنے وقت کے عالم اور چیف جسٹس تھے لیکن اس کتاب میں انہوں نے ناحق کو حق اور حق کو ناحق ثابت کرنے کی جو کوشش کی وہ واقعی حیران کن ہے۔ اس حدیث کی سند میں بھی ہارون ابوقزعۃ کی بجائے ہارون بن قزعۃ مذکور ہے یعنی الدارقطنی اور امام بخاری کے مطابق وہ قزعۃ کا باپ تھا اور العقیلی نے اس کا ذکر قزعۃ کے بیٹے کی حیثیت میں کیا ہے۔ الدارقطنی میں ہارون کی آل حاطب کے ایک آدمی سے روایت ہے جبکہ العقیلی کی روایت کے مطابق اس نے ال الخطاب کے ایک آدمی سے روایت کی اور اس نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔

الدارقطنی کی روایت میں ایک راوی مجہول بے نام ہے اور یہاں صحابی کا واسطہ بھی غائب ہے۔ اسی لیے امام العقیلی نے یہ بھی لکھا ہے والروایة فی هذا لینة۔ اس روایت

میں کمزوری ہے۔ ائمہ حدیث کے نزدیک جو ضعف کی ایک قسم ہے جس کو چیف جسٹس صاحب نے چھوڑ دیا یا کمزوری سے آگاہ ہونے کے باوجود اس روایت کا سہارا لیا۔ العقیلی کی روایت میں سند اور متن دونوں میں اختلاف ہو گیا۔ اس روایت کو نقل کرنے سے پہلے امام العقیلی نے آدم بن موسیٰ کے حوالے سے امام بخاری کا ہارون کی متابعت نہ کرنے والا قول نقل کرنے کے بعد اس روایت کے ضعف کو واضح کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس اختلاف کا اقرار علامہ موصوف نے اپنی کتاب کے ص 32 میں بھی یوں کیا ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ حاطب کی جگہ الخطاب نہ لکھا گیا ہو۔ ان کو اس روایت کی حقیقت معلوم تھی لیکن اپنی سوچ کو راجح کرنے کی کوشش میں ضعف نہ آنے دیا اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے جو ان کے لیے مناسب نہ تھا۔

ابو قزعۃ کے بارے میں ابن حبان (المتوفی 35ھ) کا حوالہ دے دیا کہ اس نے ابو قزعۃ کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے حالانکہ ان کو ضرور اس بات کا علم ہوگا کہ ابن حبان کی کتاب الثقات میں بہت سے ایسے مجہولین کے نام موجود ہیں کہ جن کی جہالت کا خود انہوں نے اعتراف کیا ہے۔

مثال کے طور پر طبقہ ثالثہ میں سہل کے بارے میں ان کا کہنا ہے: اس نے شداد بن الھاد سے روایت کی اور اس سے ابو یعقوب نے حالانکہ میں اس کو نہیں پہچانتا اور نہ جانتا ہوں کہ اس کا باپ کون ہے۔

-- ایسے ہی حنظلہ شیخ مراسیل روایت کرتا ہے میں نہیں جانتا وہ کون ہے۔

-- اسی طرح الحسن ابو عبداللہ شیخ مراسیل روایت کرتا ہے اور ایوب النجار نے اس سے روایت کی اور مجھے معلوم نہیں وہ کون ہے اور اس کا بیٹا کون ہے۔

-- جمیل شیخ کے بارے میں ابن حبان کا کہنا ہے وہ ابی الملیح بن اسامۃ سے بیان کرتا

ہے اور اس سے عبداللہ بن عون نے روایت کی اور میں نہیں جانتا وہ کون ہے اور اس کا بیٹا کون ہے۔ کتاب الثقات میں ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ ابو یا ابن قزعہ کی مصنوع و موضوع روایت صحیح ہے کیونکہ ایک طرف اس کی روایت آل حاطب سے دوسری آل عمر کی طرف سے ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ابوداؤد الطیالسی (المتوفی 204ھ) کی روایت کا حوالہ بھی دے دیا کہ جس میں مذکور راوی بھی موجود نہیں اور متن میں بھی الفاظ بدل رہے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث صحیح نہیں۔

شفاء السقام کی چھٹی حدیث

مَنْ زَارَ قَبْرِی اَوْ مَن زَارَنِی، کُنْتُ لَهُ شَفِیْعًا اَوْ شَهِیْدًا

''جس نے میری قبر کی زیارت کی یا میری زیارت کی میں اس کے لیے شفیع یا گواہ ہوں گا۔''

اس روایت کو ابوداؤد الطیالسی کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے جس کا اگلا حصہ یوں ہے:

مَنْ مَاتَ فِی اَحَدِ الْحَرَمَیْنِ بَعَثَهُ اللّٰهُ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ

(فضائل الرسول ﷺ)

''جو دونوں حرموں میں سے کسی ایک حرم میں فوت ہوا تو قیامت کے روز اللہ اس کو مامون لوگوں میں اٹھائے گا۔''

ابوداؤد الطیالسی میں مذکور سند یوں ہے: سوار بن میمون ابوالجراح العبدی نے کہا: آل عمر میں سے ایک آدمی نے عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: پھر آگے حدیث بالا کے مذکور الفاظ ہیں۔

امام الحافظ ابوبکر احمد بن حسین بن علی البیہقی (المتوفی 458ھ) نے السنن الکبری

(ج 5 ص 245: باب زیارۃ قبر النبی ﷺ) میں ابوداؤد الطیالسی والی روایت کو نقل کر کے آخر میں لکھا ہے: ھذا اسناد مجھول "یہ سند مجہول ہے۔" اس کا اعتراف شفاء السقام کے ص 31 میں کیا گیا ہے۔

علامہ السبکی کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ میمون بن سوار یا سوار بن میمون بھی مجہولین میں سے ہے۔ شبہ کا سہارا دے کر تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ثقہ تھا حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ایک طرف وہ اس روایت کا راوی ہے جو ال حاطب سے مروی ہے اور دوسری طرف اس کا بھی راوی ہے جو ال عمر سے مروی ہے جو صریحا اختلاف واضطراب ہے۔ جہالت وابہام کی دلالت ہے۔

اس روایت کے دوسرے حصے پر غور کیا جائے تو اس کا مصنوع ہونا ثابت ہو جاتا ہے مَنْ مَاتَ کا تعلق ماضی سے ہے یعنی جو فوت ہوا۔ یہ بشارت ہر اس مرنے والے کے لیے ہے جس کی موت مدینہ یا مکہ میں واقع ہوئی۔ جبکہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اور اس کے کئی ساتھی مدینہ طیبہ میں فوت ہوئے اور کئی ایسے بھی تھے کہ جن کو ایمان لانا نصیب نہ ہوا۔ یہاں کوئی ایسا قاعدہ بھی مذکور نہیں جس سے شرط کو مستقبل سے مشروط کیا جا سکے۔ لہٰذا یہ متن بھی مشکوک ہے۔ اسی لیے امام ابن الجوزی نے موضوعات کی اپنی کتاب کے بابُ ثَوابِ مَنْ مَاتَ فِی اَحَدِ الْحَرَمَیْنِ (اس کے ثواب کا ذکر کہ جس کی موت حرمین میں سے ایک حرم میں واقع ہو) کے تحت دو روایات نقل کی ہیں:

1- مَنْ مَاتَ فِی اَحَدِ الْحَرَمَیْنِ اسْتَوْجَبَ شَفَاعَتِی وَجَآءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنَ الآمِنِیْنَ.

"جو حرمین میں سے ایک حرم میں فوت ہوا۔ اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی اور وہ قیامت کے روز مامون لوگوں میں آئے گا۔"

2- مَنْ مَّاتَ فِی اَحَدِ الْحَرَمَیْنِ مَکَّةَ اَوِ الْمَدِیْنَةَ بُعِثَ اٰمِنًا

"مکہ یا مدینہ حرمین میں سے ایک حرم میں جس نے وفات پائی وہ امن میں اٹھایا جائے گا۔"

پہلی کو سلمان رضی اللہ عنہ اور دوسری کو جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بشارت بیان کی۔ پہلی کے ایک راوی عبدالغفور اور دوسری کے ایک راوی عبداللہ بن المؤمل کو قابل اعتماد تسلیم نہ کیا اور امام ابن الجوزی نے ان کو موضوعات کا حصہ بنا دیا جبکہ علامہ السبکی اپنی ضعیف و موضوع روایات کا زبردست دفاع کرتے دکھائی دیتے ہیں اور صحیح مرفوع روایات کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

حاطب رضی اللہ عنہ والی روایت کی حقیقت

ال عمر بن الخطاب کی طرف منسوب روایت کے بارے میں امام بیہقی نے اس کی سند کو مجہول قرار دے کر فیصلہ کر دیا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور حضرت حاطب رضی اللہ عنہ وہ صحابی تھے کہ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصوبے سے آگاہ کرنے کے لیے قریش مکہ کی طرف ایک خط لکھا اور ایک عورت کو اجرت دے کر روانہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دے دی تو آپ نے علی رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، اور مقداد رضی اللہ عنہ کو اس عورت کے پیچھے روانہ کر کے اس سے وہ خط حاصل کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خط لکھنے کی وجہ حاطب رضی اللہ عنہ سے پوچھی تو انہوں نے کہا: میری بیوی بچے مکہ میں ہی ہیں اور وہاں ان کا کوئی دفاع کرنے والا نہیں۔ اس لیے قریش مکہ سے ہمدردی کے حصول کے لیے میں نے یہ کام کیا ہے، منافقت یا کفر کی بنا پر ایسا نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عذر قبول کر لیا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب ان کو قتل کرنے کی اجازت چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نہیں جانتا کہ اللہ نے بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں کیا فرمایا۔

یہ واقعہ بخاری و مسلم میں منقول ہے۔تمام مفسرین نے نقل کیا ہے کہ ان کے بارے میں سورۃ الممتحنہ کی پہلی آیت نازل ہوئی:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّىۡ وَعَدُوَّكُمۡ اَوۡلِيَآءَ ﴾

''اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ۔''

اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ نے تو عمل خوب اچھی طرح کیا لیکن جب اہل اسلام انتشار و افتراق کا شکار ہو گئے تو اس آیت مبارکہ کو بھی نظر انداز کر دیا گیا اور آج تو سراسر اس کے برعکس عمل ہو رہا ہے۔

حاطب کو رسول اللہ ﷺ کا صحابی ہونے کا شرف تو حاصل ہوا لیکن ان سے تین چار احادیث کے علاوہ ائمہ حدیث کو کوئی حدیث نہ ملی۔ وہ بھی حافظ ابن حجر عسقلانی کی ہمت تھی جیسا کہ انہوں نے لکھا قد ظفرت بغیرہ اس کے علاوہ پانے میں کامیاب ہوا۔

الاصابة کے آٹھ اجزاء میں سے پہلے جزء میں حاطب رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: ابوعمر کا قول اعزب ہے کہ میں مَنۡ رَاٰنِي بَعۡدَ مَوۡتِيۡ والی حدیث کے علاوہ کوئی حدیث نہیں جانتا۔

تین حدیثوں میں ایک تو وہ تھی جس میں حاطب رضی اللہ عنہ کو اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس کے پاس رسول اللہ ﷺ نے اپنے خط کے ساتھ بھیجا تھا۔(سیرت ابن ہشام ج2 ص 607)

تیسری میں رسول اللہ ﷺ کے جنگ احد میں زخمی ہونے اور علی رضی اللہ عنہ کے ڈھال میں پانی لئے ہوئے پاس ہونے اور حاطب کا رسول اللہ ﷺ کو زخمی کرنے والے عتبہ بن ابی وقاص کو قتل کر کے اس کا سر، اس کی تلوار اور اس کے گھوڑے کو آپ کی خدمت میں حاضر کرنے اور آپ کا ان کے لیے دعا کرنے کا ذکر ہوا ہے۔

المستدرك (ج3 ص300) میں مذکورہ روایت منقول ہے جس کو علامہ الزرقانی

نے المواھب اللدنیہ (ج2 ص 37) میں نقل کر کے لکھا ہے: الحاکم نے المستدرک میں اس روایت کو ایسی سند سے نقل کیا ہے جس میں مجاہیل ہیں۔ الحافظ کا کہنا ہے: یہ صحیح نہیں۔ اگر عتبہ قتل کر دیا گیا تھا تو اس نے اپنے بھائی سعد بن ابی وقاص کو وصیت کیسے کی تھی۔ کہا جاتا ہے شاید اس نے جنگ کے واقع ہونے سے پہلے کی ہے۔ یوں یہ روایت صحت کے اعتبار سے معیار سے گر گئی۔

حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ المعروف بابن عبدالبر النمری القرطبی (المتوفی 463ھ) نے اپنی کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب میں حاطب رضی اللہ عنہ سے بغیر سند وہ روایت نقل کی ہے جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ اس کے علاوہ حاطب رضی اللہ عنہ سے اور کوئی روایت نہیں جانتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ رَاٰنِیْ بَعْدَ مَوْتِیْ فَکَاَنَّمَا رَاٰنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ وَمَنْ مَّاتَ فِیْ اَحَدِ الْحَرَمَیْنِ بُعِثَ فِی الْاٰمِنِیْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

”جس نے میری موت کے بعد مجھے دیکھا گویا کہ اس نے مجھے میری حیات میں دیکھا اور جس کی موت حرمین میں سے کسی ایک میں ہوئی تو وہ قیامت کے روز مامون لوگوں میں اٹھایا جائے گا۔“

یہی وہ روایت ہے کہ جس کو بگاڑ دیے جانے سے ایسے مسئلے نے جنم لیا جو علمائے امت کے درمیان اختلاف کا باعث بن گیا۔ حالانکہ علماء ضعیف وموضوع روایات کو صحیح ثابت کرنے کی بجائے صحیح متواتر مرفوع حدیث پر عمل کرتے تو مقصد بھی حاصل ہوتا اور اختلاف بھی نہ ہوتا۔ حج یا عمرہ کرنے والے ہر شخص کی خواہش وکوشش ہوتی ہے کہ وہ مدینہ طیبہ ضرور جائے اور اس مسجد کو دیکھے جہاں سے اسلام کی عظمت کا سورج طلوع ہوا

تھا۔ وہ مسجد جس میں سید الانبیاء ﷺ نمازیں پڑھایا کرتے اور صحابہ ؓ سے خطاب فرمایا کرتے تھے اور جو اسلامی ریاست کا مرکز تھی۔ جہاں دین کا پہلا مدرسہ قائم ہوا تھا جہاں جبرئیل کا آنا جانا رہتا تھا۔ جس کو بنانے میں رسول اللہ ﷺ نے جسمانی طور پر خود حصہ لیا، جس کے ستون کھجور کے تنے اور چھت کھجور کی شاخوں اور پتوں کی تھی۔ جس کا فرش کنکریوں کا تھا، وہ مسجد جو آج دنیا کے عجائبات میں ایک عظیم عجوبہ کی صورت اختیار کر گئی جس میں ایک پڑھی جانے والی فرض نماز ایک ہزار نمازوں کے ثواب کے برابر ہو جاتی ہے، جو جہنم کی آگ سے بچانے کی ضمانت بن جاتی ہے جس مسجد میں مسجد بنانے والے خود اپنے دو انتہائی جانثار رفقاء کے ساتھ مدفون ہیں۔

مسجد کے قصد سے سفر میں ایک طرف صحیح حدیث کے مطابق عمل ہوتا ہے اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام بھیجنے کی سعادت بھی نصیب ہوتی ہے جبکہ ضعیف و موضوع روایات کو اپنانے میں جھوٹی روایات بیان کرنے والوں کی اعانت کرنے کی وجہ سے اجر و ثواب کی بجائے اعمال کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔

بخاری: (کتاب التعبیر ص 1036، کتاب العلم ص 21)، صحیح مسلم، ابو دائود، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی کے ''ابواب الرؤیا'' میں مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي۔ ''جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا۔''

حدیث تو خواب کے بارے میں تھی لیکن ال حاطب کے نام پر اس میں رَآنِي کو زَارَنِي بنا دیا گیا۔ باقی روایت کو ویسے ہی رہنے دیا مگر حفاظ حدیث نے اس پر گرفت کرتے ہوئے اس کو موضوع قرار دے دیا۔ اس کے باوجود علامہ تقی الدین السبکی نے اس کو اپنی کتاب کے پہلے باب میں آٹھویں حدیث بنا دیا۔

رہی بات اس روایت کے دوسرے حصے کی تو امام ابن الجوزی نے اس کا ذکر اپنی کتاب موضوعات میں کر دیا۔

شفاء السقام کی آٹھویں حدیث

مَنْ زَارَنِی بَعْدَ مَوْتِی فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فی حَیَاتِیْ۔

"جس نے میری موت کے بعد میری زیارت کی، گویا کہ اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔"

اس روایت کو علامہ السبکی نے اس کے دوسرے حصے سے الگ کر کے پہلے ذکر کیا۔ پھر الدار قطنی اور ابن عساکر کی سندوں کے ساتھ پوری روایت نقل کی ہے۔ حالانکہ علمی دیانت کا تقاضا تھا کہ جب الدار قطنی کا حوالہ دیا ہے تو اسی طرح پوری روایت پہلے ہی لکھ دی جانی چاہیے تھی۔ علامہ السبکی چونکہ قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس تھے۔ اس لیے انہوں نے وہی کچھ کیا جو ان کے چاہت و خواہش کے مطابق تھا۔

ابو قزعہ کے بارے میں تین ائمہ حدیث نے بیان دیا کہ اس کی روایت کو قبول نہ کیا جائے میزان الاعتدال (ج4، ص28) میں بھی امام بخاری کا قول نقل کیا گیا ہے۔ لیکن ابن حبان کے قول کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود ابو قزعہ کو ثقہ راوی قرار دے دیا۔ انہوں نے اپنی کتاب میں اس انداز کو اپنایا ہے۔

شفاء السقام کی چوتھی حدیث

فَمَنْ حَجَّ فَزَارَ قَبْرِی فَکَاَنَّمَا زَارَنِی فی حَیَاتِیْ۔

"جس نے حج کیا، پھر میری قبر کی زیارت کی، گویا کہ اس نے میری زندگی میں

میری زیارت کی۔"

علامہ موصوف نے یہ روایت الدار قطنی کے حوالے سے نقل کر کے لکھا ہے: ان کے علاوہ بھی دوسروں نے اس کو روایت کیا ہے۔ مترجم نے طبرانی اور امام بیہقی کی السنن الکبری کے حوالے بھی لگا دیئے۔

اس روایت کو ثابت کرنے کے لیے علامہ السبکی نے بارہ تیرہ لمبی سندیں نقل کی ہیں حالانکہ بحث کا تعلق صرف دو تین ان راویوں سے تھا کہ جن پر روایت کا دارومدار تھا اور ان کے بارے میں ائمہ حدیث نے کلام کیا تھا۔

الدار قطنی کی سند یوں ہے: ابو الربیع الزھرانی کا کہنا ہے: ہم نے حفص بن ابی داؤد، اس نے لیث بن ابی سلیم سے، اس نے مجاہد سے اور اس نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آگے حدیث کا متن ہے۔

امام بیہقی (المتوفی 458ھ) نے حفص بن سلیمان اور دوسری سند میں حفص بن ابی داؤد سے الدار قطنی کے الفاظ والی روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: تَفَرَّدَ بِهٖ حَفْصٌ وَهُوَ ضَعِيْفٌ۔ "اس میں حفص متفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔"

امام ابن عدی (المتوفی 365ھ) نے الکامل (ج2 ص791) میں حفص بن ابی داؤد کے تفرد کو ثابت کرنے کے لیے چند روایات نقل کرنے کے بعد فیصلہ دیا ہے کہ جن سے وہ روایت کرتا ہے ان کی عام احادیث غیر محفوظ ہیں۔ الدار قطنی والی روایت میں بھی وہ متفرد ہے۔ یہ بھی ثابت کیا کہ حفص بن سلیمان اور حفص بن ابی داؤد ایک ہی شخص ہے۔

تہذیب التہذیب (ج2 ص400)، تاریخ بغداد (8 ص186)، الضعفاء الکبیر (ج1 ص280)، الضعفاء الصغیر (ص32 رقم 83)، الضعفاء المتروکین (32 رقم 134) کے مصنفین ومؤلفین امام ابن ابی حاتم، امام الخطیب، امام بخاری اور امام

نسائی نے حفص بن سلیمان کو جو ابوداؤد ہی ہے۔ متروك الحديث او تركوه۔ ليس بشئی او ليس بثقة اور ضعیف الحدیث کہا ہے۔

امام بخاری کا یہ بھی کہنا ہے: لوگوں سے کتابیں مانگ کر لے جاتا اور روایات نقل کیا کرتا تھا۔ امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے: ان سے یحییٰ نے کہا کہ مجھے شعبہ نے بتایا کہ حفص بن سلیمان نے مجھ سے ایک کتاب لی اور پھر واپس نہیں کی۔ تاریخ بغداد میں سے قاضی صاحب نے امام احمد بن حنبل کے بیٹے کے حوالے سے ایک قول تو صالح ہونے کا نقل کر دیا اور ان کا دوسرا قول متروک الحدیث والا چھوڑ دیا۔

تاریخ بغداد (ج 8 ص 188) میں ابو علی صالح بن محمد کا قول ہے: حفص بن سلیمان کی بیان کردہ حدیث لکھی نہیں جاتی بلکہ اس کی تمام احادیث مناکیر ہیں۔

ابن خراش کا کہنا تھا: كَذَّابٌ متروكٌ يَصُنَعُ الُحَدِيُثَ۔ ''جھوٹا ہے چھوڑا گیا ہے، حدیث گھڑتا ہے'' قیس بن مسلم اور عاصم بن بھدلۃ نے اس کی بیان کردہ احادیث کو بواطل قرار دیا۔

تھذیب التھذیب (ج 2 ص 401) میں ابن حبان سے منقول ہے حفص اسانید کو آگے پیچھے کر دیا کرتا اور مراسیل کو مرفوع بنا دیتا تھا۔

امام ابن الجوزی نے الموضوعات میں عبدالرحمٰن بن مہدی سے بیان کیا ہے:

والله ما تحل الرواية عنه۔ ''اللہ کی قسم، اس سے روایت کرنا حلال نہیں۔''

چیف جسٹس صاحب کے بیٹے کے استاد محترم امام الذہبی نے بھی میزان الاعتدال (ج 1 ص 558) میں وہی کچھ نقل کیا ہے جو ائمہ حدیث نے حفص بن سلیمان ابو داؤد الاسدی کے بارے میں فرمایا لیکن چیف جسٹس صاحب نے حفص بن سلیمان اور حفص بن ابی داؤد کو دو بنا کر الجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی اور امام بیہقی اور ابن عساکر کی بات کو

تسلیم بھی کیا۔ قاضی صاحب کا اپنا قول ہے: اگر یہ وہی قاری ہے کہ جس کے بارے میں ابن عدی وغیرہ نے بہت کلام کیا ہے اور اس کے ضعیف ہونے میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے اور ابن خراش نے اس کو جھوٹا، متروک کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ حدیث گھڑتا ہے تو میرے نزدیک یہ زیادتی ہے کیونکہ وہ قرأت کا امام ہے کیسے مان لیا جائے وہ حدیث گھڑنے اور جھوٹ بولنے والا ہے۔ لوگ اس سے قرأت لینے پر متفق تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ اہل الحدیث میں سے نہیں تھا یعنی حدیث کے فن کا ماہر نہیں تھا۔ اسی لیے اس کی روایات میں بہت سی غلطیاں اور منکرات ہیں۔ آخر میں قاضی صاحب وہیں آگئے۔ اگر اس کا ضعف ثابت بھی ہو جائے جیسا کہ مشہور ہے، تب بھی اس حدیث کے سلسلے میں وہ متفرد نہیں ہے۔

آخر میں طبرانی کی روایت کا بھی سہارا لینے کی کوشش کی لیکن اس روایت میں بھی اللیث بن بنت اللیث بن ابی سلیم اور اس کی دادی عائشہ دونوں اہل علم کے نزدیک مجہول ہیں۔

اللیث بن ابی سلیم کے بارے میں امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج3 ص 420رقم 6997) میں امام احمد کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ مضطرب الحدیث تھا لیکن لوگوں نے اس سے بیان کیا ہے۔

امام یحیٰی بن معین اور امام النسائی نے اس کو ضعیف کہا۔ ابن حبان کا کہنا تھا کہ آخری عمر میں اس کا ذہنی معاملہ خلط ملط ہو گیا تھا۔ عیسیٰ بن یونس کا قول ہے: میں آخری عمر میں دن چڑھے ان کے پاس سے گزرتا تو ان کو دیکھتا کہ وہ منارے پر کھڑے اذان دے رہے ہوتے۔ یوں لیث کا معاملہ ائمہ حدیث کے نزدیک متکلم فیہ تھا۔ لہٰذا مذکورہ حدیث بھی ائمہ حدیث کے معیار سے گری ہوئی ہے۔

مترجم کا کمال

مترجم نے یہاں تقریباً دو صفحوں کا ترجمہ ہی گول کر دیا ہے۔ شاید بار بار کے تکرار اور ایک ہی راوی کو ثقہ ثابت کرنے کے لیے غیر ضروری لمبی سندوں سے وہ بھی اکتا گئے یا جو بات ان کی سوچ کے مطابق نہ تھی اس کو چھوڑ دیا۔

شفاء السقام کی پہلی حدیث

مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِیْ۔

"جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی۔"

اس روایت کی سندیں اگرچہ علامہ السبکی صاحب نے سات آٹھ نقل کی ہیں لیکن اس کے اصل راوی عبداللہ بن عمر صحابی سے نافع تابعی سے پانچ سندوں میں عبیداللہ بن عمر اور تین میں ان کے بڑے بھائی عبداللہ بن عمر ہیں۔ پھر ان دونوں سے راوی موسیٰ بن ہلال نے مذکورہ حدیث بیان کی ہے۔ یہاں پہلا اشکال یہ ہے کہ موسیٰ کی روایت صحیح عبداللہ سے ہے یا عبیداللہ سے۔ چونکہ عبداللہ اور موسیٰ بن ہلال دونوں ضعیف ہیں لہٰذا قاضی صاحب نے ان کے دفاع پر بحث کو 12-13 صفحات میں پھیلا دیا لیکن ضعف پھر بھی دور نہ ہوا۔

سنن الدار قطنی (ج 4 ص 228) میں مذکورہ روایت موسی بن ھلال العبدی نے عبیداللہ بن عمر سے اور انہوں نے نافع سے اور انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی۔

بعض سندوں میں عبیداللہ بن عمر کی بجائے عبداللہ بن عمر کا بھی ذکر ہوا ہے لہٰذا حضرت قاضی صاحب نے خود ہی اپنی کتاب کے ص8 (عربی) ص23 (اردو) میں لکھا ہے:
حافظ یحییٰ بن علی القرشی نے اس روایت کو بیمار یعنی کمزور قرار دیا ہے اور کہا ہے: درست یہی ہے کہ روایت میں عبیداللہ ہے۔ میں نے تاریخ ابن عساکر میں ابوعبداللہ البرزالی الحفوظ کے لکھے ہوئے خط میں دیکھا کہ وہ عبیداللہ ہی ہے۔ ابواحمد بن عدی نے کتاب الکامل میں کہا ہے: زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ عبداللہ ہے۔

قاضی صاحب اپنا فیصلہ دیتے ہوئے کہتے ہیں: ابن عدی کا قول محل نظر ہے اور ہمارے نزدیک وہ عبیداللہ ہی ہے کیونکہ عبید بن محمد، ابن سمرہ اور مسلمہ الجھنی سے اسی طرح کی روایات ہیں۔ قاضی صاحب کا اپنا ارشاد ہے: اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حدیث عبیداللہ اور عبداللہ دونوں سے مروی ہو اور موسیٰ نے دونوں سے سنا ہو اور کبھی ان سے روایت کی ہو اور کبھی ان سے۔

جس روایت کی سند کا یہ حال ہو تو وہ حسن یا صحیح کے درجے میں کیسے ہوگی۔ امام بیہقی کی شعب الایمان (ج2 ص490، رقم 4159-4160) کا یہ حوالہ بھی مذکور ہو: سَوَآءٌ اَقَالَ عُبَيْدُاللّٰهِ اَمْ عَبْدُاللّٰهِ فَهُوَ مُنْكَرٌ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عمر لَمْ يَاْتِ بِهِ غَيْرُهٗ "یہ راوی عبیداللہ ہو یا عبداللہ جب نافع عن ابن عمر سے روایت کریں تو وہ منکر ہوگی یعنی قابل قبول نہیں ہوگی۔" امام بیہقی نے نافع سے بیان ہونے والی روایت کا رد کر دیا۔

قاضی صاحب کا اپنا اقرار ہے کہ راوی کے متفرد ہونے کے علاوہ اور کوئی علت نظر نہیں آتی، مروی روایت کی علت کا انکار وہ بھی نہ کرسکے۔

تہذیب التہذیب (ج5 ص327 رقم 564) میں جہاں ابوحاتم کا یہ قول منقول ہے کہ میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا: وہ عبداللہ کی تعریف کر رہے تھے۔ وہاں یہ بھی موجود ہے:

كَانَ يَزِيْدُ فِي الْاَسَانِيدِ وَيُخَالِفُ وَكَانَ رَجُلًا صَالِحًا۔ ''وہ سندوں میں اضافہ کرتے اور مخالفت کیا کرتے اور آدمی صالح تھے۔'' عبداللہ بن علی بن المدینی نے اپنے باپ کے حوالے سے کہا: وہ ضعیف تھے۔ امام النسائی کا قول ہے: ضعیف الحدیث تھے۔ جامع الترمذی (ابواب الطہارۃ ج1 ص35) یحیٰ بن سعید نے ان کے حدیث حفظ کرنے کے بارے میں ضعیف کہا۔ امام بخاری نے بھی اپنی تاریخ میں ان کا ضعیف ہونا نقل کیا ہے۔

قاضی صاحب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جس راوی کی تعریف کے ساتھ مخالفت بھی ہوتی ہو تو اس کی روایت معیار سے گر جاتی ہے اور وہ متکلم فیہ ہو جاتا ہے۔

دوسرے متکلم فیہ راوی موسی بن ھلال ہیں۔ ایسے راویوں میں سے کسی ایک کی کوئی ایک روایت کو امام احمد بن حنبل، شعبہ، مالک، عبدالرحمٰن بن مہدی اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے ائمہ کرام جب قبول کرتے ہیں تو وہ روایت اجتہاد و اعتماد کے طور پر نہیں بلکہ اعتبار و استشہاد کے طور پر ہوتی ہے۔ ضعیف راوی کی ثقاہت و عدالت اس سے ثابت نہیں ہو جاتی۔

کتاب الضعفاء الکبیر (ج4 ص 180 رقم 1744) میں موسی بن حلال والی روایت نقل کر کے امام العقیلی نے لکھا ہے: وَالرِّوَايَة فِي هٰذَا الْبَابِ فِيهَا لِينٌ۔ ''اس باب میں جو روایت ہے، اس میں کمزوری یعنی ضعف ہے۔''

موسیٰ بن ھلال کے ترجمہ میں یہ بھی منقول ہے: لَا يصحُّ حديثه ولا يتابع عليه۔ ''اس کی حدیث صحیح نہیں ہوتی اور نہ اس کی متابعت کی جاتی ہے۔''

کتاب الجرح والتعدیل (ج8 ص 166) میں امام عبدالرحمٰن کا بیان ہے: میں نے اپنے باپ ابو حاتم سے موسیٰ بن ھلال کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: وہ مجہول ہے۔

قاضی السبکی صاحب کے نزدیک اس کی جہالت کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ امام احمد بن حنبل نے ان کی روایت کو لے کر اس کی جہالت کا ازالہ کر دیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اہم حدیث کو امام احمد بن حنبل نے اپنی اتنی بڑی کتاب میں جگہ کیوں نہ دی۔ اس کا جواب میزان الاعتدال (ج4 ص226) اور لسان المیزان (ج6 ص135) میں یوں دیا گیا ہے: وانکر ما عندہ حدیثہ عن عبداللہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر مرفوعًا مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ۔ ''ان کے پاس جو ان کی حدیث عبداللہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر مروی ہے، اس کا انکار کیا گیا ہے۔'' یعنی جس نے میری قبر کی زیارت کی۔ اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی۔

ابن خزیمہ اور عبدالحق کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے جس کو حافظ ابن حجر نے یوں نقل کیا ہے: وَالْحَقُّ اَنَّہٗ لَمْ یَثْبُتْ عَدَالَتُہٗ۔ اور حق یہ ہے کہ راوی کی اس سے عدالت ثابت نہیں ہوتی۔

جہاں تک قاضی صاحب کا یہ فرمان ہے کہ اس قسم کی احادیث کا جمع ہونا حدیث کی قوت میں اضافہ کرتا ہے اور کبھی کبھی ضعیف حدیث اسناد کے تعدد کی وجہ سے حدیث حسن اور حدیث صحیح ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب تو پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ اگر چند غیر اعتباری لوگ جمع ہو کر ایک جھوٹی غیر ثابت شدہ چیز کو صحیح کہہ دیں تو کیا وہ صحیح ہو جائے گی۔ ائمہ حدیث ذرا سے شک پر حدیث کو قبول نہیں کرتے تھے کیونکہ خبر ان کے بارے میں ہوتی ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سب سے اونچی شان و عظمت والا بنایا۔

احادیث ضعیفہ کی نقل و روایت اور ان پر عمل

ڈاکٹر صبحی صالح (بیروت) نے اپنی کتاب علوم الحدیث میں لکھا ہے:

لوگ عموماً یہ عبارت نقل کرتے ہیں:

يحوز العمل بالحديث الضعيف فی فضائل الاعمال۔

"فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روایت حدیث میں وہ سہل انگاری سے کام لیتے ہیں اور وہ احادیث بھی روایت کرنے لگتے ہیں جو ان کے نزدیک صحیح بھی نہیں ہوتیں۔ اس طرح دین اسلام میں اکثر ایسے اعمال وتعلیمات کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے جن کی شرعاً کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

یہ عبارت سالہا سال سے یونہی چلی آرہی ہے حالانکہ اس کی اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ تین کبار ائمہ کی طرف منسوب عبارت کا چربہ اور اس کی صدائے بازگشت ہے اور وہ امام احمد بن حنبلؒ، امام عبدالرحمٰن مہدیؒ اور امام عبداللہؒ بن مبارک تھے۔

الکفایۃ ص 133 میں ان کا قول ہے:

جب حلال وحرام کے بارے میں کوئی حدیث ہم روایت کریں گے تو اس میں سختی سے کام لیں گے اور جب کوئی حدیث فضائل اعمال کی روایت کریں گے تو اس میں نرمی برتیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ محدثین حلال وحرام کے متعلق مسائل میں صرف انہی احادیث سے احتجاج کرتے جو صحت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوتیں اور جن کو بالاتفاق صحیح قرار دیا جاتا۔ اس کے برعکس جب فضائل اعمال کے بارے میں حدیث روایت کرنا مقصود ہوتا تو سختی کی ضرورت نہ سمجھتے اور احادیث صحیحہ والی شروط کے بغیر اخذ واحتجاج کر لیتے بلکہ اس سے نیچے اتر کران روایات سے بھی احتجاج کر لیتے جو صحیح کے درجہ سے فروتر ہوتیں اور جن کو ہم حسن کہتے ہیں۔ متقدمین کے عصر وعہد میں ان کو ضعیف حدیث ہی کی ایک قسم قرار

دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر صبحی صالح کا کہنا ہے: دین اسلام میں یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ضعیف حدیث کسی شرعی حکم یا فضائل اعمال کے لیے مصدر و ماخذ نہیں بن سکتی۔ کیونکہ ضعیف حدیث کی اساس ظن پر ہوتی ہے اور ظن کسی صورت میں بھی حق کی جگہ نہیں لے سکتا۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فضائل اعمال بھی شرعی احکام کی طرح دین کے بنیادی ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ کسی طور پر جائز نہیں کہ دین کی اساس و بنیاد ایسے ستونوں پر رکھی جائے جو بالکل کمزور اور قوت و استحکام سے عاری ہوں۔

خلاصہ یہ کہ ہم اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ فضائل اعمال میں ضعیف احادیث کو معمول بنا لیا جائے۔ اگرچہ ان میں وہ شرائط بھی موجود ہوں جن کو آسانی ڈھونڈنے والوں نے ضروری ٹھہرایا ہو۔

مثلاً روایت بہت زیادہ ضعیف نہ ہو، ان اصول وکلیات سے ہم آہنگ اور جو کتاب وسنت صحیحہ سے ثابت ہو، اس سے قوی تر دلیل اس کے معارض نہ ہو۔

ان شروط کے باوصف ہم ضعیف حدیث کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں کیونکہ اس پر عمل کرنے سے ہم بے نیاز ہیں۔ ہمارے پاس احکام شرعیہ اور فضائل اعمال کے لیے اس قدر حسن وصحیح احادیث موجود ہیں کہ ہمیں ضعیف احادیث تسلیم کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔

تسلیم نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ضعیف حدیث کا ثبوت ہمارے قلب وضمیر میں ہمیشہ کھٹکتا رہے گا اور ہمیں کبھی بھی اطمینان قلب حاصل نہ ہو سکے گا۔ اسی شک وشبہ کی وجہ سے ہم ان کو ضعیف کہتے ہیں جبکہ دینی امور میں یقین کامل کی ضرورت ہوتی ہے۔

لسان المیزان میں ابن خزیمہ کا قول منقول ہے کہ اگر یہ خبر صحیح بھی ہو تو بھی دل میں کھٹکا رہے گا۔

شفاء السقام کی دوسری حدیث

مَنْ زَارَ قَبْرِی حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِی

جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت حلال ہوگئی۔

اس حدیث کو امام ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق البزار نے اپنی مسند میں یوں بیان کیا ہے: قیتبہ نے عبداللہ بن ابراہیم سے، اس نے عبدالرحمٰن بن زیاد سے، انہوں نے اپنے باپ زید سے اور انہوں نے ابن عمرؓ سے بیان کیا۔ آگے حدیث کے الفاظ ہیں۔

اس سے پہلے کہ راویوں کے بارے میں قاضی القضاۃ السبکی کے اپنے اور ائمہ حدیث کے نقل کردہ تأثرات کا ذکر کیا جائے مناسب ہے کہ جنہوں نے اس حدیث کو اپنی مسند کا حصہ بنایا ہے ان کے بارے میں امام الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (ج2 ص653) میں جو لکھا ہے وہ پیش کردیا جائے۔ ان کا کہنا ہے:

ذکرہ الدار قطنی فاثنی علیہ یحطئی ویتوکل علی حفظہ

"ان کا ذکر الدار قطنی نے کرتے ہوئے ان کی تعریف کی اور یہ بھی کہا: وہ غلطی کرتے ہیں اور اپنے حافظے پر بھروسا کرتے ہیں۔"

شذرات الذہب (ج2 ص209) میں ابوالحاکم کے حوالے سے منقول ہے:

یخطئی فی الاسناد والمتن "سندوں اور متن میں وہ غلطی کرتے ہیں۔"

یہ تو ان کا حال ہے کہ جن کی مسند سے مذکورہ حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے۔

قاضی صاحب کا اپنا بیان ہے: عبداللہ بن ابراہیم یہ غفاری ہیں۔ کہا جاتا ہے: یہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ ان سے امام ابوداؤد نے روایت کیا۔ امام ترمذی نے کہا: ابوداؤد کی حدیث منکر ہے۔ ابن عدی کا کہنا ہے کہ ان کی روایات کی ثقہ راویوں نے

متابعت نہیں کی۔ بزار نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد کہا: عبداللہ بن ابراہیم نے ایسی احادیث بیان کی ہیں جن کی متابعت نہیں کی گئی۔ پس جو کچھ ان کی حدیث سے لکھا جاتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ حفظ کرتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ ایک گروہ ان کو ضعیف قرار دیتا ہے۔ ابن عدی کا کہنا ہے: ان کی روایت کردہ احادیث حسان ہیں۔ یہ ان میں سے ہیں کہ جن سے لوگوں نے درگزر کیا ہے اور بعض نے ان کی تصدیق کی اور ان میں سے ہیں کہ جن کی حدیث لکھی جاتی ہے۔ امام حاکم نے ایک اعتبار سے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے جس کو ہم توسل بالنبی ﷺ کے باب میں بیان کریں گے۔ اس حدیث کو بیان کرنے کا مقصد پہلی حدیث کو اس سے تقویت دینا ہے۔

جو حدیث کو نقل اور بیان کرنے والے ہیں ان سب کا ضعف خود بیان کرنے کے بعد بھی قاضی صاحب اگر حق قبول کرنے پر تیار نہ ہوں تو اللہ کے سوا ان کو کون سمجھا سکتا تھا۔ شاید ان کی نظروں سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک اوجھل رہا: ”جس نے مجھ سے حدیث بیان کی اور اس کو معلوم تھا کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے۔“

مذکورہ روایت کی حقیقت کو مزید اجاگر کرنے کے لیے امام ابن حبان (المتوفی 354ھ) کے قول پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو ان کی کتاب المجروحین (ج2 ص38) میں یوں منقول ہے: كَانَ مِمَّنْ يَأْتِي عَنِ الثِّقَاتِ الْمَقْلُوبَات وعَنِ الضُّعَفَاءِ الْمُلْزِقَاتِ ”حدیث کا راوی ان میں سے تھا جو ثقہ راویوں سے الٹ پلٹ کرکے اور کمزور راویوں سے چپکنے والی روایات لاتا تھا۔“ یعنی غیر صحیح کو صحیح ثابت کیا کرتا اور صحیح کو آگے پیچھے کیا کرتا تھا۔

حافظ ابن حجر کا تہذیب التہذیب (ج5 ص138) میں کہنا ہے: یوں وہ حدیث

گھڑتا تھا۔ابوداؤد کے مطابق وہ منکر الحدیث تھا۔الحاکم کا بیان ہے: اس نے کمزور راویوں سے من گھڑت روایات بیان کیں۔اس کے علاوہ اس طرح کوئی اور روایت نہیں کرتا تھا۔

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے بارے میں امام ابن حبان کی کتاب المجروحین (ج2ص57) میں منقول ہے وہ خبروں کو الٹ پلٹ کر دیتا تھا اور اس کو اس کی خود بھی خبر نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ مراسیل کو مرفوع اور اسناد کو موقوف کرنا بہت زیادہ ہوگیا، پس حق یہ ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔

محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم سے مروی ہے کہ میں نے امام الشافعی کو سنا کہ امام مالک کے لیے ایک حدیث ذکر کی گئی۔اس کی منقطع سند کے بارے میں جب ان کو بتایا گیا تو انہوں نے کہا: عبدالرحمٰن بن زید کے پاس جاؤ۔وہ تمہیں اپنے باپ نوح علیہ السلام سے حدیث بیان کرے گا۔

نوح علیہ السلام والا قصہ امام الذہبی کی میزان الاعتدال (ج2ص565) اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی تہذیب التہذیب (ج6ص179) میں امام الشافعی سے یوں مروی ہے کہ عبدالرحمٰن بن زید سے کہا گیا: کیا آپ کے باپ زید نے آپ کے دادا اسلم کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نوح علیہ السلام کی کشتی نے بیت اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعتیں بھی پڑھیں۔عبدالرحمٰن نے کہا: ہاں ایسا ہی بتایا ہے۔امام ابن الجوزی نے بھی یہ واقعہ الموضوعات (ج1ص100) میں نقل کیا ہے۔

اسی لیے ساجی نے کہا: وہ منکر الحدیث ہے۔امام بخاری، امام ابن ابی حاتم، امام علی بن المدینی، امام النسائی اور امام ابوزرعہ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔

امام الطحاوی کا بیان ہے: اہل علم کے نزدیک اس کی روایت کردہ حدیث میں انتہائی ضعف ہوتا ہے۔امام الحاکم اور امام ابونعیم نے کہا: اس نے اپنے باپ سے موضوع

احادیث روایت کی ہیں۔ امام ابن الجوزی کا کہنا ہے: اس کے ضعیف ہونے پر سب کا اجماع ہے۔

جلیل القدر ائمہ حدیث کی تحقیق کو جھٹلا کر اپنی سوچ وفکر کو غالب کرنے کی کوشش کرنا حضرت قاضی القضاۃ السبکی ہی کی شان تھی۔

احادیث کو لکھنے سے منع کرنا اور لکھی ہوئی احادیث کو جلانا کے راوی بھی عبدالرحمٰن بن زید ہی ہیں۔ نتیجہ اخذ کرنا قارئین ہی پر چھوڑا جاتا ہے۔

شفاء السقام کی تیسری حدیث

مَنْ جَاءَ نِیْ زَائِراً لَا یَعْمَلُهُ حَاجَةٌ اِلَّا زِیَارَتِی کَانَ حَقًّا عَلَیَّ اَنْ اَکُوْنَ لَهٗ شَفِیْعًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ

"جو میری زیارت کے لیے آیا میری زیارت کے علاوہ کسی اور ضرورت نے اس کو اس عمل پر نہ لگایا تو مجھ پر حق ہے کہ قیامت کے روز اس کا شفیع بن جاؤں۔"

اس کو طبرانی نے معجم الکبیر میں، الدارقطنی نے امالی میں، ابوبکر بن المقری نے معجم میں روایت کیا ہے۔ سعید بن السکن نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود حضرت قاضی السبکی صاحب کا اپنا بیان ہے: اخْتُلِفَ عَلٰی مَسْلَمَةَ فِی عُبَیْدِاللّٰهِ وَعَبْدِاللّٰهِ کَمَا اخْتُلِفَ عَلٰی مُوسَی بنِ هَلَالٍ۔ "عبیداللہ اور عبداللہ سے روایت کرنے کے بارے مسلمہ پر اسی طرح اختلاف کیا گیا ہے کہ جس طرح موسیٰ بن ہلال کے بارے میں اختلاف کیا گیا تھا۔"

امام بیہقیؒ نے شعب الایمان (ج3 ص490، رقم 4159-4160) میں یہ فیصلہ سنا دیا کہ عبیداللہ یا عبداللہ جب نافع کے حوالے سے ابن عمر رضی اللہ عنہ صحابی سے روایت کریں

گے تو وہ منکر ہوگی۔ مگر قاضی صاحب نے پھر بھی انہی کی روایت کا سہارا لیا اور نافع کے ساتھ سالم بھی آگئے۔

مترجم نے ص 31 میں طبرانی کی المعجم الکبیر، المعجم الاوسط، ھیثمی کی مجمع الزوائد اور علامہ السیوطی کی الدر المنثور کے حوالے دیئے ہیں۔ حالانکہ مجمع الزوائد اور الدر المنثور میں بھی مذکورہ روایت طبرانی ہی کے حوالے سے منقول ہے۔

چنانچہ مجمع الزوائد (ج4 ص2) کے الفاظ ہیں۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط و فیہ مسلمۃ بن سالم وھو ضعیف۔ اس کو طبرانی نے الکبیر اور الاوسط میں روایت کیا اور اس میں مسلمہ بن سالم ہے اور وہ ضعیف ہے۔ جس طرح اس روایت کی سند میں اختلاف ہے ویسے ہی اس کے متن میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے جیسا کہ خود قاضی صاحب نے فرمایا ہے: کہیں یَعْمَلُہٗ مذکور ہے تو کہیں یَنْزِعُہٗ یا تَنْزِعُہٗ مروی ہے۔ ابن سکن کی اس کتاب کا بھی حوالہ دے دیا کہ جس میں اسناد محذوف ہیں۔ جب سند والی روایات میں سے کوئی صحت کے درجہ کو نہیں پہنچتی تو بے سند روایت کیسے قبول ہوگی۔ پھر اپنے ظن و گمان پر بھروسا کرتے ہوئے یہ بھی فرما دیا کہ ابن سکن کی تبویب دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد بعد الموت ہے یا بعد الموت بھی عموم میں شامل ہے۔ حالانکہ روایت میں نہ قبر کا ذکر ہے اور نہ ہی موت کا۔

قاضی صاحب نے جو سمجھا وہ جلیل القدر ائمہ حدیث کی سمجھ میں نہ آیا اور انہوں نے ان روایات میں سے کسی ایک کو بھی اپنی صحیح، مسند، سنن یا جامع میں روایت کرنے کے قابل نہ سمجھا کہ جن کو قاضی صاحب نے بڑی محنت سے جمع کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

علامہ سبکی پہلے باب کی تمام روایت کے راویوں میں سے جس پر ائمہ نے کلام کیا ہوتا ہے اس کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر اس کے قابل اعتماد ہونے پر مصر ہو جاتے ہیں۔ بات

صرف اتنی سی ہے اگر وہ صحیح ہوتا جس کو صحیح ثابت کرنے میں بڑی کوشش کی گئی تو اس کا انکار کون کرسکتا تھا۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے۔ اللہ اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت ہی میں ہماری نجات ہے۔

تهذيب التهذيب (ج10 ص 131 رقم 232) میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے مسلم بن سالم الجہنی کے بارے میں لکھا ہے ان کو مسلمہ بھی کہا جاتا ہے مکہ میں رہتے تھے۔ انہوں نے عبداللہ بن عمر العمری اور ان کے بھائی عبیداللہ بن عمر اور ان دونوں کے علاوہ اور سے بھی روایت کی ہے اور ان سے عبداللہ بن محمد العبادی اور مسلم بن حاتم الانصاری اور ان کے علاوہ اور نے بھی روایت کی ہے۔

وقال ابو داؤد ليس بثقة "امام ابوداؤد نے کہا: وہ ثقہ یعنی قابل اعتماد نہیں۔"

ميزان الاعتدال (ج4 ص 104 رقم 8488) میں امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان الذہبی (المتوفی 748ھ) قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی کے بیٹے تاج الدین السبکی کے استاد محترم نے بھی پہلے امام ابوداؤد السجستانی کا قول ہی نقل کیا: ليس بثقة یعنی مسلم بن سالم الجہنی و مسلمہ قابل اعتماد نہیں، پھر انہوں نے مسلم بن حاتم الانصاری والی سند کے ساتھ زیارت والی وہ روایت نقل کی ہے جس کی مسلمہ نے عبیداللہ کی بجائے عبداللہ سے روایت کی ہے۔

تهذيب التهذيب (ج5 ص 327 رقم 564) میں اس راوی کے بارے میں بڑا خوبصورت تبصرہ ہے، وہ سندوں میں اضافہ کیا کرتے اور مخالفت کیا کرتے تھے مگر آدمی صالح تھے۔

کسی کو مزید تسلی کی ضرورت ہو تو حافظ ابن عبدالہادی کی کتاب الصارم المنكي دیکھے۔

شفاء السقام کی نویں حدیث

مَنْ حَجَّ حَجَّةَ الْإِسْلَامِ وَزَارَ قَبْرِیْ وَغَزَا غَزْوَةً وَصَلّٰی عَلَیَّ فِیْ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ لَمْ یَسْأَلْهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فِیْمَا افْتَرَضَ عَلَیْهِ

جس نے اسلامی تعلیم کے مطابق حج کیا اور میری قبر کی زیارت کی اور ایک غزوہ میں شریک ہوکر جہاد کیا اور بیت المقدس میں مجھ پر درود بھیجا اللہ عزوجل نے جو کچھ اس پر فرض کیا اس بارے میں اس نے سوال نہیں کیا۔

مترجم نے لَمْ یَسْأَلْهُ اللّٰهُ کا ترجمہ مستقبل کے صیغہ میں کیا ہے۔ یعنی اللہ اس سے سوال نہیں کرے گا حالانکہ عربی گرائمر کے مطابق جب نفی جحدبلم مضارع پر آئے تو معنی ماضی میں ہوجاتا ہے لہٰذا لَمْ کی بجائے یہاں لَنْ کی ضرورت تھی۔

اس متن پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مَنْ شرطیہ ہے اور چار شروط کے بعد جواب شرط ہے ان شرطوں میں سے ایک کو دلیل بنانا کیسے مناسب ہوسکتا ہے۔

قاضی السبکی صاحب نے متن کی طرح سند میں جن پانچ راویوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں وہی نقل کیا ہے جو ان کے حق میں جاتا تھا۔ جو ان کے خلاف تھا اس کو انہوں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا۔ اہل علم کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی خیانت نہیں۔ یہ بھی واضح ہوجانا چاہئے کہ یہ حدیث بالکل موضوع (من گھڑت) ہے۔ کیونکہ سفیان الثوری سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تک جو سند مذکور ہے وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والوں کی صحیح ترین سند ہے۔ روایت گھڑنے والے نے سند تو عبداللہ بن مسعود کی لے لی لیکن اس کو عبداللہ بن عمر سے جوڑ دیا۔ حیرت ہے کہ قاضی القضاۃ السبکی جیسے فاضل عالم سے الخطیب البغدادی کی الکفایۃ کا باب "ذکر المحفوظ عن ائمۃ اصحاب فی

اصح الاسانید" کیسے اوجھل رہا۔ جس میں امام عبداللہ بن مبارک سے مروی ہے کہ لوگوں کا سندوں میں سے کسی سند کے صحیح سند ہونے پر جو اجماع اس سند کے بارے میں ہوا وہ کسی اور سند پر نہیں ہوا اور وہ یہ ہے: سفیان عن منصور عن ابراھیم عن علقمة عن عبداللہ۔

اصل میں روایت گھڑنے والے کو اس کا علم نہ تھا یا اس نے عمداً ایسا کیا کہ جب عبداللہ صحابی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے مراد عبداللہ بن مسعود ہی ہوتے ہیں۔ عبداللہ بن عمر یا عبداللہ بن عمرو یا عبداللہ بن عباس یا عبداللہ بن زبیر نہیں ہوتے۔ لیکن اس نے عبداللہ بن عمر کو اصل راوی بنا دیا۔

اسی لیے امام الذہبی کی تذکرۃ الحفاظ (ج 1 ص 48 رقم 24)، تھذیب التھذیب (ج7 ص 276، ص 277) میں علقمہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ان میں عبداللہ بن عمر کا نام موجود نہیں ہے۔ علقمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پیدا ہوئے اور تابعین میں سے خوش الحانی سے قرآن پڑھنے والے اور احادیث کو یاد کرنے والے مضبوط حافظے کے مالک تھے۔ 61 یا 62ھ میں فوت ہو گئے۔

قاضی صاحب نے سند پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: عمار بن محمد وہ تھے جو سفیان الثوری کے بھانجے تھے اور امام مسلم نے ان سے روایت کی ہے۔

ان کے بارے میں امام ابن حبان نے المجروحین (ج2 ص 189، رقم 838) میں لکھا ہے ان کی کنیت ابوالیقظان تھی اور اہل کوفہ میں سے تھے۔ اعمش اور الثوری سے روایت کرتے ہیں اور ان سے الحسن بن عرفہ اور عراقیوں نے روایت کی۔ كَانَ مِمَّنْ فَحُشَ خَطُؤهُ وَكَثُرَ وَهْمُهُ حَتّٰى اسْتَحَقَّ التَّرْكَ مِنْ اَجْلِهٖ۔ "وہ ان میں سے تھے کہ جن کی غلطی بری تھی اور ان کا وہم بہت زیادہ تھا۔ اسی کے سبب وہ چھوڑے

جانے کے مستحق ہیں۔"

امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج3ص168) میں چند تعریفی کلمات نقل کرتے ہوئے امام ابن حبان کے قول کے ساتھ امام بخاری کا یہ قول بھی نقل کردیا ہے:

عمار بن محمد مجهول حديثه منكر "عمار بن محمد مجہول ہے اور اس کی حدیث منکر ہے۔"

ابوحاتم سے بھی یہ بات آئی ہے: لَا يُحتَجُّ بِهٖ۔ "اس کی بات قابل حجت نہیں ہے۔"

چونکہ سفیان الثوری کے حوالے سے روایت کا ذکر ہوا ہے اس لیے ثقہ ائمہ ضعیف راوی سے روایت کیوں نقل کرتے ہیں۔ اس کی بھی وضاحت انہی کے حوالے سے کرنی زیادہ مناسب ہے۔

الکفایۃ (ص402) میں امام سفیان الثوری کا اپنا بیان ہے:

میں تین طرح سے حدیث روایت کرتا ہوں۔

1- میں کسی آدمی سے حدیث سنتا ہوں تو اس کو اپنا دین بنالیتا ہوں۔

2- میں کسی آدمی سے حدیث سنتا ہوں تو اس سے مروی حدیث سے واقف ہوجاتا ہوں۔

3- میں کسی آدمی سے حدیث سنتا ہوں تو اس کی معرفت مجھے محبوب ہوتی ہے یعنی بیان کرنے والے اور اس کی بیان کردہ حدیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا مجھے علم ہوجاتا ہے۔

پہلے بھی واضح کیا گیا ہے کہ کوئی جلیل القدر امام جب کسی کمزور راوی کی روایت کو قبول کرتا ہے تو اس سے کمزور راوی کی کمزوری دور نہیں ہوتی بلکہ امام کا بھی اپنا ایک مقصد ہوتا ہے جس کی وضاحت امام مسلم نے اپنی صحیح مسلم کے مقدمہ میں اور امام نووی نے اس کی شرح کے مقدمہ میں کردی ہے۔

قاضی صاحب نے دوسرے راوی الحسن بن عثمان الرمادی کا ذکر کیا ہے۔ عجیب

بات یہ ہے کہ اس نام کا کوئی راوی رجال کی کتابوں میں موجود نہیں۔ قاضی صاحب نے تاریخ بغداد کا جو حوالہ دیا ہے وہ الحسن بن عثمان ابوحسان الزیادی ہے۔ جس سے الزیادی نے سنا۔ ان میں عمار بن محمد کا ذکر نہیں ہوا اور جنہوں نے الزیادی سے سنا، ان میں ابوسہل بدر بن عبداللہ کا کوئی ذکر نہیں اور نہ قاضی صاحب کی پیش کردہ روایت کا ہی کوئی نشان ملتا ہے۔ چونکہ ابوحسان الزیادی شرقیہ کے قاضی تھے۔ شاید اسی لیے ان کا حوالہ دے دیا۔

بالفرض اس حوالے کو درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو ابوحسان الزیادی سے بیان کرنے والے کے بارے میں قاضی صاحب کا اپنا بیان ہے: مَا عَلِمتُ مِنْ حالہٖ شَیئًا۔ ''میں اس کے حال کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس بیان کے بعد روایت کی حیثیت کیا رہ گئی۔

قاضی صاحب کو بدر بن عبداللہ کے بارے میں کوئی علم نہ تھا لیکن ان کے ہمعصر اور ان کے بیٹے کے استاد اور فن رجال میں بلند مقام کے حامل امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج1 ص300 رقم 1135) میں لکھا ہے: عن الحسن بن عثمان الزیادی بِخَبَرٍ بَاطِلٍ وعنہ النعمان بن ھارون۔ ''الحسن بن عثمان الزیادی سے اس نے جھوٹی خبر نقل کی ہے اور اس سے نعمان بن ہارون کی روایت کی ہے۔'' بدر بن عبداللہ کے ترجمہ میں الزیادی کا ذکر تو کردیا لیکن ابن عثمان الزیادی کا ترجمہ چھوڑ کر ثابت کردیا کہ روایت بے اصل ہے۔

لسان المیزان (ج2 ص4) میں حافظ ابن حجر نے سند اور متن کو نقل کرنے کے ساتھ امام الذہبی والا قول نقل کیا ہے کہ خبر باطل ہے اور الحسن بن عثمان الزیادی کا ترجمہ لسان المیزان میں بھی مفقود ہے۔

نعمان بن ہارون کے بارے میں بھی امام الذہبی کے اس قول سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ بھی باطل خبر کو روایت کرنے والوں میں شریک ہیں یا ان کو شریک بنا دیا گیا ہے۔ رہی بات خطیب بغدادی کی تو نعمان بن ہارون کے ترجمہ میں الزیادی والا ہی

معاملہ ہے نہ روایت کا کوئی نشان اور نہ اوپر اور نیچے والے راوی کا کوئی ذکر ہوا ہے۔

پانچویں راوی ابوالفتح محمد بن حسین الازدی کے بارے میں تعریفی کلمات کے ساتھ خطیب بغدادی کی یہ عبارت بھی نقل کردی۔ ابوالنجیب الارموی نے کہا: میں نے دیکھا اہل موصل اس کو کمزور راوی سمجھتے اور اس کو کسی شمار میں نہیں لاتے تھے۔ برقانی سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے علاوہ دیگر نے ان کے بارے میں سخت رائے دی۔

تاریخ بغداد (ج2ص244) میں مذکور قاضی صاحب نے خطیب کی یہ بات چھوڑ دی: وَفِی حَدِیْثِہٖ غَرَائِبُ وَمَنَاکِیْرُ۔ ''اور اس کی حدیث میں غریب اور منکر روایات ہیں۔''

خطیب نے ان کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ وہ بغداد کے امیر ابن بویہ کے پاس آئے اور اس کے لیے ایک حدیث گھڑ دی۔

اِنَّ جِبْرَئِیْلَ کَانَ یَنْزِلُ عَلَی النَّبی صلّی اللہ علیہ وسلم فِی صُوْرَتِہٖ۔

''بے شک جبرائیل اس یعنی امیر کی صورت میں نبی کریم ﷺ پر نازل ہوتے تھے۔''

جس پر امیر نے اس کو بہت سے درہموں سے نواز دیا۔

البدایۃ والنہایہ (ج11ص303) میں حافظ ابن کثیر نے بھی اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد تعجب کا اظہار کیا ہے۔ ایسے وضاع کی روایت کو دلیل بنانا قاضی القضاۃ کو قطعاً زیب نہیں دیتا تھا۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

شفاء السقام کی دسویں حدیث

مَنْ زَارَنِی بَعْدَ مَوْتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ وَاَنَا حَیٌّ۔

''جس نے میری موت کے بعد میری زیارت کی تو اس نے گویا کہ میری زیارت اس حال میں کی کہ میں زندہ ہوں۔''

قاضی صاحب نے اس روایت کی سند پر تبصرہ کرتے ہوئے صرف ایک راوی خالد بن یزید کے بارے میں فرمایا ہے: اگر یہ العُمرِی ہے تو ان کی حدیث ابن حبان کے مطابق منکر ہوتی ہے۔ حالانکہ قاضی صاحب نے جو سند نقل کی ہے اس میں خالد بن یزید کا کہنا ہے: ہم سے عبداللہ بن العمری نے بیان کیا اور یہ خالد بن یزید آل عمر کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک ہے۔

قاضی صاحب کے تبصرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو خالد بن یزید کے حال سے پوری واقفیت نہ تھی اور یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ نیتوں کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ائمہ حدیث نے خالد بن یزید کے بارے میں جو کہا ہے وہ مختصراً عرض ہے:

-- کتاب الضعفآء الکبیر (ج2ص18) میں منقول ہے: یہ آل عمر کا آزاد کردہ غلام تھا۔ حدیث بیان کرنے میں غلطی کرتا ہے اور ثقہ راویوں سے وہ بیان کرتا ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔

-- الکامل (ج3ص889-890) میں ابن عدی نے نقل کیا ہے: اس کی عام روایت کردہ احادیث منکر ہیں اور وہ ضعیف الحدیث ہے۔

-- کتاب الجرح والتعدیل (ج2ص360) میں ابوزرعہ کا بیان ہے۔ میں نے اس سے احادیث لکھیں لیکن بیان نہیں کیں۔ یحیٰی بن معین سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: وہ کذاب ہے۔ ابن ابی حاتم کے والد محترم سے اس کے بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے کہا: میں مکہ آیا لیکن میں نے اس سے کچھ نہ لکھا کیونکہ وہ احادیث کو گول کرنے والا تھا۔

-- کتاب المجبروحین (ج1ص346، رقم305) میں امام ابن حبان کا کہنا ہے:
وہ ثقہ راویوں کے نام سے جھوٹی گھڑی ہوئی روایات بیان کرتا تھا۔

-- امام ابن حبان کا یہی قول امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج1ص646، رقم 2486) میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان (ج2ص389-390) میں نقل کیا ہے۔

لٰہذا یہ روایت بھی موضوعات وضعیف روایات میں سے ایک ہے۔

شفاء السقام کی گیارہویں حدیث

مَنْ زَارَنِی بِالْمَدِیْنَةِ مُحْتَسِبًا کُنْتُ لَهٗ شَفِیْعًا اَوْ شَهِیْدًا۔

"جس نے مدینہ میں میری زیارت ثواب کے حصول کی نیت سے کی تو میں اس کے لیے شفاعت کرنے والا یا گواہی دینے والا بن جاؤں گا۔"

دوسری روایت کے مطابق "جس نے اجروثواب کی امید رکھتے ہوئے میری زیارت کی مدینہ تک وہ قیامت کے روز میری ہمسائیگی میں ہوگا۔" شفیع یا گواہ ہونے کے ساتھ "قیامت کے دن" بھی مروی ہے۔

قاضی صاحب نے تین سندوں کو جمع کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ ان کا دارومدار محمد بن اسمٰعیل بن ابی فدیک اور سلیمان بن یزید پر ہے۔ سلیمان کا ذکر ابن حبان نے ثقات میں کیا ہے۔

ابوحاتم الرازی کا کہنا ہے: وہ منکر الحدیث اور مضبوط نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ابن حبان نے سلیمان بن یزید کا ذکر اَتباع تابعین میں کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے انس کو نہیں پایا، بلکہ تابعین سے روایت کیا کرتے تھے۔

عجیب بات ہے کہ ابن حبان نے ایک طرف سلیمان بن یزید کا ذکر ثقات میں کیا ہے اور دوسری طرف اپنی کتاب المجروحین کی دوسری جلد کے صفحہ 505 رقم 1264 میں ان کی کنیت ابوالمثنی کے تحت نقل کر کے کہا ہے: وہ ثقہ راویوں کی روایات کی مخالفت کرتا ہے لہٰذا اس کی روایت سے احتجاج پکڑنا جائز نہیں۔

یہی بات امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج2 ص228، رقم 3524) میں لکھی ہے یعنی جائز نہیں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب (ج12 ص221، رقم 1014) میں مخالفت اور احتجاج والی دونوں باتیں نقل کی ہیں بلکہ الدارقطنی کی العلل کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے: ضَعِیفٌ وَقَعَتْ رِوَایَتُہٗ عَنْ اَنَسٍ فِی کِتَابِ الْقُبُورِ لِابْنِ اَبِی الدُّنْیَا وَقِیْلَ اَنَّہٗ لَمْ یَسْمَعْ مِنْہُ۔ ”وہ ضعیف ہے اس کی ایک روایت انس سے ابن ابی الدنیا کی ”کِتَابُ الْقُبُورِ“ میں واقع ہوئی ہے اور کہا گیا ہے بلاشبہ اس نے انس سے سنا نہیں یعنی ان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“

شفاء السقام کی بارہویں حدیث

مَا مِنْ اَحَدٍ مِنْ اُمَّتِی لَہٗ سَعَةٌ ثُمَّ لَمْ یَزُرْنِی فَلَیْسَ لَہٗ عُذْرٌ

”میری امت میں سے کسی ایک کے لیے وسعت ہو مگر پھر بھی اس نے میری زیارت نہ کی تو اس کے لیے کوئی عذر نہ ہوگا۔“

قاضی صاحب نے سند حسب ذیل اپنی کتاب میں درج کی ہے۔

حافظ ابوعبداللہ محمد بن محمود ابن نجار نے اپنی کتاب ”الدرة الثمينة فی فضائل المدينة“ میں بیان کیا۔ ہمیں محمد بن علی نے، ان کو ابویعلی الازدی نے، ان کو ابواسحاق البجلی نے، ان کو سعید ابی سعید النیسا پوری نے خبر دی۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم سے ابراہیم بن

محمد المؤدب نے بیان کیا کہ ہمیں ابراہیم بن محمد نے خبر دی کہ ہم سے محمد بن محمد نے بیان کیا۔ ان کا کہنا ہے ہم سے محمد بن مقاتل نے بیان کیا کہ ہم سے جعفر بن ہارون نے بیان کیا۔ ان کا کہنا ہے ہم سے سمدان بن المہدی نے انس سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے میری زیارت اس حال میں کی کہ میں فوت شدہ تھا گویا کہ اس نے میری زیارت اس حال میں کی کہ میں زندہ تھا۔ جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے قیامت کے روز میری شفاعت واجب ہوگئی۔ میری امت میں سے کوئی ایک ایسا ہو کہ اس کے پاس وسعت ہو مگر اس نے پھر بھی میری زیارت نہ کی تو اس کے لیے کوئی عذر نہ ہوگا۔

اپنی کتاب کے پہلے باب میں پہلا موقع ہے کہ قاضی صاحب اپنے علمی تبحر کا مظاہرہ کئے بغیر آگے بڑھ گئے۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ یہ روایت موضوعات میں سے بدترین گھڑی ہوئی ہے جو احادیث کے مجموعہ میں اس سے لے لی گئی ہے جس کو سمعان سے منسوب کیا جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان (ج3 ص114) میں اس نسخہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ تین سو سے اوپر احادیث کا مجموعہ ہے اور اکثر احادیث کے متن گھڑے ہوئے ہیں۔ الجوزجانی نے اس مجموعہ سے ایک حدیث وارد کر کے کہا کہ وہ منکر ہے اور اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی مجہول ہیں۔ خادموں سے خدمت لینے کے لیے خدمت پر ملنے والے اجر پر جو روایات گھڑی گئی ان میں سے چند کا ذکر لسان المیزان میں ہوا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے بارے میں ملنے والے اجر اور زیارت نہ کرنے والے کی محرومیت پر وعید پر روایات بنانے والوں نے چند روایات بنائیں لیکن ائمہ حدیث نے حق کو باطل سے الگ کر دیا اور صحیح احادیث مبارکہ کو احادیث کی کتابوں میں جمع کر دیا۔

شفاء السقام کی تیرہویں حدیث

مَنْ زَارَنِی بِالْمَدِیْنَةِ حتّٰی یَنْتَھِیَ اِلٰی قَبْرِیْ کُنْتُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ شَهِیْداً اَوْقَالَ شَفِیْعًا۔

”جس نے مدینہ میں میری زیارت کی یہاں تک کہ وہ میری قبر تک پہنچا میں اس کے لیے قیامت کے روز گواہ یا آپ نے فرمایا: شفاعت کرنے والا ہو جاؤں گا۔“

قاضی السبکی صاحب نے یہ روایت امام ابو جعفر محمد بن عمرو العقیلی کی کتاب الضعفاء الکبیر (ج3 ص457 رقم 1513) سے نقل کی ہے اور ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ روایت ضعیف ہے اور کتاب الضعفاء میں اس کے ضعف کی وجہ سے منقول ہے۔ قاضی صاحب نے سند پر تبصرہ کرتے ہوئے خود لکھا ہے فضالۃ بن سعید کے بارے میں عقیلی نے کہا ہے ان کی حدیث محفوظ نہیں، لیکن پھر بھی اس کو اپنی کتاب میں شامل کر لیا۔ علوم الحدیث سے معمولی واقفیت رکھنے والا ایسا نہیں کر سکتا تھا مگر قاضی صاحب نے دلیل کے طور پر اس کا ذکر کر دیا۔ اس سے بھی ناقص دلیل ان کی دوسرے راوی محمد بن یحیٰی المازنی کے بارے میں ہے۔ امام ابن عدی کا قول الکامل کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ اس کی احادیث تاریک و منکر ہیں چونکہ مذکورہ احادیث الکامل میں منقول نہیں اور عقیلی نے فضالۃ کے بارے میں کچھ نہیں کہا، سوائے اس کے کہ راوی متفرد اور منکر ہے۔

ایسی دلیل قاضی قضاۃ تقی الدین السبکی کے علم حدیث اور فن رجال کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ کتاب کا مؤلف کہے کہ فضالۃ کی یہ حدیث فھکذا رَاَیْتُهٗ فِی کِتَابِ الْعُقَیلی۔ میں نے اسی طرح عقیلی کی کتاب میں دیکھا۔ پھر بھی حدیث میں کوئی عیب نظر نہ آئے۔ الکامل کے اعلان کے باوجود

محمد بن یحییٰ المازنی کو بے عیب ہونے کا تأثر دیں۔ ڈھٹائی کی انتہاء ہے کہ تاریخ ابن عساکر میں مذکور سند بھی نقل کرتے ہیں۔ ابن عساکر نے جو اضافہ کیا، وہ اور ابن عساکر نے فضالۃ ے بارے میں جو کہا، وہ بھی نقل کرتے ہیں:

لَا یُتَابَعُ عَلٰی حَدِیْثِہٖ مِنْ جِھَتِ تَثَبُّتٍ وَلَا یُعْرَفُ اِلَّا بِہٖ۔ ''اس کی حدیث کی متابعت غیر ثابت شدہ ہونے کی وجہ سے نہیں کی جائے اور وہ اسی حدیث کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔''

لیکن قاضی صاحب کسی کی بات سننے اور ماننے کے عادی نہ تھے بلکہ اپنی ہی کہی ہوئی بات کو حق اور سچ ثابت کرنے پر تلے رہتے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان (ج4 ص432 رقم 230) میں العقیلی کی تحقیق کو نقل کرنے کے ساتھ ابونعیم کا یہ قول بھی نقل کردیا۔ روی مناکیر لا شیء۔ اس نے منکر روایات روایت کیں، وہ کچھ بھی نہیں۔

قاضی صاحب کے ہمعصر اور ان کے بیٹے کے استاد امام الذہبی کی میزان الاعتدال (ج3 ص349 رقم 6709) میں منقول ہے: قُلْتُ ھٰذَا مَوْضُوْعٌ عَلٰی ابْنِ جُرَیجٍ۔ میں نے کہا: یہ ابن جریج پر گھڑی ہوئی روایت ہے۔ اس سے ثابت ہوا نہ صرف ضعیف ہے بلکہ من گھڑت بنائی ہوئی روایت ہے۔

شفاء السقام کی چودھویں حدیث

مَنْ لَمْ یَزُرْنِی فَقَدْ جَفَانِی۔

''جس نے میری زیارت نہ کی اس نے مجھ سے اعراض کیا۔''

مترجم نے اس کا معنی ظلم کیا ہے۔

اس روایت کی پہلی سند میں نعمان بن شبل ہے جس کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ

سے کئے گئے سوال میں پہلی حدیث یہی تھی چنانچہ اس پر تفصیلاً بحث ہوچکی ہے۔ امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج4ص265، رقم 9095) میں اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔

اس روایت کی دوسری سند میں ایک راوی عبدالملک بن ہارون بن عنترہ ہے جس کے بارے میں قاضی صاحب کا اپنا تبصرہ یوں ہے: اس پر بہت جرح کی گئی ہے۔ یحییٰ بن معین اور ابن حبان نے اس کو مجروح قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے اس کی حدیث کو منکر اور امام احمد بن حنبل نے ضعیف کہا ہے۔ اس تبصرہ کے بعد کسی اور تبصرہ کی ضرورت نہیں مگر ایک ضروری رائے پیش خدمت ہے۔

امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج2ص666، رقم 5259) میں یہ بھی نقل کیا ہے۔ الدارقطنی کا قول ہے: باپ بیٹا دونوں ضعیف ہیں۔ یحییٰ بن معین کا کہنا ہے وہ کذاب ہے۔ ابوحاتم نے کہا: وہ متروک ذاہب الحدیث ہے۔ ابن حبان کے مطابق وہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ السعدی کا قول ہے: عبدالملک بن ہارون، دجال وکذّاب ہے۔

امام الذہبی نے فیصلہ دیا: وہ احادیث گھڑنے سے متہم یعنی اس پر یہ تہمت ہے۔

شفاء السقام کی پندرہویں حدیث

مَنْ اَتَی الْمَدِیْنَةَ زَائِرًا لِیْ وجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِی یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَمَنْ مَاتَ فِی اَحَدِ الْحَرَمِیْنِ بُعِثَ اٰمِنًا۔

”جو مدینہ میری زیارت کے لیے آیا۔ قیامت کے روز میری شفاعت اس لیے واجب ہوئی اور جو دونوں حرمین میں سے کسی ایک حرم میں فوت ہوا تو وہ مامون اٹھایا جائے گا۔“

علامہ تقی الدین السبکی نے اس روایت کی سند یا سند میں کسی راوی پر کوئی تبصرہ نہیں فرمایا۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اس روایت کا حال بھی مذکورہ روایات سے مختلف نہیں اور اس کے پہلے حصے کا تفصیلاً ذکر حدیث نمبر 11 اور 13 میں ہو چکا ہے اور دوسرے حصے کا ذکر بھی حدیث نمبر 8 میں ہوا ہے۔

انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر کی زیارت کے بارے میں جو ذکر بے حوالہ کیا ہے اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ ان میں سے بھی کوئی حدیث صحیح نہیں۔

خلاصۂ کلام

شفاء السقام کے پہلے باب میں پندرہ احادیث اور اُن کی تائید وتصدیق میں جن سندوں اور روایات کو دلیل بنایا گیا ہے ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو صحت کے اعتبار سے ائمہ حدیث کے نزدیک صحیح یا حسن ہو، علامہ السبکی نے جو اصول اپنایا ہے کہ متعدد کمزور روایات مل کر صحیح یا حسن بن جاتی ہیں، یہ درست نہیں۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر صحیح اور حسن احادیث کی اہمیت کیا رہ جائے گی۔

ڈاکٹر صبحی صالح نے بڑی اچھی بات کہی کہ جب ہمارے پاس صحیح احادیث کا ذخیرہ موجود ہے تو فضائل اعمال میں ضعیف وموضوع روایات کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے۔

علامہ تقی الدین السبکی نے جتنی محنت ضعیف وموضوع روایات کو جمع کرنے میں کی ہے۔ اس میں سے صرف دو فیصد صحیح احادیث کو اجاگر کرنے میں صرف کرتے تو امت میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوتا۔

علامہ السبکی کی روایات کو جمع کیا جائے تو اس کا خلاصہ یہ سامنے آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرنے کا موقع ملے تو ضرور کرنی چاہئے۔ یہ اجر وثواب

کا سبب اور ذریعہ ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف صرف طریقہ کار میں ہے۔ علامہ صاحب کا موقف ہے کہ قبر مبارک کی زیارت کی نیت سے سفر کرنے میں اجر وثواب اور ذریعہ شفاعت ہے۔ جبکہ دوسروں کا کہنا ہے کہ صحیح حدیث کے مطابق سفر کی نیت مسجد نبوی ہونی چاہئے۔ مسجد میں تحیۃ المسجد پڑھنے کے بعد قبر مبارک پر جاکر درود وسلام کہا جائے۔ ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ، اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی سلام کہا جائے۔ مسجد نبوی کی نیت سے سفر کرنے والوں کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہونا اور آپ کے لیے مقام محمود اور وسیلہ کے حصول کی دعا کرنا ویسے ہی مستحب ہے جیسے قبر مبارک کی نیت سے سفر کرنے والوں کے نزدیک مستحب ہے۔

بات تو بڑی معمولی تھی، لیکن امام تیمیہؒ کی مخالفت میں بہت دور چلی گئی اور اب ایسی گروہ بندی وجود میں آچکی ہے جس کی وجہ سے نئی نسل مشکلات کا شکار ہو رہی ہے۔ طاغوتی طاقتوں نے ان کو دین سے دور کرنے کے پرکشش جال پھیلا دیئے ہیں۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

شفاء السقام میں مذکورہ احادیث کا جائزہ لینے اور ائمہ حدیث کے قائم کردہ اصول کے مطابق پرکھنے میں ترتیب میں تبدیلی کی وجہ مضامین کے اعتبار سے ہوئی ہے۔

❁❁❁

۵

شفاء السقام کا دوسرا باب

شفاء السقام کے دوسرے باب میں ان اخبار و احادیث کا ذکر ہوا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کی فضیلت پر دلیل تو ہیں لیکن ان میں زیارت کا لفظ مذکور نہیں۔

قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی نے سیدھی سی بات کو الجھانے اور تاویلات کا سہارا لینے کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ وہ جن روایات کے ضعف سے واقف ہوتے ہیں اس کا ذکر کرنے کے باوجود ان کو دلیل بھی بناتے ہیں۔ یہ چیز ائمہ حدیث کے نزدیک درست نہیں۔

پہلی دلیل

سنن ابی داؤد (کتاب المناسك: باب زيارة القبور ص 279) میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَا مِنْ اَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَيَّ رُوْحِيْ حَتّٰى اَرُدَّ عَلَيْهِ۔ ''جب کوئی مجھے سلام کرے گا تو اللہ میری روح لوٹا دے گا یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دوں گا۔''

اس حدیث کی سند میں امام ابوداؤد نے حسب ذیل راویوں کا ذکر کیا ہے:

محمد بن عوف، المقریٔ، حَیْوَۃ، ابوصخر حمید بن زیاد اور یزید بن عبداللہ بن قُسَیط......

قاضی القضاۃ صاحب نے خود ہی ان راویوں میں سے ایک راوی ابوصخر حمید بن زیاد کے بارے میں ابن معین کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ ساتھ ہی یہ

وضاحت بھی کردی کہ اس روایت کو نقل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ قبر مبارک پر جا کر جو سلام کہتا ہے اس کو ہی جواب ملتا ہے اور اس کی فضیلت دور سے سلام کہنے والوں سے زیادہ ہے۔ حالانکہ امام ابوداؤد نے اس روایت کے ساتھ دوسری حدیث بھی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کردی ہے کہ جس سے دور و نزدیک کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا تَجۡعَلُوا بُیُوتَکُمۡ قُبُورًا وَّ تَجۡعَلُوا قَبۡرِیۡ عِیۡدًا وَّصَلُّوا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلٰوتَکُمۡ تَبۡلُغُنِیۡ حَیۡثُ کُنۡتُمۡ۔

”اپنے گھروں کو قبریں نہ بنانا یعنی اپنے گھروں کو قبرستان کی طرح نہ بنالینا کہ ان میں نفلی نمازیں پڑھنا ترک کردو اور نہ ہی میری قبر کو عید یعنی عرس گاہ بنالینا اور مجھ پر درود بھیجتے رہنا۔ بے شک تمہارا درود جہاں بھی تم ہوگے وہاں سے مجھے پہنچے گا۔“

درود و سلام کا معنی اور اس کی فضیلت

یوں امام ابوداؤد نے دونوں حدیثوں کو نقل کرکے درود و سلام کو زیارت کے ساتھ خاص کرنے کی نفی کردی۔ سورۃ الاحزاب میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا(۵۶)

”بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجا کرو اور سلام بھی بھیجا کرو۔“

اس آیت مبارکہ میں خبر یہ ہے کہ اللہ اور فرشتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے ہیں اور حکم یہ ہے: اے ایمان والو! تم بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا کرو۔

اس خبر اور حکم سے ہر مسلمان پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام بھیجتا رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی حکم فرماتے ہوئے یقین دلایا کہ جہاں سے بھی تم درود بھیجو گے وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔

امام بخاری نے کتاب التفسیر: سورۃ الاحزاب (ص 707) میں ابو العالیہ سے نقل کیا ہے: صَلَاۃُ اللّٰہِ ثَنَائُہٗ عَلَیْہِ عِنْدَالْمَلَائِکَۃِ وَصَلَاۃُ الْمَلَائِکَۃِ الدُّعَاء۔ اللہ کی صلاۃ سے مراد فرشتوں کے سامنے آپ کی ثناء کرنا ہے۔ اور فرشتوں کی صلاۃ سے مراد آپ کے لیے دعا کرنا ہے۔ ابن عباسؓ کے مطابق صلاۃ اللہ سے مراد اللہ کی رحمت ہے۔

صحیح بخاری (کتاب الدعوات باب الصلاۃ علی النبی ﷺ: رقم 6357)، صحیح مسلم (کتاب الصلوۃ ج1 ص175) میں کعبؓ بن عجرہ سے مروی ہے: ہم نے عرض کیا۔ اللہ کے رسول! آپ پر سلام کرنے کا طریقہ تو ہم نے جان لیا ہے آپ پر درود کیسے بھیجیں یعنی اس کے الفاظ کیا ہونے چاہئیں۔ آپ نے فرمایا: کہو! اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

"اے اللہ! محمد ﷺ اور ال محمد ﷺ پر رحمت نازل فرما جس طرح تو نے ال ابراہیم علیہ السلام کو رحمت سے نوازا۔ بے شک تو تعریف کیا گیا بزرگی والا ہے۔ اے اللہ! محمد ﷺ اور ال محمد ﷺ کو برکت سے نواز جیسے تو نے آل ابراہیم علیہ السلام کو برکت سے نوازا۔ بے شک تو تعریف کیا گیا بزرگی والا ہے۔"

اگلی حدیث جو ابو سعید الخدری سے مروی ہے۔ اس میں اِبْرَاھِیْمَ بھی مذکور ہے۔

فتح الباری (ج11 ص155)، ارشاد الساری للقسطلانی (ج9 ص204)،

عمدۃ القاری للعینی (ج19ص126) میں منقول ہے کہ یہ سوال نماز میں تشہد کے بارے میں تھا۔ کیونکہ تشہد میں کہا جاتا ہے: اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔ اے نبی! آپ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت و برکات ہوں۔

سلامٌ علیک کی وضاحت

تشہد میں کہا جانے والا سلام وہ نہیں ہوتا ہے جو دو مسلمان ملتے ہوئے ایک دوسرے کو کہتے ہیں۔ سَلَامٌ۔ سَلِمَ یَسْلَمُ کا مصدر ہے کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا معنی ظاہری اور باطنی آفات سے پاک اور محفوظ رہنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپس میں ملنے والے ایک دوسرے کو سلامتی کا تحفہ دیتے ہیں یعنی ایک دوسرے کے لیے سلامتی کی نیک خواہش وتمنا کا اظہار کرتے ہیں یا دعا دیتے اور لیتے ہیں۔

جبکہ نماز میں رسول اللہ ﷺ کے لیے اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ حکایۃً کہا جاتا ہے بلکہ عبادت کے طور پر اس عظیم سلامتی کے تحفہ کی یاد کو تازہ کیا جاتا ہے جو معراج کی رات آپ کو اللہ کی طرف سے ملا اور آپ سے پہلے مبعوث ہونے والے رسولوں کے بارے میں سورۃ الصافات میں سبحانہ تعالیٰ نے خود ذکر فرمایا:

﴿سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ (۷۹)﴾ ”جہانوں میں نوح علیہ السلام پر سلامتی ہو۔“

﴿سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ (۱۰۹)﴾ ”ابراہیم علیہ السلام پر سلامتی ہو۔“

﴿سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ (۱۲۰)﴾ ”موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر سلامتی ہو۔“

﴿سَلٰمٌ عَلٰۤی اِلْ یَاسِیْنَ (۱۳۰)﴾ ”الیاس علیہ السلام پر سلامتی ہو۔“

﴿وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ (۱۸۱)﴾ ”اور تمام بھیجے گئے رسولوں پر سلامتی ہو۔“

اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت و برکت تھی کہ اس نے اپنے رسولوں کو سلامتی سے نوازا۔ سورۃ

یونس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اللّٰهُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (۲۵)﴾

''اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے۔''

سورۃ الانعام میں صراط مستقیم کو اپنانے اور اللہ کی آیات کی روشنی میں نصیحت حاصل کرنے والوں کو بشارت دی گئی۔:

﴿لَهُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَ هُوَ وَلِیُّهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۱۲۷)﴾

''ان کے لیے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہوگا اور وہ ان کا اس کے سبب ولی ودوست ہوگا کہ جو وہ کیا کرتے تھے۔''

لہٰذا معلوم ہوا کہ سلام درحقیقت دعائیہ کلمہ ہے جس میں سلامتی، بخشش اور رحمت شامل ہوتی ہے۔ اس کی مزید وضاحت قاضی القضاہ تقی الدین السبکی صاحب ہی کے دو حوالوں سے ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ایک قاضی اسمٰعیل کا حوالہ یوں ہے:

نبی کریم ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا: مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جب تو مسجد میں داخل ہوا کرے تو کہا کر: بِسۡمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِ اللّٰهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَاغۡفِرۡلَنَا وَسَهِّلۡ لَنَا اَبۡوَابَ رَحۡمَتِكَ فَاِذَا فَرَغۡتِ فَقُوۡلِی مِثۡلَ ذٰلِكَ غَیۡرَ اَنۡ قُوۡلِی سَهِّلۡ لَنَا اَبۡوَابَ فَضۡلِكَ۔

''اللہ کے نام کے ساتھ اور سلامتی ہو رسول اللہ ﷺ پر۔ اے اللہ! محمد ﷺ پر رحمتیں نازل فرما اور ہمیں بخش دے اور ہمارے لیے اپنی رحمت کے دروازوں

(میں داخل ہونا) آسان کردے۔ جب تو نماز سے فارغ ہو جائے تو پہلی دعا کے ساتھ یہ بھی کہا کر: ہمارے لیے اپنے فضل کے دروازے بھی آسان کردے۔

اس روایت میں فاطمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا وہ آپ کا حکم تھا۔ جس کے لیے فعل قَالَ یَقُولُ سے امر واحد مؤنث کا صیغہ قُولِیْ استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیٹی نے باپ کے حکم کے مطابق عمل کیا ہوگا لیکن یہ کہیں بھی منقول نہیں کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے اپنے باپ سید الانبیاء ﷺ کے لیے سلامتی اور رحمت کی دعا کرتیں اور ان کے باپ جہاں بھی ہوتے اس کا جواب دیا کرتے تھے۔

دوسرا حوالہ قاضی صاحب نے ابن ماجہ (باب الدعاء عند دخول المسجد) کا دیا جس کے مطابق فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تو فرماتے:

بِسْمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَاِذَا خَرَجَ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ فَضْلِكَ۔

"اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ کے رسول پر سلام ہو۔ اے اللہ! میرے لیے میرے گناہ معاف کردے اور اپنی رحمت کے دروازے میرے لیے کھول دے۔ اور جب آپ مسجد سے نکلتے تو دعا کرتے: اللہ کے نام کے ساتھ اور سلام ہو اللہ کے رسول پر۔ اے اللہ! میرے لیے میرے گناہ معاف کردے اور میرے لیے اپنے فضل کے دروازے کھول دے۔"

پھر قاضی القضاۃ صاحب نے لکھا ہے: فاطمہ رضی اللہ عنہا تک سند دو طریقوں سے پہنچتی ہے جس میں انقطاع ہے۔ یعنی دونوں حدیثیں صحت کے اعتبار سے صحیح نہیں اور مختار یہی ہے کہ جس طرح تشہد میں کہا جاتا ہے: اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ۔ اسی طرح کہے۔ ان

حدیثوں کا حوالہ دینے کا مقصد یہ تھا کہ یہ سلام خطاب اور غیب دونوں کے لیے ہے۔

قاضی القضاۃ صاحب عموماً کسی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے غیر ضروری لمبی سندیں نقل کرتے ہیں لیکن فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ کی دونوں حدیثوں کی سندوں کو گول کردیا اور اقرار کرلیا کہ سندوں میں انقطاع ہے جبکہ امام ترمذی نے اس کی وضاحت کردی۔

جامع الترمذی (ابواب الصلوٰۃ: باب مایقول عند دخول المسجد ج1 ص56) میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے جو سند نقل کی ہے اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بیٹی فاطمہ کے بیٹے عبداللہ نے اپنی ماں فاطمہ سے اور انہوں نے اپنی دادی فاطمہ الکبری بنت رسول ﷺ سے مذکورہ حدیث بیان کی۔ امام ترمذی نے لکھا ہے: لَیْسَ اِسْنَادُہٗ بِمُتَصِلٍ وَ فَاطِمَۃُ ابْنَۃُ الْحُسَیْنِ لَمْ تُدْرِکْ فَاطِمَۃَ الْکُبْریٰ اِنَّمَا عَاشَتْ فَاطِمَۃُ بَعْدَ النَّبِیِّ ﷺ اَشْھُراً۔ ''اس حدیث کی سند متصل نہیں کیونکہ حسین کی بیٹی فاطمہ نے اپنی دادی فاطمہ الکبری کو نہیں پایا۔ بلاشک وشبہ وہ نبی کریم ﷺ کے بعد چند ماہ ہی زندہ رہیں۔''

سند کا معاملہ تو الگ رہا۔ سوال اس منقطع حدیث کے حوالے سے یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مسجد میں داخل ہوتے یا باہر نکلتے ہوئے اپنے آپ پر سلام کہتے تھے تو اس کا جواب کون دیا کرتا تھا۔

مترجم کا کمال

تعصب یا مسلکی مجبوری بھی کیا چیز ہے کہ اچھا خاصا دیندار بھی ضعیف حدیث کے ضعف سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے باوجود اس کو دلیل بنانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا اور نہ حق کو چھپانا ہی معیوب سمجھتا ہے۔

قاضی صاحب نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے منسوب حدیثوں کے منقطع ہونے کا اقرار کیا۔

مترجم نے اس کو حذف کر دیا بلکہ ابن ماجہ کے علاوہ ابوداؤد کا حوالہ بھی لگا دیا۔ حالانکہ ابوداؤد میں یہ حدیث مروی نہیں ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے منسوب یہ روایت مسند احمد (ج6 ص283-284) میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ترجمہ میں تین طرق سے منقول ہے جن میں لیث، عبداللہ بن فاطمہ اور فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہ راوی ہیں۔ اس کے باوجود قاضی صاحب نے سند کے منقطع ہونے کا اعتراف کیا ہے اس سے واضح ہوا کہ مسند احمد کی کسی روایت میں استشھاداً جگہ پانے سے کسی راوی کا ضعف اس کی ثقاہت میں تبدیل نہیں ہوتا۔

حیات وممات کی وضاحت

قاضی تقی الدین السبکی نے پورا زور صرف ایک ہی مقصد پر لگایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات وممات میں کوئی فرق نہیں لیکن انہوں نے اس کو درود وسلام تک محدود رکھا ہے حالانکہ جب ایک کلیہ کو اپنا لیا جائے تو پھر اس میں تخصیص کیسے ہوگی۔ جہاں تک عالم برزخ کا تعلق ہے اس میں تو سب فوت ہونے والوں کی اپنی ایک زندگی ہوتی ہے جیسے شہداء کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ ال عمران میں خود فرمایا ہے:

﴿بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (۱۶۹)﴾

''بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں۔''

سورۃ البقرۃ میں اس زندگی کی کیفیت کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے:

﴿وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۱۵۴)﴾ ''لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔''

برزخی زندگی کی حقیقت کے بارے میں حضرت علی کا بڑا خوبصورت قول نہج البلاغہ (شرح الشیخ محمد عبدہ: ج4 ص31) میں یوں منقول ہے۔ جنگ صفین سے واپسی

پر کوفہ کے قبرستان کو دیکھ کر انہوں نے کہا:

یَا اَهْلَ الدِّیَارِ الْمُوحِشَةِ وَالْمَحَالِّ الْمُقْفِرَةِ وَالْقُبُوْرِ الْمُظْلِمَةِ یا اهل التُّرْبَةِ یَا اَهْلَ الْغُرْبَةِ یَا اَهْلَ الْوَحْدَةِ یَا اَهْلَ الْوَحْشَةِ اَنْتُمْ لَنَا فَرَطٌ سَابِقٌ وَّ نَحْنُ لَكُمْ تَبَعٌ لَّاحِقٌ اَمَّا الدُّوْرُ فَقَدْ سُكِنَتْ وَاَمَّا الْاَزْوَاجُ فَقَدْ نُكِحَتْ فَاَمَّا الْاَمْوَالُ فَقَدْ قُسِمَتْ هٰذَا خَبَرُ مَا عِنْدَنَا فَمَا خَبَرُ مَا عِنْدَكُمْ ثُمَّ الْتَفَتَ اِلٰى اَصْحَابِهٖ فَقَالَ اَمَا لَوْ اُذِنَ لَهُمْ فِي الْكَلَامِ لَاخْبَرُوْكُمْ اَنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔

’’اے دیارِ وحشت اور ویران جگہوں اور اندھیری قبروں والو! اے مٹی و مسافری اور تنہائی و وحشت والو! تم ہم سے آگے جانے والے ہو اور ہم تمہارے پیچھے آکر تم سے ملنے والے ہیں۔ جہاں تک تمہارے گھروں کا تعلق ہے وہ تو آباد کر دیئے گئے۔ تمہاری بیویوں کے اوروں سے نکاح کر دیئے گئے۔ تمہارے مال تقسیم کر دیئے گئے۔ یہ خبر تو ہمارے پاس ہے تم بتاؤ تمہارے پاس کیا خبر ہے؟ پھر انہوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا: اگر ان کو کلام کرنے کی اجازت ہوتی تو تمہیں خبر دیتے بے شک بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔‘‘

شرح الشیخ محمد عبدہ (ج 1 ص 219-220) میں منقول خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دنیا سے رخصت ہونے والوں کے بارے میں کیا ہی خوب فرمایا:

جان لو حالانکہ تم جانتے ہو کہ تم ایک دن اس دنیا کو چھوڑ کر اس سے رخصت ہونے والے ہو، لہٰذا ان لوگوں سے عبرت حاصل کرو جو کہتے تھے۔ ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے لیکن ان کو اٹھا کر قبروں کی طرف لیجایا گیا۔ ان کو سوار ہونے کے لیے نہیں کہا گیا بلکہ ان کو قبروں میں اتار دیا گیا۔ ان کو مہمانوں کے طور پر بلایا نہ گیا بلکہ زمین میں ان کی قبریں بنائی گئیں اور مٹی کو ہی ان کے کفن بنا دیئے گئے۔ گلی ہوئی

ہڈیوں کے وہ ہمسائے ہوگئے۔ اب وہ نہ کسی پکارنے والے کو جواب دے سکتے ہیں اور نہ کسی کی مصیبت کو دور کرسکتے ہیں نہ ان کو نوحہ و ماتم کی کوئی پرواہے۔ انہیں کچھ دیا جائے تو خوش نہیں ہوتے اور نہ دیا جائے تو مایوس نہیں ہوتے۔ الگ الگ ہونے کے باوجود اکٹھے ہیں۔ پڑوسی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے دور ہیں نزدیک ہیں مگر ایک دوسرے سے ملاقات نہیں کرسکتے۔ قریب ہیں لیکن قربت سے محروم ہیں۔ ایسے حلیم ہیں کہ ان کے کینے دور ہو چکے ہیں۔ اتنے بے حس ہیں کہ عداوتوں کو بھول چکے ہیں۔ اب ان سے کسی ایذا رسانی کا خوف نہیں کیا جاسکتا اور نہ مخالفت کی امید ہی کی جاسکتی ہے۔

انہوں نے زمین کی پیٹھ کو اس کے پیٹ سے، کشادگی کو تنگی سے، اہل و عیال کو غربت و تنہائی سے اور روشنی کو تاریکی سے بدل لیا ہے (پہلے انسان کی صورت میں) جس طرح زمین کو چھوڑا تھا۔ اسی طرح پھر سے ننگے پاؤں اور لباس اتارے ہوئے اس میں پہنچ گئے ہیں۔ اس سے اپنے اعمال کا توشہ لے کر دائمی زندگی بسر کرنے کے لیے جاودانی گھر کی طرف کوچ کر گئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء میں فرمایا ہے:

﴿كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُۥ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَآ ۚ إِنَّا كُنَّا فَٰعِلِينَ (۱۰۴)﴾

"جس طرح آغاز تخلیق میں ہم نے پیدا کیا تھا اسی طرح انہیں پھر لوٹائیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے ہم یہ یقیناً کریں گے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مذکورہ ارشاد سے ثابت ہوا کہ اہل قبور زندہ لوگوں کے لیے کچھ نہیں کرسکتے بلکہ وہ خود دعا کے محتاج ہوتے ہیں۔

دعا کی فضیلت

اللہ تعالیٰ کا عظیم فضل و کرم یہ ہے کہ جو کسی کے لیے نیک دعا کرتا ہے اس کو اللہ اجر سے نواز دیتا ہے کیونکہ دعا کے لیے اللہ کو پکارنا عین عبادت ہے۔

سورۃ المومن یعنی غافر میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (٦٠)﴾

"اور تمہارے رب نے فرمایا: مجھے پکارو، میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب وہ ذلیل و رسوا ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔"

اس کی مزید وضاحت سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمائی:

﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (١٨٦)﴾

"جب بھی کوئی مجھے پکارنے والا پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔"

یہاں ایک عجیب نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کا یقین دلاتے ہوئے یہ قید نہیں لگائی کہ دعا مانگنے والا حقیقی پرہیز گار ہی ہو۔ بلکہ دعا کے معاملے کو عام کر دیا۔

ایک لونڈی کا واقعہ

صحیح بخاری (باب نوم المرأۃ فی المسجد: کتاب الصلوٰۃ ص 62-63، ایضاً باب ایام الجاھلیۃ ص 541) میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ کسی عرب قبیلے کی آزاد کردہ سیاہ لونڈی میرے پاس جب بھی آتی تو یہ شعر کہا کرتی تھی:

يَوْمُ الْوِشَاحِ مِنْ تَعَاجِيْبِ رَبِّنَا

اَلَا اِنَّهٗ مِنْ بَلْدَةِ الْكُفْرِ اَنْجَانِیْ

یوم الوشاح ہمارے رب کے عجائبات میں سے ہے۔ آگاہ ہو جاؤ، اس نے مجھے کفر والے شہر سے نجات دے دی۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کا کہنا ہے کہ میں نے اس سے کہا: جب بھی تو آتی ہے یہ شعر کہتی ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ تو اس نے بتایا وہ ایک قبیلے کے پاس لونڈی تھی۔ انہوں نے اس کو آزاد کر دیا لیکن وہ انہی کے پاس رہتی تھی۔ ایک دن ایک لڑکی کو نہلانے کے لیے گئی۔ اس کا ہیروں سے مرصع چمڑے کا کمر بند تھا جو نہانے سے پہلے اس نے اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ ہم اپنے کام میں مصروف تھیں کہ چیل آئی اور اس نے اس کو گوشت سمجھ کر اچک لیا۔ بعد میں ہم نے اس کمر بند کو تلاش کیا تو ہمیں نہ ملا اور قبیلہ والوں نے سمجھا۔ میں نے اس کو چرایا یا آگے پیچھے کر دیا۔ انہوں نے خوب اچھی طرح میری تلاشی لی، جب کمر بند نہ ملا تو مجھے مارنے کے لیے باہر لے گئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری (ج 1 ص 534) میں دلائل النبوۃ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ جب میں نے اپنے آپ کو انتہائی مشکل حالات میں پایا تو اللہ کو پکارا اور مدد کے لیے دعا کی۔

بخاری کے الفاظ ہیں۔ وہ چیل آئی اور اس نے وہ مرصع کمر بند قبیلہ والوں کے درمیان میں پھینک دیا۔ لونڈی کا بیان ہے: میں نے ان سے کہا: یہ ہے وہ کمر بند کہ جس کے بارے میں تم نے مجھ پر الزام لگایا اور مجھے مارنے پیٹنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئی اور اس کی جھونپڑی مسجد میں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مطابق اس لونڈی کی دعا اس وقت قبول کی جب وہ

مسلمان نہ تھی۔ لیکن اس نے اپنے رب کو خالصتاً پکارا اور اس کے رب نے اس کی مدد فرمائی۔

غیر موجود بھائی کے لیے دعا کی قبولیت

جب کسی ایسے بھائی کے لیے دعا کی جاتی ہے جو سامنے موجود ہو تو اس دعا میں کئی قسم کے عنصر شامل ہو سکتے ہیں لیکن جب کسی بھائی یا عزیز کے لیے اس کی غیر موجودگی میں دعائے خیر کی جائے تو اس میں اخلاص کا عنصر ہی غالب ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ عنداللہ ایسے قبول ہوتی ہے کہ دعا کرنے والے کو اور جس کے لیے کی جاتی ہے، دونوں کو خیر سے نواز دیا جاتا ہے۔

صحیح مسلم (کتاب الذکر و الدعا ج 2 ص352)، سنن ابن ماجه (کتاب المناسك: باب فضل دعاء الحاج ص208)، مسند احمد (ج6 ص452، ج5 ص195) میں صفوان بن عبداللہ بن صفوان سے مروی ہے: حضرت ابوالدرداء کی بیٹی ان کی بیوی تھی۔ اس کو ملنے کے لیے جب ان کے گھر آئے تو ابوالدرداء گھر میں موجود نہ تھے۔ ام الدرداء نے کہا اس سال کیا تم حج کے لیے جا رہے ہو۔ انہوں نے کہا: ہاں۔ ام الدرداء نے کہا تو پھر ہمارے لیے خیر کی دعا کرنا کیونکہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے: جو آدمی اپنے اس بھائی کے لیے دعا کرتا ہے جو اس سے دور غائب ہوتا ہے تو اس کی دعا قبول کی جاتی ہے بلکہ اس کے سر کے پاس ایک فرشتہ نہ صرف اس کی دعا پر امین کہتا ہے بلکہ وہ یہ دعا کرتا ہے کہ اس کی مثال تمہارے لیے بھی ہو۔

جب ایک بھائی کی دعا پر ایک فرشتہ مقرر ہو جاتا ہے تو سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے کی جانے والی دعا پر فرشتوں کی تقرری کیوں نہ ہو گی۔

درود وسلام کے لیے حاضری شرط نہیں

اللہ تعالیٰ نے درود وسلام کا اہل ایمان کو حکم دیتے ہوئے یہ شرط عائد نہیں کی کہ اس کے لیے قبر مبارک پر حاضری ضروری ہے۔ علامہ قاضی القضاۃ السبکی نے اسی کو باعث فضیلت بنانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلہ میں ان کو ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم اور خلفائے راشدین میں سے حضرت ابن عمر اور عمر بن عبدالعزیز کا معمول ہی ملا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ تو خود سلام کرتے اور چلے جاتے لیکن عمر بن عبدالعزیز قاصد کے ذریعے سلام بھیجا کرتے تھے۔ محترم قاضی القضاۃ نے یہ حوالہ کہیں نہیں دیا کہ دونوں نے کہا ہو کہ ان کو ان کے سلام کا جواب موصول ہوتا تھا بلکہ دونوں ہی سلامتی کا تحفہ پیش کیا کرتے تھے اور اللہ سے اجر پایا کرتے تھے کیونکہ صحیح مسلم (کتاب الصلوٰۃ: باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ بعد التشهد: ج1ص175) میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَةً صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْراً۔

”جس نے میرے لیے ایک مرتبہ رحمت کی دعا کی تو اللہ اس کو دس مرتبہ رحمت سے نوازتا ہے۔“

یہ روایت ابن حبان (ج 2ص 77)، سنن النسائی (ج1ص 152، رقم 1298) جامع الترمذی (ج1ص90) میں بھی منقول ہے بلکہ سنن النسائی میں یہ بھی مروی ہے: حُطَّتْ عَنْهُ عَشْرُ خَطِيئَاتٍ وَ رُفِعَتْ لَهٗ عَشْرُ دَرَجَاتٍ۔ ”اس کے دس گناہ گرا دیے جاتے ہیں اور اس کے دس درجے بلند کر دیے جاتے ہیں۔“

جبکہ ترمذی کے الفاظ ہیں: كُتِبَ لَهٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ۔ ”اس کی دس نیکیاں لکھ لی

جاتی ہیں۔" مسند احمد (ج 2 ص 187) میں عبداللہ بن عمرو سے موقوفاً مروی ہے۔ جس نے رسول اللہ ﷺ پر ایک مرتبہ درود بھیجا تو اللہ اور اس کے فرشتے اس پر ستر مرتبہ درود بھیجتے ہیں۔ یعنی اللہ ستر مرتبہ اس کو اپنی رحمت سے نوازتا ہے اور فرشتے اس کے لیے ستر مرتبہ دعا و استغفار کرتے ہیں۔

سورۃ المومن میں تو اہل ایمان کے لیے بہت بڑی بشارت ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

﴿الَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (٧)﴾

وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے آس پاس ہیں وہ سب اپنے رب کی رحمت کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے لیے استغفار کرتے ہیں جو ایمان لائے اور عرض کرتے ہیں. اے ہمارے رب! تو اپنے علم و رحمت سے ہر چیز کو وسعت میں لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا بخش دے ان کو جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ کی اتباع کی اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچالے۔

جامع الترمذی (ج 2 ص 82، ابواب صفة القیامة) میں ابیؓ بن کعب سے مروی ہے: انہوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! میں اکثر آپ ﷺ پر درود بھیجتا ہوں اس میں سے کتنا حصہ مقرر کرلوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جتنا چاہے مقرر کرلے۔ انہوں نے عرض کیا: ایک چوتھائی مقرر کرلوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جتنا چاہے کرلے، زیادہ کرے گا تو تیرے لیے بہتر ہوگا۔ انہوں نے عرض کیا: تو آدھا کئے لیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جتنا چاہے کرلے، زیادہ کرے گا تو تیرے لیے بہتر ہوگا۔ انہوں نے پھر عرض کیا تو دو تہائی مقرر کئے لیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جتنا چاہے

کرلے اگر زیادہ کرے گا تو تیرے لیے بہتر ہوگا۔ انہوں نے عرض کیا تو دعا و استغفار والے وقت کو درود ہی کے لیے کرلیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: إِذًا تُكْفَى هَمُّكَ وَيُغْفَرُ ذَنْبُكَ۔ ''پھر تمہارے تمام فکر و تفکرات کی کفایت کردی جائے گی اور تمہارے گناہوں کو بخش دیا جائے گا۔''

جب صحیح اور مسند احادیث سے انسان کا معاملہ درست ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت نصیب ہوجاتی ہے تو پھر ضعیف و موضوع احادیث سے اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنا اور ذہنوں میں الجھاؤ پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

علامہ السبکی نے بھی قاضی اسمٰعیل کے حوالے سے ایک روایت اللہ کے خود درود و سلام بھیجنے والے کو جواب دینے کے سلسلے میں نقل کی ہے جو سنن النسائی (ج1 ص152 رقم 1296) اور ابن حبان (ج2 ص80 رقم 911) میں یوں مروی ہے۔

عبداللہ بن ابی طلحہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ اس حال میں تشریف لائے کہ آپ بہت مسرور تھے۔ آپ نے فرمایا: میرے پاس فرشتہ آیا۔ نسائی کی روایت میں جبرائیل آئے۔ انہوں نے کہا: اے محمد! بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا آپ اس پر راضی نہیں کہ میرے بندوں میں کوئی بندہ جب آپ پر میری رحمت کے نزول کے لیے ایک مرتبہ دعا کرے تو میں اس کو دس مرتبہ اپنی رحمت سے نواز دوں گا اور جو آپ کو ایک مرتبہ سلام کرے گا تو میں اس کو دس مرتبہ سلامتی سے نواز دوں گا۔

علامہ السبکی کا بحث کو آگے بڑھانا

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ پر درود و سلام بھیجنے والے کو دس گنا اجر سے نوازا جاتا ہے اور رحمۃ للعالمین ہونے کے ناتے آپ اس پر بہت خوش تھے کہ آپ کی قدر

کرنے والوں کی اللہ کتنی قدر کرتا ہے اور یہ بشارت آپ کی زندگی مبارک میں دی گئی۔ اس میں قبر مبارک پر حاضری کا کوئی ذکر نہیں لیکن بحث کو آگے بڑھانے، پھیلانے، الجھانے اور اپنے علم کی جوت جگانے کے لیے علامہ السبکی نے یہ عنوان قائم کردیا کہ جو آپ کو سلام کرتا ہے اس کا آپ کو علم ہوتا ہے۔ اس سلام سے جو آپ کے فوت ہونے کے بعد آپ کی قبر مبارک کے پاس کھڑے ہوکر یا دور سے کہا جاتا ہے اور ہر سلام کرنے والے کا نام اور اس کے باپ کا نام بھی آپ کو بتایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے حسب ذیل روایات نقل کی ہیں۔

1- عبداللہ بن مسعود سے روایت کی گئی ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے فرشتے زمین میں گھومتے پھرتے ہیں اور میرے امتی کا سلام مجھ کو پہنچاتے ہیں۔

2- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے فرشتے زمین میں گھومتے پھرتے ہیں جو میرے امتی کا درود مجھ تک پہنچاتے ہیں۔

3- بکر بن عبداللہ المزنی کا کہنا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری حیات تمہارے لیے بہتر ہے تم بات کرتے ہو اور تم سے بات کی جاتی ہے جب میں فوت ہوجاؤں گا تو میری وفات تمہارے لیے بہتر ہوگی۔ تمہارے اعمال مجھ پر پیش کیے جائیں گے۔ اگر ان میں بھلائی دیکھوں گا تو اللہ کی حمد بیان کروں گا اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور دیکھوں گا تو تمہارے لیے استغفار کروں گا۔

4- ایوب السختیانی کا قول ہے مجھے یہ بات پہنچی ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو بھی نبی ﷺ پر درود بھیجتا ہے اس پر مقرر فرشتہ اس کو نبی ﷺ تک پہنچاتا ہے۔

5- قاضی اسمٰعیل کی کتاب فضل الصلوة علی النبی ﷺ میں نبی ﷺ کا فرمان ہے۔ گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔ مجھ پر درود وسلام بھیجو جہاں بھی تم ہو تمہارا درود و

سلام مجھ تک پہنچ جائے گا۔ سنن ابی داؤد میں یہ روایت سلام کے بغیر موجود ہے۔

6- ابن عساکر نے مختلف طرق سے نعیم بن ضمضم سے، اس نے عمران بن حمیری الجعفی سے، اس نے کہا: میں نے عمارؓ بن یاسر رضی اللہ عنہ کو سنا۔ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ مجھے دے دیا۔ جب میں فوت ہو جاؤں تو وہ میری قبر پر کھڑا ہوگا۔ جب کوئی بندہ مجھ پر درود بھیجے گا تو وہ کہے گا۔ اے احمد! فلاں بن فلاں تم پر درود بھیج رہا ہے۔ وہ اس کا نام اور اس کے باپ کا نام بتائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت کا نزول فرمائے گا۔

ایک اور روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے ایک فرشتے کو تمام مخلوق کے نام بتا دے گا۔ دوسری روایت میں اسماء کی بجائے اسماع الخلائق یعنی مخلوق کو سننے کی قوت عطا کرے گا۔

7- ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امت محمد ﷺ میں سے جو کوئی آپ پر درود بھیجتا ہے وہ آپ کو پہنچتا ہے۔

8- سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے دنوں میں جمعہ کا دن افضل ہے۔ اس لیے اس میں کثرت سے مجھ پر درود بھیجا کرو۔ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

9- حسن بصری سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو، وہ مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

10- محمد بن اسحاق بن السنی نے انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو۔

11- مکحول الشامی نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جمعہ کے

دن کثرت سے مجھ درود بھیجا کرو، میری امت کا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ جمعہ کے دن جو مجھ پر زیادہ درود بھیجے گا وہ از روئے منزلت میرے زیادہ قریب ہوگا۔

مذکورہ احادیث کو نقل کرنے کا مقصد قاضی القضاۃ علامہ السبکی نے یہ بیان فرمایا کہ دور اور غائب سے درود فرشتوں کے ذریعے پہنچتا ہے۔ پھر انہوں نے دو حدیثیں محمد بن مروان اور ابن موسیٰ الکدَیمی کے حوالے سے نقل کی ہیں جن سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آپ کی قبر مبارک کے پاس سلام کہا جاتے تو آپ سنتے ہیں۔

12- جو میری قبر کے پاس درود بھیجتا ہے میں اس کو سن لیتا ہوں جو دور سے بھیجتا ہے وہ مجھ تک پہنچ جاتا ہے یا پہنچا دیا جاتا ہے۔ (محمد بن مروان السدی)

13- میری قبر کے پاس جو بندہ سلام کہتا ہے اس کے لیے ایک فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے جو مجھے پہنچاتا ہے اس کی دنیا اور آخرت کے معاملہ کی کفایت ہو جاتی ہے اور میں اس کے لیے قیامت کے دن گواہ و شفیع ہوں گا۔ (محمد بن یونس بن موسیٰ الکدیمی) + (محمد بن مروان السدی)

14- سلیمان بن سحیم کا کہنا ہے: میں نے نبی ﷺ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں اور آپ کو سلام کرتے ہیں۔ کیا آپ کو ان کے سلام کا علم ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں اور میں ان پر لوٹاتا ہوں۔

15- ابراہیم بن بشار سے یہ بھی نقل کر دیا۔ میں نے کسی سال حج کیا تو قبر مبارک کے پاس آکر میں نے آپ کو سلام کیا۔ حجرہ کے اندر سے میں نے آواز سنی۔ وعلیک السلام۔

مذکورہ احادیث کا جائزہ

علامہ تقی الدین السبکی نے مذکورہ روایات کے ذریعے سیدھے سے مسئلے کو اس قدر

الجھا دیا ہے کہ عام قاری کیا بلکہ اچھے بھلے اہل علم کی سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔ ایک طرف کہا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کو درود و سلام کا تحفہ پیش کیا جائے تو آپ سنتے ہیں اور دوسری طرف درود و سلام آپ تک پہنچانے کے لیے ایک فرشتے کی تقرری کا ذکر کردیا گیا۔ مضمون کو سمیٹنے کی بجائے پھیلا کر الجھاؤ پیدا کردیا۔ اوپر جن روایات کا حوالہ دیا ان کے ضعیف و موضوع ہونے کے باوجود ان کو صحیح ثابت کرنے میں زبردست کوشش کی۔

حوالہ حدیث 15 کو دیکھیں۔ ایک طرف اس کی کوئی سند نہیں اور دوسری طرف سال حج کا تعین بھی نہیں۔ ہزاروں صحابہ اور لاکھوں امتیوں کو سلام کا جواب سنائی نہ دیا لیکن قاضی صاحب نے ایک بزرگ کا حوالہ دے دیا۔ ایسی علمی گہرائی کا مظاہرہ قاضی القضاۃ ہی فرما سکتے تھے۔

حوالہ 14 کی بھی کوئی سند نہیں اور معاملہ بھی خواب کا۔ علم حدیث میں سند اور متن کو دیکھا جاتا ہے۔ خوابوں کو خوابوں تک محدود رکھا جاتا ہے۔ احکام میں ان کو حجت تسلیم نہیں کیا جاتا۔

حوالہ 12 اور 13 کا معاملہ تو بڑا ہی عجیب اور حیران کن ہے۔ جن دو راویوں کے حوالے سے روایات نقل کی ہیں ان میں سے پہلے یعنی محمد بن مروان السدی کے بارے میں علامہ السبکی صاحب کا خود اقرار ہے کہ هُوَ ضَعِيفٌ (ص 50) وہ ضعیف ہے اور حوالہ 13 کے بارے میں ان کا فرمان ہے: هٰذَا الْحَدِيثُ اَضْعَفُ مِنَ الْاَوَّلِ لِاَنَّهٗ اِنْضَمَّ فِيهِ ضُعْفُ الْكُدَيْمِي اِلٰى ضُعْفِ السُّدِّي (ص 51) "یہ حدیث پہلی حدیث سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ کیونکہ اس میں الکدیمی کا ضعف السدی کے ضعف میں مل گیا ہے۔"

محمد بن مروان کے بارے میں

محمد بن مروان کو صرف ضعیف کہہ کر اس کی بیان کردہ حدیث کو دلیل بنایا گیا ہے حالانکہ اس کے بارے میں امام العقیلی نے الضعفاء الکبیر (ج 4 ص 137 رقم 1696)

اور امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج4 ص33 رقم 8154) میں لکھا ہے وہ کذاب اور کذب کا اس پر اتہام تھا۔

اس کی بیان کردہ حدیث کو نقل کر کے امام العقیلی نے واضح کیا ہے۔ لَا اَصْلَ لَہٗ مِنْ حَدِیْثِ الْاَعْمَشِ۔ ''الاعمش سے اس کے حدیث بیان کرنے کی کوئی اصل نہیں۔''

امام النسائی کی کتاب الضعفاء (ص94) اور ابن عدی کی الکامل (ج6 ص2267) میں منقول ہے۔ وہ متروک الحدیث تھا یعنی اس کی حدیث کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔

امام ابن حبان کی کتاب المجروحین (ج2 ص298 رقم 979) کے مطابق: کَانَ مِمَّنْ یَرْوِیِ الْمَوْضُوْعَاتِ عَنِ الْاَثْبَاتِ۔ "وہ ان میں سے تھا جو مضبوط راویوں سے من گھڑت روایات بیان کیا کرتے تھے۔'' یعنی ان کے ناموں پر روایات گھڑ لیا کرتا تھا۔ جھوٹی روایات کو ان کے ناموں سے بیان کر کے سچا ثابت کر دیا کرتا تھا۔

کتاب الجرح والتعدیل (ج8 ص86، رقم 324) کے الفاظ ہیں۔ محمد بن مروان السُّدی کذاب، متروک الحدیث اور ذاھب الحدیث تھا۔

ابن جوزی نے اس کی روایت کو اپنی الموضوعات (ج1 ص303) میں نقل کر کے ائمہ رجال کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔

تہذیب التہذیب (ج9 ص436) میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے صالح بن محمد سے نقل کیا ہے۔ کَانَ ضَعِیْفًا وَّ کَانَ یَضَعُ۔ ''محمد بن مروان ضعیف راوی تھا اور حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔''

الکدیمی کے بارے میں

قاضی صاحب کے دوسرے راوی محمد بن یونس بن موسی الکدیمی ہیں۔ جن کے ضعف کی نشاندہی بھی کر دی لیکن اس کی جھوٹی روایت قبول بھی کر لی۔ قاضی ہونے کے

باوجود اس کی شہادت کو قبول کرلیا جس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ سراسر جھوٹی ہے۔

امام ابن عدی نے الکامل (ج6 ص2364) میں الکدیمی کا تعارف یوں کرایا ہے:

اِتُّهِمَ بِوَضْعِ الْحَدِيْثِ وَسَرَقَتِهٖ وَادَّعٰى رُؤْيَةَ قَوْمٍ لَمْ يَرَهُمْ و رِوَايَةَ عَنْ قَوْمٍ لَا يُعْرَفُوْنَ وَتَرَكَ مَشَائِخُنَا الرِّوَايَةَ عَنْهُ۔ ''حدیث گھڑنے اور اس کو چرانے اور جس قوم کو نہ دیکھا اس کو دیکھنے کا دعویٰ کرنے اور ایسے لوگوں سے روایت کرنے کہ جن کو پہچانا نہ جاتا ہو، اس پر وہ متہم تھا۔ ہمارے عام مشائخ نے اس سے روایت کرنا ترک کردیا تھا۔''

کتاب المجروحین (ج2 ص332 رقم 1020) میں امام ابن حبان نے نقل کیا ہے:

كَانَ يَضَعُ عَلَى الثِّقَاتِ وَضْعًا وَلَعَلَّهٗ قَدْ وَضَعَ اَكْثَرَ مِنْ اَلْفِ حَدِيْثٍ۔ ''وہ ثقہ راویوں کے ناموں سے احادیث گھڑا کرتا تھا اور شاید اس نے ایک ہزار سے زیادہ احادیث گھڑ لی تھیں۔''

میزان الاعتدال (ج4 ص73 رقم 8353) میں امام الذہبی نے ابوعبید الآجری سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے امام ابوداؤد کو دیکھا کہ وہ الکدیمی پر جھوٹ کا اطلاق کرتے تھے اور اسی طرح موسیٰ بن ہارون اور القاسم المطرز نے بھی اس کو جھٹلایا۔ تذکرۃ الحفاظ (ج2 ص619 رقم 645) موسیٰ بن ہارون نے بیت اللہ کا غلاف پکڑتے ہوئے کہا: اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ ابن الکدیمی کذاب اور حدیث گھڑتا ہے۔

امام الدارقطنی سے الکدیمی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: حدیث گھڑنے کی اس پر تہمت ہے۔

تہذیب التہذیب (ج 9 ص543) اور میزان الاعتدال (ج4 ص75) میں امام الدارقطنی ہی سے مروی ہے۔ مجھے ابوبکر احمد بن المطلب الہاشمی نے بتایا: ایک دن ہم القاسم بن زکریا المطرز کے پاس تھے اور وہ مسند ابی ہریرہ پڑھ رہے تھے کہ ان کی کتاب میں الکدیمی کی ایک حدیث آ گئی جس پر انہوں نے اپنی قرأت روک لی۔ ان کی

طرف محمد بن عبدالجبار کھڑے ہوئے اور وہ الکدیمی کی زیادہ روایات جمع کرنے والے تھے۔انہوں نے کہا: الشیخ مجھے محبوب ہے کہ آپ یہ روایت پڑھیں۔القاسم نے نہ صرف انکار کیا بلکہ کہا: میں اس کو اللہ کے سامنے گھٹنوں کے بل کردوں گا اورعرض کروں گا: بے شک یہ تیرے رسول ﷺ اور علمائے کرام پر جھوٹ بولا کرتا یعنی ان کے ناموں سے حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔

جس کتاب میں ایسے راویوں کی روایات کو دلیل بنایا جائے اس کی قدرومنزلت کیا ہوگی۔خوابوں اور بے سند باتوں کا سہارا تو اس کو بالکل بے وقعت بنائے دیتا ہے۔

حمید بن زیاد کے بارے میں

محترم قاضی صاحب نے باب کے آغاز میں جو روایت نقل کی اس کے ایک راوی حمید بن زیاد کے بارے میں ان کا اپنا کہنا ہے کہ ابن معین نے اس کو ایک روایت کے مطابق ضعیف کہا۔اس لیے انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس کو صالح الحدیث ثابت کرنے کی کوشش کی۔ تهذيب التهذيب (ج3 ص41-43) اور ميزان الاعتدال (ج1 ص612) میں اس کے بارے میں ضعف کا جو ذکر ہوا اس کو نظر انداز کردیا۔یحیٰ بن معین کے ساتھ امام النسائی نے بھی اس کو ضعیف ہی کہا۔امام الذہبی کا کہنا ہے: إِنَّ ابْنَ عَدِيٍ ذَكَرَ حُمَيْدَ بن صَخْرٍ فِي مَوْضِعٍ اٰخر فَضَعَّفَهٗ۔ ''ابن عدی نے حمید بن صخر کا دوسری جگہ ذکر کرتے ہوئے اس کو ضعیف کیا۔''

رہی بات صحیح مسلم کے رجال میں سے ان کے ہونے کی تو صحیح مسلم کے بارے میں علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ بعض مقام پر امام مسلم صحیح احادیث کے شواہد میں ایسے راویوں کی روایات نقل کردیتے ہیں جن کے بارے میں ائمہ حدیث نے کلام کیا ہوتا ہے۔اس کی وضاحت امام مسلم نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں خود ہی کردی ہے لہٰذا

کسی ضعیف راوی کے صحیح مسلم کے رجال میں شمار ہونے سے اس کا ضعف اس کی ثقاہت میں تبدیل نہیں ہوتا۔ نکتے کی بات یہ ہے کہ امام مسلم نے حمید بن صخر کی اپنے استاد قسیط کی سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کوئی روایت نقل نہیں کی۔ امام مسلم کی طرح اگر امام احمد بن حنبل نے بھی شواہد میں ان کا ذکر کر دیا تو حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ ان کے بارے میں آراء مختلف تھیں۔ جیسا کہ علامہ السبکی نے خود بھی الشیخ زکی الدین کے قول کا ذکر کیا ہے۔

اپنے وقت کے چیف جسٹس ہوتے ہوئے عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا ان کا فرض تھا لیکن انہوں نے امام احمد بن حنبل سے وہ روایت نقل کر دی جو مسند احمد میں نہیں ہے۔ ج 2 ص 527 میں ابوداؤد والی روایت موجود ہے لیکن اس میں یہ اضافہ موجود نہیں مَا مِنْ اَحَدٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ۔ ''کوئی ایک جب میری قبر مبارک کے پاس مجھے سلام کرتا ہے۔'' عجیب بات یہ ہے کہ ان کو علم تھا کہ یہ اضافہ ثابت نہیں، لیکن اپنی بات کو حق ثابت کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے وہ بات منسوب کر دی جو آپ نے نہ فرمائی تھی۔

ویسے بھی بار بار آپ کی روح مبارک کا لوٹایا جانا اور ہر سلام کرنے والے کو جواب دینا، یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس سے کئی سوال ابھرتے ہیں۔ جن کا جواب دینے کے لیے اہل علم کو کئی تاویلوں کا سہارا لینا پڑتا ہے لہٰذا الجھاؤ سے بچنے کی بہترین راہ وہ ہے جو امام ابوداؤد کی دوسری روایت میں مروی ہے یعنی مجھ پر درود بھیجتے رہو جہاں بھی تم ہوگے وہاں سے تمہارا درود مجھ کو پہنچتا رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے اسی ارشاد مبارک کو امام ابن ابی شیبہ (المتوفی 235ھ) نے اپنی مصنف (ج 2 ص 275، باب الصلوۃ عند قبر النبی ﷺ واتیانہ) میں امام ابوداؤد سے چالیس سال پہلے نقل کر دیا تھا۔

❁❁❁

٦

شفاء السقام کا تیسرا باب

اس باب میں قاضی القضاۃ علامہ تقی الدین السبکی نے ان روایات، حکایات اور خوابوں کو نقل کیا ہے جن کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کرنا نہ صرف مشروع بلکہ عبادت ہے۔ یوں انہوں نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، سنن النسائی، سنن دارمی، مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ جیسی حدیث کی مستند کتابوں میں مروی اس حدیث کو قبول نہیں کیا۔ لَا تُشَدَّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِی هٰذَا وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی۔ "صرف تین مساجد کی طرف سفر کرنے کے لیے کجاوے باندھے جائیں۔ مسجد حرام، میری اس مسجد اور مسجد اقصیٰ کی طرف۔" اس سفر سے مراد اجر و ثواب کی خاطر یا عبادت سمجھتے ہوئے سفر کرنا ہے۔ اس سے دوسرے عام سفروں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان سفروں سے نہیں روکا گیا ہے جو دنیاوی مقاصد کے لیے کئے جاتے ہیں۔

اصل میں یہود و نصاریٰ کے ہاں معمول تھا کہ وہ اپنے نبیوں اور صلحاء کی قبروں کی زیارت اور اجر و ثواب کیلئے اس وقت کے رواج کے مطابق اونٹوں پر سفر کیا کرتے تھے جو کہ شرعی طور پر درست نہ تھا لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو اس سے منع فرما دیا۔

مصنف ابن ابی شیبہ (ج2 ص376) میں کوفیوں کے طبقہ اولیٰ سے تعلق رکھنے والے معرور بن سوید سے مروی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہم حج کے لیے نکلے۔ انہوں نے حج کیا اور فجر کی نماز میں اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ اور لِاِيْلٰفِ

قُرَیْشٍ پڑھیں۔حج سے فارغ ہونے کے بعد جب واپس لوٹ رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ ایک طرف دوڑے جا رہے ہیں۔انہوں نے اپنے ہمراہ لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے عرض کیا: یہاں وہ جگہ ہے کہ جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی۔عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

هٰكَذَا هَلَكَ اَهْلُ الْكِتَابِ اتَّخَذُوْا اٰثَارَ اَنْبِيَآءِ هِمْ بِيَعًا مَنْ عَرَضَتْ لَهٗ مِنْكُمْ فِيْهِ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِضْ لَهٗ مِنْكُمْ فِيْهِ الصَّلٰوةُ فَلَا يُصَلِّ۔

''اسی طرح اہل کتاب ہلاک ہوئے۔انہوں نے اپنے نبیوں کے آثارات کو عبادت گاہیں بنالیا تم میں سے جس کے لیے نماز کا وقت وہاں آئے وہ اس میں نماز پڑھ لے اور جس کے لیے نماز کا وقت وہاں نہ آئے وہ نماز نہ پڑھے۔''

فتح الباری میں فَلْيَمْضِ منقول ہے بلکہ وہ گزر جائے۔

عبداللہ بن الحارث النجرانی سے مروی ہے مجھے میرے دادا نے بتایا کہ انہوں نے آپ کی وفات سے پانچ دن پہلے آپ کو فرماتے سنا۔آگاہ ہو جاؤ۔تم سے جو لوگ پہلے تھے وہ انبیاء وصلحاء کی قبروں کو مساجد بنالیا کرتے تھے۔آگاہ ہو جاؤ تم نے قبروں کو مساجد نہیں بنانا، بلاشک وشبہ تم کو اس سے منع کر رہا ہوں۔مسجد کی جمع مساجد سے مراد وہ جگہ ہے کہ جہاں سجدہ کیا جاتا ہے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان قوموں پر اللہ کی لعنت ہو جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔

امام ابن تیمیہ ؒ نے مذکور صحیح حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فتویٰ دیا کہ قبروں کی زیارت کے لیے مجرد سفر جائز نہیں لیکن کجاوے باندھے بغیر قبروں کی زیارت مستحب ہے۔جیسے کہ رسول اللہ ﷺ شہدائے احد کی قبروں کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے

جنت البقیع میں مدفون صحابہ وصحابیات کے لیے آپ نے دعا فرمائی۔

جبکہ علامہ السبکی نے اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کو عین عبادت ثابت کرنے کے لیے جن روایات و حکایات اور خوابوں کا سہارا لیا ہے ان کی تصدیق حدیث کی کسی مستند کتاب سے نہیں ہوتی اور راوی بھی مجہول ہیں۔ علامہ السبکی کو جہاں سے بھی معمولی سا سہارا نظر آیا انہوں نے صحیح اور غیر صحیح تمیز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کو پر زور انداز میں استعمال کیا۔

شفاء السقام کے تیسرے باب میں انہوں نے حسب ذیل واقعات و روایات کا ذکر کیا ہے۔(1) بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ (2) عمر بن عبدالعزیز کے قاصد کے ذریعہ سلام بھیجنا (3) ابوعبیدہ کے قاصد میسرہ رضی اللہ عنہ بن مسروق کا واقعہ (4) کعب احبار رحمہ اللہ کا واقعہ (5) ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ اور زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ (6) حج کے بعد مدینہ طیبہ آنے کی دلیل اور اس کا مقصد (7) قاضی عیاض کا حوالہ (8) ایک بدوی کا واقعہ۔

بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ابن عساکر کے حوالے سے علامہ موصوف نے نقل کیا ہے: بیت المقدس کی فتح کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ جابیہ کی طرف گئے تو بلال رضی اللہ عنہ نے ان سے شام ہی مین رہنے کی اجازت چاہی جوان کو مل گئی۔

بلال رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے۔ نبی ﷺ نے ابورویحہ رضی اللہ عنہ کو ان کا دینی بھائی بنایا تھا چنانچہ دونوں بھائی خولان میں قیام پذیر ہوگئے۔ پھر دونوں خولان کے لوگوں کے پاس گئے اور اپنے نکاح کی بات کرتے ہوئے ان سے کہا:

ہم کافر تھے۔ اللہ نے ہمیں ہدایت دے دی، غلام تھے اللہ نے ہمیں آزاد کردیا۔

ہم مفلس تھے، اللہ نے ہمیں غنی کر دیا۔ اگر ہمیں رشتہ دے دو تو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہ اور اگر واپس لوٹا دو تو وَلَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ ان لوگوں نے ان دونوں کا نکاح کرا دیا۔

ایک روز حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپ نے فرمایا: اے بلال! یہ کیسی جفا ہے۔ کیا وقت نہیں آیا کہ تم ہماری زیارت کرو۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نیند سے بیدار ہوئے تو خوف و رنج ان پر طاری تھا۔ فوراً اپنی سواری پر سوار ہوئے۔ اور مدینہ کا قصد کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر پہنچ کر رونا شروع کر دیا۔ قبر مبارک پر چہرہ رکھ کر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ وہاں آ گئے۔ بلال رضی اللہ عنہ نے ان کو سینے سے لگایا اور پیار کیا۔ ان دونوں نے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیں وہ اذان سناؤ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مسجد میں دیا کرتے تھے۔ اس کے لیے وہ تیار ہو گئے اور مسجد نبوی کی چھت پر اس جگہ پہنچے جہاں کھڑے ہو کر اذان دیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے اَللّٰہُ اَکۡبَرُ۔ اَللّٰہُ اَکۡبَرُ کہا تو مدینہ میں بھونچال آ گیا۔ جب انہوں نے کہا: اَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا للّٰہُ تو بھونچال اور زیادہ ہو گیا۔ جب انہوں نے کہا: اَشۡھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَسُوۡلُ اللّٰہ تو پردہ والی عورتیں پردہ سے باہر آ گئیں۔ لوگوں نے کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ کر دیئے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں میں اتنی زیادہ آہ و بکا اس دن کے علاوہ نہ دیکھی گئی۔

بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کرنے کے بعد محترم قاضی القضاۃ صاحب کا کہنا ہے۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر پر استدلال محض خواب کی بات نہیں بلکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہے خصوصاً جبکہ ان کا یہ عمل حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں اور بکثرت صحابہ کرام کی موجودگی میں ہوا۔ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ سارا قصہ اور بلال رضی اللہ عنہ کا خواب ان سے مخفی رہا ہو۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ شیطان رسول

اللہ ﷺ کی صورت میں کسی کے خواب میں نہیں آسکتا اور یہ خواب کسی شرعی حکم کے خلاف بھی نہیں۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی مؤکد یہ بات بھی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز شام سے مدینہ اپنا قاصد بھیجا کرتے جو نبی ﷺ کی قبر مبارک پر پہنچ کر ان کا سلام پیش کیا کرتا تھا۔

بلال رضی اللہ عنہ کے واقعہ کا تجزیہ

قاضی صاحب نے ابن عساکر (المتوفی 571ھ) سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ مختلف سندوں سے نقل کیا ہے وہ کسی محدث یا مؤرخ نے ابن عساکر سے پہلے نقل نہیں کیا ہے جس واقعہ کی وجہ سے مدینہ میں بھونچال آگیا اور پردہ دار پردوں سے باہر آگئیں اور ایسی آہ و بکا ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد دیکھی نہ گئی۔ ائمہ حدیث سے وہ کیسے اوجھل رہا۔ اس کا ذکر کرنے کا شرف پانچ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد ابن عساکر کو ہوا اور اسے قاضی صاحب نے اہل علم تک پہنچایا۔ جس کے مطابق بیت المقدس کی فتح کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب جابیہ کی طرف گئے تو بلال رضی اللہ عنہ نے ان سے شام ہی میں رہنے کی اجازت چاہی جو اس کو مل گئی۔

جبکہ صحیح بخاری (باب مناقب بلال بن رباح مولی ابی بکر کے تحت رقم 3755) میں اسمٰعیل نے قیس کے حوالے سے بیان کیا۔ بلال رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: اِنْ کُنْتَ اِنَّمَا اشْتَرَيْتَنِي لِنَفْسِكَ فَأَمْسِكْنِي وَاِنْ كُنْتَ اِنَّمَا اشْتَرَيْتَنِي لِلّٰهِ فَدَعْنِي وَعَمَلَ اللّٰهِ۔ ”اگر آپ نے مجھے اپنی ذات کے لیے خریدا ہے تو مجھے آپ روکے رکھیں اور اگر آپ نے مجھے اللہ کے لیے خریدا ہے تو مجھے اللہ کے لیے چھوڑ دیں۔“

ابواسامۃ کی روایت کے الفاظ ہیں: فَذَرْنِي اَعْمَلُ لِلّٰهِ۔ مجھے چھوڑ دیں تاکہ اللہ

کے لیے عمل کروں۔

طبقات ابن سعد (ج 3 236-237) میں مروی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو بلال ؓ ابوبکر ؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا: رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: مومن کا افضل عمل اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے بلال رضی اللہ عنہ: تو کیا چاہتا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: میرا ارادہ ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں یہاں تک کہ میری موت واقع ہو جائے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے بلال! تجھے قسم دے کر کہتا ہوں۔ میرے حق اور میری حرمت کا خیال کرو۔ میں بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہوں اور میری موت کا وقت قریب ہو چکا ہے۔ چنانچہ بلال رضی اللہ عنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی وفات تک رکے رہے۔ جب وہ فوت ہو گئے تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے انہوں نے وہی بات کہی جو انہوں نے جہاد کے سلسلہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہی تھی۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی خواہش کو پورا کرنے سے اسی طرح انکار کر دیا جس طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ لیکن بلال رضی اللہ عنہ نہ مانے تو عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا تو اذان دینے کی ذمہ داری تمہارے خیال میں کس کے سپرد کروں۔ انہوں نے کہا: سعد رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیں کیونکہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے لیے اذان دی تھی۔ چنانچہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ کو بلا کر اذان دینے کی ذمہ داری ان کو اور ان کے بعد آنے والے رشتہ داروں کو سونپ دی۔

سعید بن مسیب ؒ سے مروی ہے۔ جمعہ کے دن ابوبکر رضی اللہ عنہ جب منبر پر بیٹھے تو بلال رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: آپ نے مجھے اپنے لیے یا اللہ کے لیے آزاد کیا تھا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کے لیے کیا تھا تو انہوں نے عرض کیا: پھر مجھے اجازت دے دیں۔ یہاں تک کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں۔

فاذن لَهٗ فَذَهَبَ اِلَی الشّامِ فمات ثَمّ۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو اجازت دے دی اور وہ شام کی طرف چلے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی وہاں وفات ہوئی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری (ج7 ص99) میں طبقات ابن سعد کی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے:

فَلَمّا مَاتَ اَذِنَ لَهٗ عُمَرُ فَتوَجَهَ اِلَی الشّامِ مُجَاهِداً فَمَاتَ بِهَا فِی طَاعُونَ عَمْواس سَنَةَ ثَمَانَ عَشَرَةَ وَقِيلَ سَنَةَ عِشْرِيْنَ۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ فوت ہوگئے تو عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اجازت دے دی پس ایک مجاہد کی صورت میں وہ شام کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہیں ان کی موت عمواس کے طاعون میں اٹھارہ ہجری میں ہوئی۔ یہ بھی مروی ہے کہ بیس ہجری میں ہوئی۔ حافظ ابن حجر نے وفات کے مقام میں اختلاف کا بھی ذکر کیا۔

بلال رضی اللہ عنہ کا قول فیصل

علامہ العینی، علامہ الکرمانی اور علامہ القسطلانی تینوں ہی بخاری کے مشہور و معروف شارح ہیں۔ انہوں نے بلال رضی اللہ عنہ والی حدیث کی شرح میں لکھا ہے۔ یہ کلام اس وقت کا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے اور بلال رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے ہجرت کرنے کا ارادہ کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو اس لیے روک لیا تاکہ وہ مسجد رسول میں اذان دیتے رہیں۔ بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: اِنّی لَا اُرِیْدُ الْمَدِیْنَةَ بِدُوْنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمْ وَلَا اَتحَمَّلُ مَقَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم خَالِیًا عَنْهُ۔

میں یقینی طور پر اس مدینہ میں رہنا نہیں چاہتا کہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوں اور جن جگہوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کرتا تھا ان کو آپ سے خالی دیکھنا میں برداشت نہیں کرسکتا۔ (عمدۃ القاری ج16 ص244، ارشاد الساری ج6 ص126

اور البخاری بشرح الکرمانی ج15 ص24)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ بن رباح کے اس قول فیصل نے قاضی القضاۃ علامہ السبکی کی ساری کوشش کو بیکار کردیا۔ تقریباً ساڑھے پانچ سو سال مدینہ طیبہ کے عظیم محدثین وفقہاء کرام کو حیرت انگیز واقعہ کا علم نہ ہوسکا۔ جناب علامہ صاحب کے مطابق بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے فوراً بے وقت اذان بھی دے دی جبکہ ابوبکرؓ کے لیے ان کی مجبوری تھی اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسی عظیم ہستی کی بلال رضی اللہ عنہ نے پروانہ کی۔ واللہ یھدی من یشاء۔

ابورویحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو اختلاف ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلال رضی اللہ عنہ کا دینی بھائی بنایا تھا کہ نہیں۔ علامہ موصوف نے خود ہی فرمایا ہے کہ طبقات ابن سعد میں محمد بن عمر نے اس کو ثابت نہیں کیا جبکہ ابن اسحاق اور دوسروں نے ثابت کیا ہے کیونکہ بلال رضی اللہ عنہ کے کہنے پر ان کے دیوان کی ذمہ داری ابورویحہ رضی اللہ عنہ کو دے دی تھی۔

علامہ صاحب نے محمد بن عمر کے انکار کی وجہ کا ذکر نہیں کیا۔ طبقات ابن سعد کے الفاظ ہیں: لَمْ یَشْھَدْ اَبُو رُوَیْحَةَ بَدْراً۔ ابورویحہ جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے اور دیوان کی سپرد داری بھی بلال رضی اللہ عنہ کے شام روانہ ہونے کے بعد ہوئی۔

ابورویحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اختلاف نہ صرف محمد بن عمر ہی نے کیا بلکہ الاستیعاب (رقم 166 ص59) اور المستدرک (ج3 ص283) کے مطابق اخیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینه و بین عبیده بن الحارث۔ (اسد الغابة ج1 ص243 رقم 493) اور الاصابة (ج1 ص171 رقم 732) میں مروی ہے اخیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بینه و بین عُبیده بن الجراح۔

ابورویحہ رضی اللہ عنہ کی بجائے عبیدة بن الحارث اور عبیدہ بن الجراح سے بھی ان کی دینی

بھائی بندی مذکور و منقول ہے لیکن علامہ صاحب نے اس بھائی بندی کو ترجیح دی جوان کے موقف کی ضرورت کو پورا کرتی تھی۔

سند کے اعتبار سے قصہ کی حقیقت

قاضی صاحب کے بیٹے کے استاد امام الذہبی نے سیر اعلام النُّبلاء (ج1 ص357) میں لکھا ہے اسنادہ لین وھو منکر۔ اس کی اسناد کمزور اور وہ منکر ہے۔ یعنی اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان (ج1 ص297 رقم 324) میں اس قصہ کے ایک راوی ابراہیم بن محمد بن سلیمان کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ اس میں جہالت پائی جاتی ہے۔ وَھِیَ قِصَّۃٌ بَیِّنَۃ الوَضعِ اور یہ قصہ وضع کئے جانے کی واضح دلیل ہے۔

ملا علی قاری حنفی نے الموضوعات الکبری (ص413) میں اور علامہ الشوکانی نے الفوائد المجموعۃ (21) میں بلال والے قصہ کے بارے میں لکھا ہے: لا اصل لہ اس کی کوئی اصل نہیں۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ یہ قصہ بلال رضی اللہ عنہ کے ترجمہ کی بجائے تاریخ ابن عساکر میں ابراہیم کے ترجمہ میں منقول ہے۔

عجیب استدلال

قاضی القضاۃ علامہ السبکی صاحب نے بلال رضی اللہ عنہ کے خواب سے بڑا عجیب استدلال کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بات خواب کی نہیں بلکہ صحابی کے فعل کی ہے یعنی زیارت کے لیے صحابی رضی اللہ عنہم نے سفر کیا اور وہ بھی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت اور بہت سے صحابہ کی موجودگی میں کیا حالانکہ بقول ان کے خواب ہی اس سفر کی وجہ تھی۔ خواب سے

پہلے انہوں نے سفر کیوں نہ کیا وہ تو بلاوے کی تعمیل تھی۔ اگر اس کی کوئی حقیقت تھی۔
بلال رضی اللہ عنہ تو مدینہ طیبہ سے نکلنا اس لیے چاہ رہے تھے کہ ان کو ان کے آقا و محبوب نظر نہیں آرہے تھے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مجبوراً مدینہ میں رہے جیسے ہی موقع ملا وہاں سے چلے گئے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلال کو سیدنا کہا کرتے تھے۔ لیکن کسی مؤرخ محدث نے مدینہ میں ان سے یا کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کا ذکر نہیں کیا جو عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کو مدینہ میں اپنے پاس رکھنے کے انتہائی خواہش مند تھے۔ مدینہ میں ان کے آنے پر ان سے ملاقات نہ کرتے اور پھر سے مدینہ میں رہنے کی درخواست نہ کرتے یا وہ خود امیر المومنین سے ملے بغیر واپس چلے جاتے۔

اصل نکتہ

علامہ صاحب کا اپنا بیان ہے: فَرَكِبَ رَاحِلَتَهٗ وَقَصَدَ الْمَدِيْنَةَ۔ "لہٰذا وہ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور مدینہ کا قصد کیا۔" اصل نکتے کی یہی بات ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کا کہنا تھا کہ قبر مبارک کی زیارت کا قصد نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ مدینہ یا مسجد نبوی کا قصد ہونا چاہیے۔ تحیۃ المسجد پڑھنے کے بعد قبر مبارک پر جا کر درود و سلام کہنا چاہیے جبکہ حضرت علامہ صاحب نے پوری کتاب ہی اس پر لکھ دی کہ قصد زیارت کا ہی افضل اور عین عبادت ہے اگرچہ قصہ بے اصل ہے لیکن جو جملہ انہوں نے خود رقم کیا وہ امام ابن تیمیہؒ کی تائید کرتا ہے۔ بلال رضی اللہ عنہ نے قصد زیارتِ قبر مبارک کا نہیں بلکہ مدینہ کا کیا کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے اور یہاں معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

عمر بن عبدالعزیز کا واقعہ

علامہ تقی الدین السبکی نے اپنے موقف کی تائید میں دوسرا حوالہ عمر بن عبدالعزیز کا

دیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز قاصد کے ذریعے شام سے رسول اللہ ﷺ کو سلام بھجوایا کرتے تھے، جو سلام پہنچانے کے لیے سفر کیا کرتا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ اپنی عادت و معمول کے مطابق حضرت علامہ صاحب ہر حوالے کے ساتھ غیر ضروری لمبی لمبی سندیں نقل کرتے رہے ہیں لیکن یہاں سند کے بغیر ہی ایک عمل و فعل عمر بن عبدالعزیز کی طرف منسوب کر دیا جس کے لیے ضروری تھا کہ واضح طور پر عمر بن عبدالعزیز تک سند کا ذکر کیا جاتا۔

علامہ صاحب نے یہ بھی فرمایا: کسی دوسرے مقصد کے ساتھ مدینہ آنا اور پھر قبر مبارک کی زیارت بھی کرنا، اس کے بہت سے واقعات ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں یزید بن ابی سعید مولی المھری سے نقل کیا ہے کہ وہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس آئے۔ جب ان سے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے کہا: میرا بھی ایک کام کر دینا، جب مدینہ پہنچے تو نبی ﷺ کی قبر دیکھے تو میری طرف سے آپ کو سلام عرض کر دینا۔

امام بیہقی کی بیان کردہ سند کا تجزیہ

علامہ موصوف نے عمر بن عبدالعزیز کے قاصد کے ذریعے سلام بھیجنے والی سند کا ذکر اس لیے نہ کیا کیونکہ وہ ضعیف و منقطع ہے۔ اس میں عبداللہ بن جعفر ضعیف ہے اور یہ امام بخاری کے شیوخ میں سے ایک تھے۔

کتاب الضعفاء والمتروکین (رقم 230 ص 63) میں عبداللہ بن جعفر کے اپنے بیٹے علی بن المدینی کا کہنا ہے: اَبِیْ ضَعِیْفُ الْحَدِیْث۔ یُحَدِّثُ عَنِ الثِّقَاتِ بِالْمَنَاکِیرِ یُکْتَبُ حَدِیْثُہٗ وَلَا یحتَجُّ۔ میرا باپ ضعیف الحدیث ہے۔ ثقہ راویوں سے منکر روایات بیان کرتا ہے اس کی بیان کردہ حدیث لکھی تو جا سکتی ہے لیکن وہ حجت نہیں ہو سکتی۔

اس سے معلوم ہوا بڑے بڑے محدثین کے ایسے بھی استاد تھے جن پر محدثین اعتبار نہیں کرتے تھے۔ محدثین ضعیف راویوں سے احادیث سنا تو کرتے لیکن ان کو روایت نہیں کرتے تھے۔

رہی بات یزید بن ابی سعید مولی المھری کی تو وہ مدینہ کے رہنے والے اور شام سے واپس آنے والے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز نے نبی کریم ﷺ کو سلام کہنے کو کہا۔ مولی المھری کا یہ سفر مجرد زیارت کے قصد سے نہ تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی سفر سے واپسی پر قبر مبارک کے پاس جاکر سلام کیا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ معمول ان کے علاوہ کسی اور کے بارے میں مروی نہیں۔

جیسا کہ مصنف عبدالرزاق (ج3 ص576، رقم 6734) میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بھتیجے کے بیٹے عبید اللہ بن عمر سے مروی ہے: مَا نَعْلَمُ اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فَعَلَ ذٰلِكَ اِلَّا ابن عمر ''نبی ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کو ہم نہیں جانتے کہ اس نے ایسا کیا ہو سوائے ابن عمر رضی اللہ عنہ کے۔''

علامہ صاحب کو ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے صرف دو حوالے ملے جو سنداً مشکوک ہیں لیکن اس کے باوجود کتنی بڑی بات کہہ دی کہ کوئی بے علم یہ نہ کہے کہ صرف زیارت کے لیے سفر سنت نہیں۔ یہ طعن اپنے وقت کے عظیم صاحب علم کے بارے میں کہہ دی۔

جہاں تک ابو اللیث سمرقندی کے حوالے سے ابوالقاسم اور فتوح الشام کے مطابق میسرہ بن مسروق کے ذریعے سلام پہنچانے والی بات ہے۔ تو اس بارے علامہ صاحب کا خود اپنا بیان ہے کہ ان کے سفر کی ضرورت صرف زیارت نہ تھی لہٰذا اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

قصہ کعبؒ احبار کا

رہی بات کعب احبار اور عمر فاروق کی تو یہ قصہ سراسر عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر بہتان ہے۔

طبقات ابن سعد (ج 7ص445)، ابن قتیبہ کی المعارف (ص189)، تہذیب التہذیب (ج8ص438، رقم 793) اور الاصابۃ (ج5ص322 رقم 7490) میں کعب الاحبار کے بارے میں مروی ہے کہ اس کی کنیت ابواسحاق تھی۔ آل ذی رُعین کے قبیلہ حمیر سے اس کا تعلق تھا۔ وہ یمن میں رہتے ہوئے یہود کے دین پر تھا۔ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ ثُمَّ خَرَجَ اِلَى الشَّام فَسَكَنَ حِمص حَتّٰى تُوُفِّيَّ بِهَا سَنَةَ اِثْنَيْنِ وَ ثَلاثِيْنَ فِي خِلَافَةِ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ۔ ''وہ مدینہ آیا، پھر شام کی طرف چلا گیا، حمص میں مقیم ہوگیا یہاں تک کہ وہیں اس کی وفات 32 ہجری میں عثمان بن عفان کی خلافت میں ہوئی۔''

ابن قتیبہ کے مطابق: فَاَسْلَمَ هُنَاكَ ثُمَّ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ۔ یمن میں ہی وہ مسلمان ہوا، پھر مدینہ آیا۔

جبکہ تہذیب التہذیب اور الاصابۃ کے مطابق: اَسْلَمَ فِي اَيَّامِ اَبِيْ بَكْرٍ وَقِيْلَ فِي اَيَّامِ عُمَرَ۔ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمان ہوا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مسلمان ہوا۔

تذکرۃ الحفاظ (ج1ص52رقم 33) میں منقول ہے۔ اسلم فی زمن ابی بکر۔ وہ ابوبکر کے عہد خلافت میں مسلمان ہوا۔

طبقات ابن سعد میں سعید بن المسیب سے یہ بھی مروی ہے۔ عباس رضی اللہ عنہ نے کعب سے کہا: وہ کون سی بات تھی جس نے تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں اسلام میں داخل ہونے سے روکا اور اب عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلام قبول کر رہا

ہے؟

کعب نے کہا: میرے باپ نے میرے لیے ایک کتاب تورات میں سے لکھی اور مجھے دیتے ہوئے کہا: اس کے مطابق عمل کرنا اور اس پر مہر لگا دی۔ پھر مجھ سے باپ کا جو بیٹے پر حق ہوتا ہے اس کے ناتے مجھ سے عہد لیا کہ میں اس مہر کو کھولوں گا نہیں۔ اب جبکہ اسلام کا ظہور ہو چکا ہے۔ میرے نفس نے مجھ سے کہا: شاید تیرے باپ نے تجھ سے علم کی کوئی بات چھپائی اور تجھ سے غائب رکھی، تو اس کو اب پڑھ۔ چنانچہ میں نے مہر کھول کردہ کتاب پڑھی تو اس میں محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کی صفت پائی۔ اس لیے اب میں مسلمان ہو کر آیا ہوں۔

مذکورہ حوالوں سے عیاں ہو جاتا ہے کہ شام میں کعب الاحبار کا مسلمان ہونا اور قبر مبارک کی زیارت کے مدینہ آنا، یہ من گھڑت قصہ ہے۔

زیاد بن ابی سفیان اور ابو بکرہ کا واقعہ

علامہ السبکی نے اپنی عادت کے مطابق چند حوالوں کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قبر مبارک کی زیارت بھی حجاج کرام کے لیے لازمی ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا حوالہ زیاد کا ہے جو ابو بکرۃ رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے لیکن 44 ہجری میں ان کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ ابو سفیان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اپنے خاندان کا فرد بنا کر اپنی ایک بیٹی کی شادی ان کے بیٹے محمد سے کر دی۔

ابو بکرۃ رضی اللہ عنہ کو جب اس کی خبر ملی تو انہوں نے قسم کھائی کہ اس سے کبھی بات نہیں کریں گے اور اپنے باپ کا بیٹا ہونے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی ماں سمیہ نے ان کے علم کے مطابق کبھی ابو سفیان کو نہیں دیکھا۔ نبی ﷺ کی زوجہ مطہرہ اس کے ساتھ کیا

کریں گی۔ اس سے اس کی کتنی خرابی ہوتی ہے۔ زیاد چاہتا ہے کہ ام المومنین ام حبیبہ کو دیکھ لے، اگرانہوں نے اس سے پردہ کیا تو اس کو ذلیل کر دیں گی اور اگر اس نے ان کو دیکھ لیا تو بہت بڑی مصیبت ہوگی کیونکہ اس سے رسول اللہ ﷺ کی حرمت عظیمہ پامال ہوگی۔

معاویہ کے عہد میں زیاد نے حج کیا اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا لیکن ابوبکرۃ کی بات یاد آنے پر واپس چلا آیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی ﷺ کی زوجہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اس سے پردہ کرلیا اور اس کو داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے حج کیا لیکن ابوبکرۃ کے قول کی وجہ سے زیارت نہ کی۔

یہ عبارت الاستیعاب (ترجمہ زیاد بن ابی سفیان: رقم 841) میں منقول ہے۔

اس عبارت پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ زیاد نے اپنی ولدیت مشکوک کرلی تھی۔ دنیاوی مفاد کی خاطر امیر معاویہ کا ساتھ دیا تھا جس پر ان کے بھائی ناراض ہوگئے تھے۔

الاستیعاب میں یہ بھی منقول ہے امیر معاویہ کے خاندان نے زیاد کو قبول نہیں کیا تھا بلکہ اس کو خلیع وزنج یعنی عاق کیا گیا حبشی بیٹا کہتے تھے۔

جناب قاضی السبکی صاحب کو الاستیعاب کی دو واضح عبارتیں پسند نہ آئیں اور تیسری میں کچھ سہارا دکھائی دیا تو اس کو اپنا لیا۔ وہ جملہ "لَمْ یَزُرْ" ہے۔ اس کا مفعول منقول نہیں۔ معلوم نہیں کہ کس کلیہ اور قاعدہ کے تحت انہوں نے اس کا مفعول رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کو بنالیا اور اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کرلیا۔

لِاَنَّ زِیَارَۃَ الْحَاجِّ کَانَتْ مَعْھُوْدَۃً مِّنْ ذٰلِکَ الْوَقْتِ۔

اس عبارت کا ترجمہ مترجم نے ص 82 میں ان الفاظ میں کیا ہے: اس واقعہ سے

ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت حاجی کے لیے بارگاہ نبوی کی زیارت ایک لازمی بات تھی۔

پھر انہوں نے حج و عمرہ کرنے والوں کے لیے مکہ یا مدینہ سے ابتدا کرنے اور حج و عمرہ کی کتابوں میں مدینہ آنے اور قبر مبارک پر حاضری دینے کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ مدینہ کی مسجد نبوی میں نماز پڑھنا محض فضیلت نہیں بلکہ اصل مقصد قبر مبارک کی زیارت ہوتا ہے کیونکہ نماز کی فضیلت تو مسجد اقصیٰ میں بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ مدینہ المنورہ پہنچنے کا قصد و ارادہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت ہی ہے۔ دوسری جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک عبادت بھی ہے۔

قاضی ابوالفضل عیاض (التوفی 544ھ) کا یہ حوالہ بھی دے دیا:

وَمِمَّا لَمْ یَزَلْ مِنْ شَأْنِ مَنْ حَجَّ الْمُرُوْرُ بِالْمَدِیْنَةِ وَالْقَصْدُ اِلَی الصَّلاۃ فِی مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم وَالتَّبَرُّكُ بِرُؤْیَةِ رَوْضَتِهٖ وَمِنْبَرِهٖ وَقَبْرِهٖ وَمَجْلِسِهٖ وَمَلَامِسِ یَدَیْهِ وَمَوَاطِیٔ قَدَمَیْهِ وَالْعَمُوْدِ الَّذِیْ كَانَ یَسْتَنِدُ اِلَیْهِ وَیَنْزِلُ جِبْرِیْلُ بِالْوَحْیِ فِیْهِ عَلَیْهِ وَبِمَنْ عَمَرَهٗ وَقَصَدَهٗ مِنَ الصَّحَابَةِ وَاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْاِعْتِبَارُ بِذٰلِكَ كُلِّهٖ۔

جس نے حج کیا، اس کا ہمیشہ معاملہ رہا ہے کہ وہ مدینہ جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں نماز پڑھنے کا قصد کرے۔ آپ کے روضہ مبارک، آپ کے منبر، آپ کی بیٹھنے والی جگہوں کو دیکھ کر برکت حاصل کرے۔ جہاں آپ کے قدم مبارک پڑے اور جن ستونوں سے آپ ٹیک لگایا کرتے تھے اور جہاں جبریل آپ پر وحی نازل کیا کرتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور مسلمان ائمہ جنہوں نے اس کو آباد کیا اور اس کا قصد کیا اس اعتبار سے تمام جگہوں سے برکت حاصل کرلے۔

یہ حوالہ نقل کرتے ہوئے علامہ السبکی صاحب کو خیال نہ رہا کہ نزاع صرف قصد و

ارادے کا تھا اور اب بھی ہے۔ قاضی عیاضؒ نے الشفاء میں بہت سی ایسی روایات نقل کی ہیں جو ائمہ کے جرح وتعدیل کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اس کے باوجود قاضی السبکی صاحب نے جو روایت نقل کی ہے اس میں قصد والی بات رسول اللہ ﷺ کی مسجد ہی ہے۔

قاضی عیاضؒ نے اپنی کتاب الشفاء (ج 2 ص 86) میں یہ بھی ابن حبیبؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

يَقُوْلُ اِذَا دَخَلَ مَسْجِدَ الرَّسُوْلِ بِاسْمِ اللّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا مِنْ رَبِّنَا وَاحْفَظْنِىْ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ثُمَّ اِقْصِدْ اِلَى الرَّوْضَةِ وَهِىَ مَا بَيْنَ الْقَبْرِ وَالْمِنْبَرِ فَارْكَعْ فِيْهَا رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ وُقُوْفِكَ بِالْقَبْرِ تَحْمِدُ اللّٰهِ فِيْهَا وَتَسْأَلُهٗ تَمَامَ مَا خَرَجْتَ اِلَيْهِ وَالْعَوْنَ عَلَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ رَكْعَتَاكَ فِىْ غَيْرِ الرَّوْضَةِ اَجْزَأَكَ وَفِى الرَّوْضَةِ اَفْضَلُ وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مَا بَيْنَ بَيْتِىْ وَمِنْبَرِىْ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِىْ عَلٰى تُرْعَةٍ مِنْ تُرْعَةِ الْجَنَّةِ ثُمَّ تَقِفُ بِالْقَبْرِ مُتَوَاضِعًا مُتَوَقِّراً فَتُصَلِّىْ عَلَيْهِ وَتُثْنِىْ بِمَا يَحْضُرُكَ وَتُسَلِّمُ عَلٰى اَبِىْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَتَدْعُوْا لَهُمَا فَاَكْثِرْ مِنَ الصَّلَاةِ فِىْ مَسْجِدِ النَّبِىِّ صَلَى اللّٰهُ عَلَيه وسلم بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَلَا تَدَعُ اَنْ تَأْتِىَ مَسْجِدَ قُبَآءٍ وَقُبُوْرَ الشُّهُدَآءِ۔

جب وہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں داخل ہوتو کہے: بسم اللہ۔ سلام ہو رسول اللہ ﷺ پر اور ہمارے رب کی طرف سے ہم پر بھی سلام ہو۔ اللہ اور اس کے فرشتوں کی رحمت ودعا ہو محمد ﷺ پر۔ اے اللہ! میرے گناہ معاف کردے اور میرے لیے اپنی رحمت وجنت کے دروازے کھول دے اور شیطان رجیم سے میری حفاظت فرما۔ پھر تو روضہ یعنی ریاض الجنہ کا قصد کر جو قبر مبارک اور منبر کے درمیان ہے۔

اس میں دو رکعت نماز قبر مبارک کے پاس کھڑے ہونے سے پہلے پڑھ، ان دونوں میں وہ تمام مانگ جن کے لیے تو نکلا ہے اور ان پر اس کی مدد بھی مانگ۔ اگر ریاض الجنۃ میں تیری وہ دو رکعتیں نہ ہوسکیں تو جہاں بھی پڑھے گا تجھے کفایت کریں گی لیکن ریاض الجنۃ میں پڑھے تو افضل ہوں گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو جگہ میرے منبر اور میرے گھر کے درمیان ہے، وہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر جنتی نالیوں میں سے ایک نالی پر ہے۔

پھر تو قبر مبارک کے پاس تواضع و وقار کے ساتھ کھڑا ہو کر آپ پر درود بھیج اور آپ کی ایسی تعریف کر کہ جو اس وقت تیرے ذہن میں آئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کو بھی سلام کہہ اور دونوں کے لیے دعا کر۔ دن رات نبی ﷺ کی مسجد میں کثرت سے نمازیں پڑھ، مسجد قباء جانا نہ چھوڑنا اور شہداء کی قبور کو بھی نہ بھول جانا۔

علامہ السبکی مطلب کی بات کو لے لیتے ہیں اور صحیح کو چھوڑ دیتے ہیں۔

ایک اعرابی کا واقعہ

قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی نے بڑی کوشش کی کہ حج یا عمرہ کرنے والے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کو واجب و لازم ثابت کیا جائے اور اس کو ایسی صورت دے دی جائے کہ جس سے وہ حج و عمرہ کا ایک اہم رکن بن جائے۔ عقیدت ومحبت اپنی جگہ لیکن مسئلہ کی حقیقت اپنی جگہ۔ اصل بات رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک اور آپ کا عمل ہے۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین، صحابہ، تابعین اور ائمہ حدیث کی ہے۔ خوابوں اور حکایات کو معیار نہیں بنایا جاسکتا لیکن علامہ السبکی صاحب نے ایک اعرابی کی عجیب وغریب حکایت کا بھی سہارا لیا ہے۔ مترجم نے تو اس کو ایمان افروز واقعہ

قرار دیا ہے کہ ایک بدو اپنی سواری پر سوار ہوا اور واپس چلا گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مسافر تھا۔ علامہ موصوف نے ایک بدو کے اپنی سواری پر سوار ہونے سے دلیل بنائی کہ وہ مسافر تھا۔ لہٰذا قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کا قصد کرنا مستحب ہوا۔ پھر انہوں نے محمد بن حرب الھلالی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ مدینہ میں داخل ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس آکر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک اعرابی آیا۔ اور اس نے قبر مبارک کی زیارت کی۔ پھر اس نے کہا: اے خیر الرسل ﷺ! بے شک اللہ نے آپ پر سچی کتاب نازل فرمائی اور اس میں فرمایا:

﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا (النساء:٦٤)﴾

جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کرلیں اور آپ کے پاس آجائیں پھر اللہ سے گناہوں کی معافی مانگیں اور ان کے لیے رسول ﷺ بھی استغفار کریں تو وہ اللہ کو ضرور توبہ قبول کرنے اور رحم کرنے والا پائیں گے۔

میں آپ کے پاس آپ کے رب سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہوئے آپ کو شفیع بنانے کے لیے آیا ہوں۔ دوسری روایت کے مطابق اپنے گناہوں کی بخشش کے لیے آپ سے اپنے رب کے حضور شفاعت کرانے کے لیے آیا ہوں، پھر وہ رویا اور اس نے یہ شعر کہے:

اے وہ بہترین ذات جس کی ہڈیاں میدان میں دفن کردی گئی ہیں
اور ان کی پاکیزگی کی وجہ سے میدان اور ٹیلے پاکیزہ ہو گئے ہیں
میری جان اس قبر پر نثار جس میں آپ مقیم ہیں
اس میں پاک دامنی ہے اس میں سخاوت ہے اور اس میں کرم ہے

پھر اس نے استغفار کی اور واپس چلا گیا اور مجھے نیند آئی اور میں سو گیا۔ میں نے

خواب میں نبی ﷺ کو دیکھا۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے۔ اس شخص سے ملو اور اس کو بشارت دو، بے شک اللہ نے اس کو میری شفاعت سے بخش دیا ہے۔ میں بیدار ہوا اور اس کو تلاش کیا لیکن مجھے وہ نہ ملا۔

حکایت کا جائزہ

مذکورہ روایت کا اصل راوی محمد بن حرب الھلالی ہے۔ اس نے اعرابی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے آخر میں کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو خواب میں حکم دیا کہ اعرابی کو بشارت دو کہ میری شفاعت سے اللہ نے اس کو بخش دیا۔

حکایت کے الفاظ ہیں: فَخَرَجْتُ اَطْلُبُهٗ فَلَمْ اَجِدْهُ میں باہر نکلا۔ اس کو تلاش کرتا رہا لیکن میں نے اس کو نہ پایا۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ محمد بن حرف الھلالی سے اعرابی کی ملاقات نہ ہوئی اور وہ اعرابی سے واقف بھی نہ تھا۔ اگر واقف ہوتا تو اس تک پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کی بشارت سے ضرور اس کو آگاہ کرتا۔ لیکن حکایت میں علامہ السبکی صاحب نے اس کا نام اور اس کا سنِ وفات بھی نقل کر دیا جو 228ھ تھا۔

جس کے لیے بشارت دی گئی تھی اس تک نہ پہنچ سکی۔ یوں اس بشارت کا مقصد پورا نہ ہوسکا۔ اعرابی کی سواری سے اس کے مسافر ہونے کا قیاس بھی اپنے رجحان و میلان کی ساختہ ہے۔ سورۃ النساء کی جس آیت مبارکہ کا حوالہ دیا گیا۔ اس کا نزول منافقوں کے بارے میں ہوا۔ جیسا کہ تفسیر الطبری، تفسیر کبیر، تفسیر الخازن، تفسیر الکشاف، تفسیر النسفی، تفسیر جلالین، تفسیر البیضاوی، تفسیر در منثور اور تفسیر فتح القدیر میں ذکر ہوا۔

اس آیت کا پہلا حصہ ہے: ہم نے رسول اللہ ﷺ کو اس لیے بھیجا تا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور انہوں نے جب اپنی جانوں پر ظلم کر لیا اگر وہ آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے بخشش طلب کرتے اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو اللہ کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔

اگلی آیت کا ترجمہ ہے: قسم ہے آپ کے رب کی، وہ ہرگز ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو اس میں فیصل نہ بنالیں کہ جو ان کے درمیان جھگڑا ہوا ہو، پھر آپ جو فیصلہ کر دیں تو اس کی وجہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور دل و جان سے اس کو قبول کرلیں۔

سورۃ النساء کی آیت 64 اور 65 کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو منع کر دیا کہ وہ اپنا جھگڑا یہود کے کسی سردار یا کاہن کے پاس لے جائیں۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ہوا کرتا تھا۔

چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی زندگی مبارک میں آپ ہی سے فیصلے کراتے اور آپ سے دعائیں کرلیا کرتے تھے۔ صحابہ اور تابعین میں کوئی ایک بھی آپ کی وفات کے بعد آپ کی قبر مبارک پر اپنا جھگڑا لے کر نہ گیا۔ آپ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم میں کئی اختلاف ہوئے لیکن کسی کا فیصلہ آپ سے کروانا منقول نہیں اور نہ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں مروی ہے کہ وہ دعا کرانے کے لیے آپ کی قبر پر حاضر ہوئے۔

حکایت اگرچہ علامہ السبکی کے مطابق بہت مشہور ہے لیکن اس کی سند کیسی ہے اس کا ذکر قاضی صاحب نے نہ فرمایا کیونکہ وہ قابل اعتبار نہیں، لہٰذا اس پر اعتماد کیسے ہوگا۔

جس فصیح اللسان اعرابی محمد بن عبید اللہ بن عمرو بن معاویہ بن عمرو بن عتبہ بن ابی سفیان بن صخر بن حرب (المتوفی 228ھ) کے حوالے سے حکایت نقل کی ہے۔ علامہ قاضی السبکی صاحب نے اس کی ثقاہت وصداقت کے بارے میں ائمہ حدیث کے کسی

حوالے کا ذکر نہیں کیا۔ اگرچہ خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد (ج 2 ص 326) میں اور ابن قتیبہ کی المعارف (ص 234) میں بغیر حکایت کے اس کا ترجمہ موجود ہے۔ ابن قتیبہ کا کہنا ہے: وہ شاعر تھا۔ اس کے بیٹے مر گئے جبکہ خطیب بغدادی کے مطابق ایک بیٹا مر گیا اور وہ وہاں پہنچ نہ پایا۔ لہٰذا ان کے فراق میں مرثیہ خوانی کیا کرتا تھا اور شراب میں دھت رہتا تھا۔

مثیر الغرام الساکن الی اشرف الاماکن

امام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن محمد بن علی الجوزی الشافعی کی یہ کتاب حج کے بارے میں ہے۔ امام ابن الجوزی (510ھ یا 513ھ) میں پیدا ہوئے اور ان کی وفات 597ھ میں ہوئی۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے خطیب اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے درس میں امراء اور وزراء بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں بھی شیعہ سنی کا مسئلہ موجود تھا۔ لہٰذا عباسی خلفاء کو خوش رکھنا بھی ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم پر درود وسلام بھیجتے ہوئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور عباسی خلفاء کو بھی ساتھ رکھا ہے اور کتاب کے آخر میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب 553ھ کے رمضان المبارک کے وسط میں تالیف کی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کی ابتدائی کتابوں میں سے ایک تھی جس میں انہوں نے ایسی بعض روایات کو شامل کر لیا کہ جن کی صحت معیار کے مطابق نہ تھی۔

ریاض (سعودی عرب) کے مکتبہ ''دارالرایۃ'' کی شائع کردہ کتاب کے محقق مرزوق علی ابراہیم نے مقدمہ میں کتاب کے ابواب وخصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے:

لقد اورد المؤلف بعض الاحادیث الموضوعة والاخبار التالفة التی لا

تغنی ولا تسمن فی الکتاب و کذلک اورد بعض الحکایات والقصص الغریبۃ والتی یتعجب منھا المرء۔

مؤلف نے بعض موضوع احادیث اور ہلاک کرنے والی ایسی خبریں بھی وارد کردی ہیں کہ جن کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی کتاب کے حجم میں اضافہ کرتی ہیں۔ ایسے ہی بعض غریب قصے اور حکایات بھی وارد کردیئے ہیں کہ جن سے آدمی کو تعجب ہوتا ہے۔

امام ابن الجوزی نے قبر مبارک کی زیارت کے سلسلہ میں باب باندھا ہے:

''ان کلمات کا ذکر جو میں نے آپ کی قبر کی زیارت کرنے والوں سے سن کر یاد کر لیے اور وہ احوال جو ان میں وقوع پذیر تھے۔''

یہ بھی خیال رہے کہ امام ابن الجوزی نے 553ھ میں حج کیا اور یہ کتاب لکھی اور جن سے حکایت سنی ان کا نام عبدالخالق بن یوسف تھا اور ان کی وفات کتاب کے لکھے جانے سے پانچ سال پہلے یعنی 548ھ میں ہو چکی تھی۔ (شذرات الذھب ج4 ص148)

مذکورہ باب میں انہوں نے قاضی صاحب والی حکایات کے علاوہ ابراہیم بن شیبان کا حجرہ مبارکہ میں سے اپنے سلام کا جواب سننا، خواب میں روٹی کا ملنا، ایک عورت کا آپ کی قبر مبارک کو دیکھ کر مر جانا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کا یہ شعر:

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّھَا　　صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ عُدْنَ لَیَالِیَا

(مجھ پر اتنی مصیبتیں گرائی گئیں اگر وہ دنوں پر گرائی جاتیں تو وہ راتوں میں تبدیل ہو جاتے۔)

مذکورہ واقعات بھی نقل کیے ہیں۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا یہ شعر رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بارے میں تھا۔ قاضی السبکی صاحب اگر وہاں ہوتے تو ان کو بتا دیتے، مصیبت کی کوئی بات نہیں۔ آپ قبر مبارک میں حیاتِ دنیا والی زندگی میں ہی ہیں۔

مذکورہ باب میں جو بھی انہوں نے نقل کیا ہے اس کے صحیح اور ثابت ہونے پر امام ابن الجوزی نے کوئی گواہی نہیں دی بلکہ ان کو سنی سنائی باتوں کے کھاتے میں ڈال دیا اور "باب فضل الصلوٰۃ" کی رقم 270 میں انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایت یہ نقل کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نبیوں علیہم السلام کو ختم کرنے والا ہوں یعنی سلسلہ نبوت کا میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد بھی انبیاء علیہم السلام کی بنائی ہوئی مساجد میں آخری مسجد ہے۔ لہٰذا یہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کی زیارت کی جائے اور سواریوں پر اس طرف سفر کیا جائے کیونکہ دوسری مساجد میں پڑھی جانے والی نماز سے میری مسجد والی نماز ایک ہزار نمازوں سے افضل ہوگی۔ سوائے مسجد حرام کے۔

قاضی صاحب نے ان احادیث کو چھوڑ دیا جو ان کے خلاف جاتی تھیں اور ان کو اپنا لیا جو ان کے حق میں تھیں خواہ وہ ضعیف وموضوع اور سنی سنائی روایات وحکایات ہی تھیں۔

رہی بات ابن عساکر کی تو انہوں نے ائمہ حدیث کے نزدیک بہت سی ضعیف و موضوع روایات کو اپنی تاریخ کا حصہ بنایا ہے۔ اصل بات حدیث وروایات کا صحیح اور ائمہ حدیث کے معیار کے مطابق ہونا ہے۔ اگر حدیث صحیح ہو تو اس کا اپنانا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہو جاتا ہے۔

قاضی صاحب نے حکایت کا ذکر اس طرح فرمایا: گویا کہ وہ ہمارے دین کی اساس ہے اور ان کو سورۃ النساء کی وہ آیت نظر نہیں آئی کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

﴿وَ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (۱۱۰)﴾

اور جو کوئی برا عمل کرتا ہے یا اپنی جان پر ظلم کر لیتا ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتا ہے تو وہ اللہ کو بڑا ہی بخشنے والا رحم کرنے والا پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جب خود اتنی بڑی بشارت دے دی تو ایک بے سند اور سنی سنائی حکایت کی اس کے مقابلے میں کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔کیسی عجیب بات ہے۔اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بخشش ورحمت سے نوازنے کے لیے کسی سفارش اور واسطے کی کوئی شرط عائد نہیں کی مگر قاضی صاحب کا اصرار تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو ان کی وفات کے بعد اللہ کی بخشش کے حصول کے لیے سفارشی بنایا جائے اور انہی کے واسطے سے دعا مقبول ہوتی ہے۔اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ پر افتراء اور کیا ہوگی۔

مدینہ طیبہ جانا حج وعمرہ کا رکن نہیں بلکہ مستحب ہے

حج وعمرہ سے فارغ ہونے کے بعد یا اس سے پہلے مدینہ طیبہ جا کر مسجد نبوی میں نمازیں پڑھنے اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس جا کر سلام کہنے،مقام محمود اور مقام وسیلہ آپ کو لے کے جانے اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا آپ پر نزول ہونے کی دعا کرنے اور آپ کے دو رفیقوں حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی سلام کہنے کی عظیم سعادت حاصل ہوتی ہے اور اس مسجد کو بھی دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ جس میں آپ نمازیں پڑھایا کرتے، پہلی اسلامی ریاست کے تمام معاملات طے کیا کرتے تھے، جہاں سے اسلام کی روشنی نکلی اور دنیا میں پھیل گئی۔ جہالت کے اندھیرے نور ہدایت میں تبدیل ہوگئے۔شہداء کے احد اور جنت البقیع کی قبروں کی زیارت کرنے سے اسلامی ریاست کے ابتدائی دور کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔مسجد قبلتین میں نفل پڑھنے سے صحابہ کی بے مثال اطاعت کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔مسجد قباء میں دو نفل عمرہ کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔سب سے بڑی نعمت مسجد نبوی میں ایک پڑھی جانے والی نماز ایک ہزار نمازوں کے برابر ہوجاتی ہے۔ریاض الجنۃ میں کی جانے والی عبادت کی

اپنی ہی لذت واہمیت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مدینہ جانا حج وعمرہ کا حصہ نہیں مگر حج وعمرہ کرنے والے ہر شخص کی دلی خواہش وکوشش ہوتی ہے کہ وہ مدینہ طیبہ ضرور جائے اور وہاں ملنے والا وقت اللہ کی بندگی وعبادت میں آپ کے نمونہ کے مطابق گزارے۔

ابو داؤد (رقم 1949)، الترمذی (رقم 889)، النسائی (رقم 3019)، ابن ماجه (کتاب المناسک)، ابو داؤد الطیالسی (رقم 1056)، مسند احمد (ج4 ص335)، الدارمی (کتاب المناسك، رقم 448)، الدار قطنی (کتاب الحج)، المستدرک (ج1 ص464)، البیهقی (ج5 ص116)، ابن حبان الموارد (رقم 1009)، ابن خزیمه (رقم 2822)، الطحاوی (شرح معانی الآثار) (ج2 ص209-210)، الحمیدی (ج2 ص399، رقم 899)، الحلیة (ج7 ص119-120) میں عبدالرحمٰن بن یعمر سے مروی ہے: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ عرفہ میں کھڑے تھے کہ آپ کے پاس اہل نجد کے چند لوگ آئے اور انہوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! كَيْفَ الْحَجُّ۔ حج کیسے ہوگا۔ آپ نے فرمایا: اَلْحَجُّ عَرَفَةُ۔ حج عرفات کے میدان میں ہوگا۔

فَمَنْ جَآءَ قَبْلَ صَلوٰةِ الْفَجْرِ لَيْلَةَ جَمْعٍ فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ۔ ''جو لَيْلَةَ جَمْعٍ یعنی مزدلفہ والی رات فجر کی نماز سے پہلے آ گیا تو اس کا حج پورا ہو گیا۔''

جامع الترمذی کے الفاظ ہیں: فَقَدْ اَدْرَكَ الْحَجَّ۔ اس نے حج پالیا۔ امام سفیان بن عیینہ کا بیان ہے۔ سفیان ثوری کی بیان کردہ تمام احادیث میں سے یہ بہترین ہے۔

لہٰذا حج اور عمرہ تو مکہ میں ہی پورے ہو جاتے ہیں لیکن مدینہ طیبہ جا کر مذکورہ شرعی کام شرع کے مطابق کرنے مستحب وپسندیدہ ہیں۔

۷

شفاء السقام کا چوتھا باب

اس باب میں محترم علامہ تقی الدین السبکی نے بہت سے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت مستحب ہے۔ امام ابن تیمیہ بھی اس کو مستحب ہی کہا کرتے تھے۔ اس پر امت محمدیہ کے علماء کا اتفاق ہے جیسا کہ قاضی عیاض نے اپنی کتاب الشفاء میں لکھا ہے اور اسی کی تائید میں علامہ السبکی صاحب نے قاضی ابو الطیب، الشیخ محاملی، ابوعبداللہ الحسین الحلیمی، امام الماوردی صاحب المھذب، القاضی حسین، امام رویانی، علماء احناف، حسن بن زیاد، ابو العباس السروجی، ابو الخطاب محفوظ حنبلی، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ السامری الحنبلی، ابومنصور کرمانی حنفی، نجم الدین ابن حمدان حنبلی، امام ابن جوزی، الشیخ ابن قدامہ، علمائے مالکیہ، عبدالحق، ابن ابی زید، ابو الولید، ابن رشد المالکی، ابومحمد عبدالکریم، امام عبدی، ابراہیم الحربی، امام مالک اور امام عبدالرزاق سے مختلف روایات نقل کی ہیں۔

محترم مصنف نے مسئلے کو سلجھانے کی بجائے الجھانے کی کوشش کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب فرمادیا: كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا (صحیح مسلم: کتاب الجنائز) "میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب ان کی زیارت کیا کرو۔" صحیح مسلم کی دوسری روایت میں اس کی آپ نے حکمت بھی بیان فرمادی۔

فَإِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْمَوْتَ "بے شک وہ تمہیں موت یاد دلائیں گی"۔

جبکہ مسند احمد (ج 3 ص 38) اور المستدرک (ج 1 ص 375) کی روایت

کے مطابق آپ نے فرمایا: فَاِنَّ فِيهَا عِبْرَة ''بلاشبہ ان میں عبرت ہے۔''

امام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ سے الام (ج1 ص278) کے ''باب القول عند دفن المیت'' میں یہ بھی منقول ہے: اِذَا زُرْتَ تَسْتَغْفِرِ لِلْمَيِّتِ وَيُرِقُّ قَلْبَكَ وَتَذْكُرُ اَمْرَ الْاٰخِرَةِ۔ ''جب تو زیارت کرنے تو میت کے لیے استغفار کر اور وہ تیرے دل کو نرم کردے اور تو آخرت کے معاملے کو یاد کرلے۔''

لہٰذا بات قبر مبارک کی زیارت کی نہیں بلکہ محض زیارت کے لیے مجرد سفر کرنے کی ہے۔ زیارت کے مستحب ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں، علامہ السبکی صاحب نے خود بھی امام الماوردی کی الاحکام السلطانیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے: وَاِنْ لَمْ يَكُنْ مِنْ فُرُوضِ الْحَجِّ فَهُوَ مِنْ مَنْدُوبَاتِ الشَّرْعِ الْمُسْتَحَبَّةِ وَعَادَاتِ الْحَجِّ الْمُسْتَحْسَنَةِ۔ ''اگرچہ حج کے ارکان میں سے نہیں لیکن شرعی مستحبات میں سے ہے اور حاجیوں کی اچھی عادات میں سے ہے۔''

علامہ السبکی کے درج کردہ حوالوں میں سے ایک عبدالحق الصقلی کا ہے جس نے الشیخ ابوعمران المالکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت واجب ہے۔ اس وجوب کی وضاحت قاضی عیاض نے الشفاء (ج2 ص84) میں یہ کی ہے کہ اس سے مراد ترغیب و تاکید ہے، فرض والا وجوب نہیں۔ ویسے بھی علمائے امت کے نزدیک مستحب ہی ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حکایت

اعرابی کی حکایت کی طرح علامہ موصوف نے ایک اور بے اصل حکایت خلیفہ ابو جعفر منصور المنصور (المتوفی 158ھ) اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی 179ھ) کے بارے

میں بھی ابن حمید (المتوفی 248ھ) سے نقل کردی۔ علامہ السبکی اپنے زمانے کے اہل علم میں شمار ہوتے تھے۔ تبھی ان کو شام کا چیف جسٹس بنایا گیا اور ان کے ہمعصر دو بہت بڑے عالم ان کے قریب تھے بلکہ ان کے بعد چیف جسٹس مقرر ہونے والے بیٹے کے استاد تھے۔ دونوں احادیث کے راویوں کی پرکھ کرنے میں ممتاز و ماہر تھے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی شفاء السقام ان کو کیوں نہ دکھائی۔ شاید اس لیے کہ وہ دونوں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بھی بہت قریب اور ان سے دلی لگاؤ رکھنے والے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں ہی شافعی یعنی علامہ موصوف کے ہم مسلک تھے لیکن علم الحدیث میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے جو عزت و مقام عطا فرمایا تھا اس سے وہ بہت اچھی طرح آگاہ تھے۔ اگر وہ دونوں علامہ صاحب کی کتاب دیکھ لیتے تو وہ اس کی اشاعت کا یقیناً مشورہ نہ دیتے کیونکہ سندوں کے اعتبار سے علامہ صاحب کی اس کتاب کا کوئی معیار نہیں۔ وہ ایسی کتابوں کے عموماً ایسے حوالوں کو اپنی سوچ کا جواز بناتے ہیں جن کی صحت مشکوک ہوتی ہے۔ پڑھنے والے کتاب کی عبارت کو دیکھتے ہیں، لکھنے والے کے رتبہ وشان یا منصب کو نہیں دیکھتے۔ ہوسکتا ہے کہ صاحب منصب کی زندگی میں اس کی لکھی ہوئی کتاب کی تعریف کردیں لیکن اس کی وفات کے بعد کتاب تو وہی مقبول ہوتی ہے جو اہل علم کے معیار کے مطابق ہو۔

یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ اکثر سیرت نگار اور تاریخ دان ائمہ حدیث کی طرح علم الرجال کے فن کے ماہر نہیں ہوتے، اگر ماہر ہوں بھی تو ان سے کہیں نہ کہیں کوتاہی ضرور ہوجاتی ہے کیونکہ رجال کا فن ہمارے دین کا مشکل ترین شعبہ ہے۔ اس میں راویوں کی پرکھ کا کام انتہائی مشکل ہے۔ ائمہ حدیث کا یہ کمال تھا کہ قرآن حکیم کے ہی حافظ نہیں بلکہ ہزاروں احادیث کے قول اور ان کی اسناد ان کو حفظ ہوتی تھیں۔ ضعیف اور مضبوط راوی

کے بارے میں ان کو مکمل آگاہی ہوتی تھی۔ ایک دوسرے سے مل کر من گھڑت اور کمزور احادیث کو صحیح اور مضبوط احادیث سے الگ کرنے میں ممد و معاون رہتے تھے۔ اس وقت ہزاروں راویوں کے حالات زندگی اور ان کے کردار کو کتابوں میں جمع کر دیا گیا۔ جس سے حدیث کے صحیح یا غیر صحیح کا علم ہو جاتا ہے۔

علامہ السبکی نے سیرت کی کتاب الشفاء (ج 3 ص 41) سے حکایت یوں نقل کی ہے کہ امیر المومنین ابو جعفر منصور کی کچھ گفتگو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مسجد نبوی میں ہوئی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابو جعفر سے کہا: امیر المومنین اس مسجد میں زور سے نہ بولیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (الحجرات:۲)﴾

اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو۔

امام صاحب نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ اللہ نے اس قوم کی تعریف کی ہے جو اپنی آوازوں کو اللہ کے رسول ﷺ کے پاس نیچی رکھتے ہیں۔

اللہ نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ جو آپ کو حجرات کے پیچھے سے ہی پکارتے ہیں۔ ان کے اکثر عقل نہیں رکھتے۔ آپ کے فوت ہونے کے بعد آپ کی حرمت اسی طرح ہے جس طرح آپ کی حیات طیبہ میں تھی۔ ابو جعفر امام صاحب کی یہ بات سن کر شرمندہ ہو گیا اور اس نے کہا: اے ابا عبداللہ قبلہ رو ہو کر دعا کروں یا آپ کی قبر مبارک کی طرف رخ کر کے دعا کروں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: آپ سے روگردانی کیوں کرتے ہو جبکہ آپ ہی تمہارے اور تمہارے باپ آدم کے لیے قیامت کے روز وسیلہ ہوں گے۔ آپ کی طرف چہرہ کر کے آپ کو شفیع بناؤ، آپ کی شفاعت تمہارے حق میں اللہ قبول فرمائے گا۔

سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ(٦٤)﴾ ''اور جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کرلیا تو آپ کے پاس آجاتے، پھر اللہ سے بخشش چاہتے۔'' علامہ موصوف کا بیان ہے۔ امام مالک کے کلام کو دیکھو، کس عمدگی سے زیارت اور توسل اور آپ کے ساتھ حسنِ ادب کو بیان فرمایا۔

اس حکایت و روایت کے راوی کا نام محمد بن حمید ہے۔ اس نے یہ قصہ اس طرح بیان کیا ہے جیسے وہ وہاں موجود تھا اور اس نے امام مالک رحمہ اللہ اور ابو جعفر کی پوری گفتگو سنی لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ خلیفہ ابو جعفر المنصور کی وفات 158ھ میں ہوئی۔ جب وہ حج کرنے مکہ آتے ہوئے راستے میں ہی بیمار ہوگیا اور چھ ذوالحجہ حج سے پہلے ہی اللہ کا اٹل قانون اس پر جاری ہوگیا۔ روایت کے راوی کی وفات ائمہ رجال کے مطابق 248ھ میں ہوئی۔ دونوں کے درمیان نوے سال کا فرق ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس راوی کی عدالت وصداقت کیسی تھی۔ اس بارے حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب (ج 9 ص 127 رقم 180) امام خطیب نے تاریخ بغداد (ج 2 ص 259 رقم 733) اور علامہ السبکی کے بیٹے کے استاد امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج 3 ص 530 رقم 745) میں لکھا ہے: وہ ضعیف راوی ہے۔ یعقوب بن شیبہ کا کہنا ہے: بہت زیادہ منکر روایات بیان کرنے والا ہے۔ امام بخاری نے کہا: اس کی روایات کے بارے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ امام ابوزرعہ نے اس کو جھٹلا دیا یعنی اس کو جھوٹا قرار دے دیا۔

فضلک رازی نے کہا: اس کے پاس ابن حمید کی پچاس ہزار حدیثیں ہیں۔ جن میں سے وہ ایک حرف بھی بیان نہیں کرتے یعنی ذخیرہ تو ان کے پاس موجود ہے لیکن اس میں سے کچھ بھی بیان نہیں کیا جاسکتا۔

الکوسج کا کہنا تھا: میں گواہی دیتا ہوں، بے شک وہ کذاب ہے۔

صالح جزرہ نے کہا: ہم ابن حمید کو جھوٹا سمجھتے تھے۔ میں نے اللہ پر جھوٹ بولنے میں اس سے بڑھ کر جرأت کرنے والا کوئی نہ دیکھا۔ وہ لوگوں سے احادیث سن کر بعض کو بعض سے بدل دیتا تھا۔

ابن خراش کا بیان ہے: ہم سے ابن حمید نے حدیث بیان کی اور اللہ کی قسم وہ جھوٹ بولتا تھا۔ ایک سے زیادہ کہنے والوں نے کہا: حدیث چراتا تھا۔

امام نسائی نے کہا: وہ ثقہ راوی نہ تھا۔

ابو احمد عسال کا کہنا تھا: میں نے فضلک رازی کو کہتے سنا: میں محمد بن حمید کے پاس گیا وہ احادیث کے متون پر اسناد چڑھا رہا تھا۔

امام الذہبی کا اپنا بیان ہے: اس کو قرآن بھی حفظ نہ تھا۔ امام محمد بن جریر الطبری نے بتایا: محمد بن حمید الرازی نے ہمیں قرآن سنایا اور اس نے سورۃ الانفال کی 30 نمبر آیت کو یوں پڑھا۔ لُیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ یعنی اس نے لُیُثْبِتُوْکَ کے لام پر کسر کی بجائے ضمہ پڑھا۔

جس راوی کے بارے میں ائمہ رجال کا یہ فیصلہ ہو تو اس کی بیان کردہ حکایت و روایت کیسے قبول ہو سکتی ہے۔ جھوٹے راوی کی روایت بھی جھوٹ ہی ہو گا۔

روایت نقل کرنے کا مقصد

دیکھنے والی بات یہ ہے کہ علامہ السبکی صاحب ضعیف و موضوع روایت نقل کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ سورۃ النساء والی آیت کا بار بار ذکر کر کے بتانا یہ چاہتے تھے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں لوگ آپ سے دعا کرایا کرتے تھے۔ ویسے

ہی اب بھی آپ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر دعا کرنے والے کے لیے دعا فرماتے ہیں اور آپ کی وفات وحیات میں کوئی فرق نہیں۔

کسی بھی عقلمند کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کیونکہ اگر آپ کی حیات و ممات میں کوئی فرق نہیں تو آپ کے بعد خلفائے راشدین آپ کے منبر پر کیوں کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے اور آپ کے مصلّے پر کھڑے ہو کر صحابہ اور تابعین کو نمازیں کیوں پڑھایا کرتے تھے۔ آپ کے بعد پیش آنے والے حالات میں آپ سے راہنمائی کیوں نہ لیا کرتے تھے۔

قرآن حکیم کے مطابق ہر نبی و رسول کو حکم تھا کہ وہ اپنی قوم کو کل کائنات کے خالق و مالک کی طرف بلائے اور ان کے عقائد باطلہ کی نفی کرے۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکوں میں یہی خرابی تھی۔ وہ اللہ پر ایمان رکھنے کے ساتھ اپنے نبیوں اور ولیوں کے بارے میں یہ ایمان رکھتے تھے کہ وہ ان کی فریاد سن کر فریاد رسی کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت کیوں فرمائی۔ اس کی واحد وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اللہ کا حق اپنے نبیوں کو دے دیا جس اللہ کا علم ہر جگہ موجود ہے، جو ہر شے کو محیط ہے۔ اس کو پکارنے کی بجائے وہ اپنے نبیوں کو پکارا کرتے تھے۔

یہی بیماری مکہ کے مشرکوں میں تھی اور یہی آج اہل اسلام میں پیدا ہو چکی ہے۔ مکہ کے مشرک اللہ تعالیٰ کو ہی خالق و مالک مانتے تھے، مصائب میں خالصۃً اسی کو پکارا کرتے تھے۔ عبدالمطلب کا مشہور واقعہ ہے کہ ابرہ کے حملہ کے وقت اس نے صرف اللہ تعالیٰ کو پکارا اور اسی کو اپنے گھر کی حفاظت کرنے کی درخواست کی۔

سورۃ العنکبوت میں اللہ تعالیٰ کا مکہ کے مشرکوں کے بارے اپنا اعلان ہے:

﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ (٦٥)﴾

جب وہ کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو دین کو خالص کرتے ہوئے صرف اللہ کو پکارتے ہیں مگر جب اللہ ان کو کنارے لگا دیتا ہے تو پھر شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔

سورۃ الزمر میں ان کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (٣)﴾

اور وہ جنہوں نے اللہ کے سوا اولیاء بنا رکھے ہیں ان کا کہنا ہے ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں تا کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔

سورۃ یونس میں مزید وضاحت ہوتی ہے۔

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (١٨)﴾

اور وہ اللہ کے علاوہ ان کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع ہی دے سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے نزدیک ہمارے سفارشی ہیں۔ آپ کہہ دیں کیا اللہ کو تم اس کی خبر دیتے ہو جو وہ آسمانوں اور زمین میں جانتا نہیں۔ وہ پاک و بلند ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔

بڑی ہی عجیب بات ہے کہ کفار مکہ جب جنگ بدر کے لیے مکہ سے روانہ ہونے لگے تھے تو انہوں نے اس وقت جو دعا کی اللہ نے اس کو سورۃ الانفال کا حصہ بنا دیا:

﴿وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (٣٢)﴾

اور جب انہوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ قرآن تیرے پاس سے حق ہے تو ہم پر آسماں سے پتھروں کی بارش برسا دے یا ہمیں دردناک عذاب دے۔

کس قدر بدنصیب تھے کہ خود ہی اللہ سے عذاب مانگ لیا یہ نہ کہا کہ اللہ! اگر یہ حق ہے تو اس پر ایمان لانے کی ہمیں توفیق عطا فرما دے۔

مگر ہماری بحث تو اس سے ہے کہ مکہ کے مشرک اللہ تعالیٰ کے منکر نہ تھے۔ ان کا کفر وشرک اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک کرنا تھا اور غیر اللہ کو شریک کرنے میں ان کا مقصد صرف قرب الٰہی کے لیے ان کی شفاعت کا حصول ہی ہوتا تھا۔ وہ اپنے باطل معبودوں سے مال، اولاد یا دنیا میں فائدہ دینے والی چیزوں کے طلبگار نہیں ہوا کرتے تھے۔

مسئلہ شفاعت

علامہ السبکی صاحب نے رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کرنے اور زیارت کے ذریعے شفاعت کے حصول کے لیے دعا کرانے کی اپنی کتاب میں خوابوں، حکایات اور ضعیف وموضوع روایات کے ذریعہ بار بار ترغیب دی ہے۔ بلکہ یہ بشارت بھی دے دی کہ ان کو خصوصی شفاعت نصیب ہوگی۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ حدیث شفاعت کو دیکھ لیا جائے کہ زیارت کرنے والوں کا اس میں کہاں ذکر ہوا ہے۔

صحیح بخاری (کتاب التفسیر رقم 4476، کتاب الرقاۃ رقم 6565، کتاب التوحید رقم 7510) اور صحیح مسلم (کتاب الایمان: باب اثبات الشفاعۃ و اخراج الموحدین من النار ج1 ص108) میں انس ؓ سے مروی ہے:

نبی ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن مومنوں کو روک لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کی وجہ سے فکرمند ہوں گے۔ پھر وہ کہیں گے: کاش کہ ہمارے رب کی طرف

ہماری کوئی سفارش کرے اور اس غم وفکر سے ہمیں راحت دلائے۔ پس وہ آدم علیہ السلام کے پاس آکر کہیں گے۔ آپ ہی لوگوں کے باپ آدم ہیں۔ اللہ نے آپ کی تخلیق اپنے ہاتھ سے کی اور اپنی جنت میں آپ کو بسایا اور فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور ہر شئے کے آپ کو نام سکھائے لہٰذا اپنے رب کے پاس ہمارے لیے سفارش کریں، تاکہ وہ ہمیں اس غم وفکر سے راحت دے۔ آدم علیہ السلام کہیں گے: میں اس بارے تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا اور ان کو ممنوعہ درخت کا پھل کھانے والی خطا یاد آجائے گی۔ وہ کہیں گے: تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ پہلے نبی تھے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں بسنے والوں کی طرف بھیجا تھا۔

ان کے کہنے کے مطابق تمام مومن نوح علیہ السلام کے پاس آکر سفارش کرنے کی بات کریں گے تو وہ کہیں گے: میں تمہارا یہ کام نہیں کرسکتا اور ان کو اپنی وہ خطا یاد آجائے گی جو علم کے بغیر انہوں نے اپنے رب سے سوال کیا تھا لیکن وہ کہیں گے کہ تم رحمٰن کے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

تمام مومن ابراہیم علیہ السلام کے پاس آکر وہی بات کریں گے تو وہ بھی کہیں گے: میں تمہارا یہ کام نہیں کرسکتا۔ ان کو تین جھوٹ یاد آجائیں گے لیکن وہ مشورہ دیں گے کہ تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ جن کو اللہ نے تورات عطا فرمائی اور ان سے کلام کیا اور سرگوشی کے لیے نزدیک کیا۔

تمام مومن موسیٰ علیہ السلام کے پاس آکر اپنا مقصد بیان کریں گے تو وہ کہیں گے میں تمہارا یہ کام نہیں کرسکتا۔ اور اپنی خطا کو یاد کریں گے جو ایک انسان کے قتل کی صورت میں ان سے ہوئی لیکن وہ کہیں گے: تم اللہ کے بندے، اس کے رسول، روح اللہ اور اس کے کلمہ سے وجود میں آنے والے عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

تمام مومن جب عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر اپنا مقصد بیان کریں گے تو وہ کہیں گے: میں تمہارا یہ کام نہیں کر سکتا بلکہ تم محمد ﷺ کے پاس جاؤ، وہ اللہ کے ایسے بندے ہیں کہ جن کے اگلے پچھلے تمام گناہ اللہ نے معاف کر دیئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پس تمام مومن میرے پاس آئیں گے میں اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت چاہوں گا اور مجھے اجازت دے دی جائے گی جیسے ہی میں اس کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر جاؤں گا۔ جب تک وہ چاہے گا مجھے سجدہ کی حالت میں رہنے دے گا۔ پھر فرمائے گا: اے محمد! اپنے سر کو اٹھاؤ۔ کہو! آپ کی بات سنی جائے گی۔ شفاعت کریں شفاعت قبول کی جائے گی۔ سوال کریں پورا کیا جائے گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اپنے رب کی ایسی حمد و ثنا کروں گا جو اس وقت وہ مجھے سکھائے گا، پھر میں شفاعت کروں گا۔ میرے لیے ایک حد مقرر کی جائے گی کہ ان کو جہنم سے نکال لو، چنانچہ میں ان کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دوں گا۔

میں پھر دوسری مرتبہ اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت چاہوں گا جو مل جائے گی، اس کو دیکھتے ہی سجدے میں گر جاؤں گا جب تک اللہ چاہے گا، سجدے میں رہوں گا، پھر وہ فرمائے گا: اے محمد! اٹھیے کہیے! آپ کی بات سنی جائے گی، شفاعت کریں، قبول ہوگی، سوال کریں، پورا کیا جائے گا۔ میں اپنے سر کو اٹھاؤں گا اور اپنے رب کی ایسی حمد و ثنا کروں گا کہ جو اس وقت مجھے سکھائی جائے گی۔ پھر میں شفاعت کروں گا اور میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی کہ ان کو جہنم میں سے نکال لیں، میں ان کو جہنم میں سے نکال کر جنت میں داخل کر دوں گا۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ تیسری مرتبہ اجازت چاہوں گا اور حدیث کے وہی الفاظ ہیں کہ جو پہلی دو کے ہیں لیکن آخری جملہ یہ ہے: یہاں تک کہ جہنم میں وہی رہے گا کہ جس کو قرآن روک لے گا اور اس پر جہنم میں ہمیشہ رہنا واجب ہوگا۔ پھر آپ نے سورۃ بنی اسرائیل کی آیت کا یہ حصہ پڑھا: اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۷۹) قریب ہے کہ آ ب کا رب آپ کو مقام محمود پر کھڑا کردے۔ پھر آپ نے فرمایا: یہ وہ مقام محمود ہے کہ جس کا وعدہ اللہ نے تمہارے نبی سے کر رکھا ہے۔

انس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

جب مجھ سے کہا جائے گا کہ شفاعت کریں قبول ہوگی تو میں عرض کروں گا: یَا رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ. اے میرے رب! میری امت، میری امت یعنی اس پر رحم فرما۔

ارشاد ہوگا: جاؤ جس کے دل میں جَو کے دانے برابر ایمان ہے اس کو جہنم سے نکال لو، میں جاؤں گا اور ویسا ہی کروں گا۔

پھر لوٹ کر اس کی حمد بیان کرتے ہوئے سجدے میں گر جاؤں گا۔ ارشاد ہوگا: اپنے سر کو اٹھائیں، کہیے آپ کی بات سنی جائے گی۔ سوال کریں، پورا کیا جائے گا، شفاعت کریں قبول ہوگی۔ تو میں عرض کروں گا۔ اے میرے رب! میری امت، میری امت۔

ارشاد ہوگا: جائیں جس کے دل میں رائی کے دانے برابر ایمان ہے اس کو نکال لے۔ رسول اللہ ﷺ جب تیسری مرتبہ پھر ویسا ہی بارگاہ الٰہ میں عرض کریں گے تو ارشاد ہوگا کہ جس کے دل میں ادنیٰ سے ادنیٰ رائی کے دانے برابر ایمان ہے اس کو بھی نکال لیں۔

جب چوتھی مرتبہ شفاعت کی اجازت ملے گی تو آپ عرض کریں گے۔

يَا رَبِّ ائْذَنْ لِيْ فِيمَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ لَيْسَ ذٰلِكَ لَكَ وَلٰكِنْ عِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ وَكِبْرِيَائِيْ وَعَظْمَتِيْ لَاُخْرِجَنَّ مِنْهَا مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

اے میرے رب! مجھے ان کے بارے میں بھی اجازت دے جنہوں نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اقرار کیا۔ ارشاد ہوگا: اس کی آپ کو اجازت نہیں۔ بلکہ قسم ہے مجھے میری عزت و میرے جلال کی اور میری کبریائی و میری عظمت کی، میں جہنم میں سے ان کو ضرور نکالوں گا کہ جنہوں نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اقرار کیا۔

صحیح بخاری (کتاب الرقاق: رقم 6570) میں ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

میں نے عرض کیا:

اللہ کے رسول! لوگوں میں سے قیامت کے روز آپ کی شفاعت پانے کی سعادت سب سے زیادہ کس کو نصیب ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوھریرہ! میرا گمان تھا کہ تجھ سے پہلے کوئی یہ سوال نہیں کرے گا کیونکہ حدیث کے سننے پر سب سے زیادہ تو ہی حریص ہے۔

قیامت کے روز میری شفاعت کی سب سے زیادہ سعادت اس کو نصیب ہوگی جو دلی خلوص کے ساتھ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والا ہوگا۔

ابو داؤد (کتاب السنة باب الشفاعة ص 652)، ابن ماجه (کتاب الزهد باب ذکر الشفاعة ص 319)، جامع الترمذی (باب ماجاء فی الشفاعة ج2 ص79) میں انس رضی اللہ عنہ اور جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شَفَاعَتِيْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِيْ۔ میری شفاعت میری امت کے بڑے گناہوں کے مرتکب

ہونے والوں کے لیے ہوگی۔

شفاعت کے بارے میں وضاحت

شفاعت کے بارے میں اور بھی کئی احادیث ہیں۔ اگر قاضی تقی الدین السبکی کا انداز اختیار کیا جائے تو کئی صفحات سیاہ ہو سکتے ہیں لیکن جس مقصد کے لیے شفاعت کی حدیث نقل کی گئی ہے اس کے لیے اتنی ہی وضاحت کافی ہے کہ کسی بھی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کرنے اور آپ کو شفیع بنانے کے لیے دعا کرنے والوں کا ذکر نہیں ہوا بلکہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا خلوص دل سے اقرار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ خود جہنم کی آگ سے نکالے گا۔ اصل بات لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔

خالد بن ولید کا حج کرنا اور مدینہ نہ جانا

البدایہ و النہایہ (ج 6 ص 352) کی روایت ہے کہ 12 ہجری میں ذوالقعدہ کے مہینے میں خالدؓ بن ولید کی قیادت میں اسلامی لشکر کا فراض کے مقام پر دشمن سے مقابلہ ہوا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو فتح سے نوازا۔ دس دن وہاں قیام کرنے کے بعد خالدؓ بن ولید نے لشکر کو حیرہ جانے کا حکم دیا۔ عاصم بن عمرو کو مقدمہ پر اور شجرۃ بن الاعزؓ کو ساقہ پر مقرر کرنے کے بعد خود بھی ساقہ میں آگئے۔ چونکہ حج کا وقت قریب آگیا تھا تو انہوں نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حج کرنے کا عزم کر لیا۔ چنانچہ لشکر میں سے بغیر اعلان کیے نکلے اور ساتھیوں کے ساتھ وہ راہ اختیار کی جو کہ پہلے کسی نے نہ کی تھی کیونکہ وہ مشکل اور خطرناک تھی۔ لیکن تیز رفتاری کے ساتھ حج کے موقع پر مکہ پہنچ کر حج کیا اور

واپس لشکر میں پہنچ گئے۔ چند لشکریوں کے سوا کسی کو ان کے جانے اور واپس آنے کی خبر نہ ہوئی لیکن مدینہ سے آکر حج کرنے والے جب واپس گئے اور انہوں نے ابوبکرؓ کو امیر لشکر خالدؓ بن ولید کے حج کرنے کے بارے میں جب بتایا تو انہوں نے سخت الفاظ میں ان کو لشکر سے الگ ہونے پر ڈانٹ کا خط لکھا۔ خالدؓ بن ولید اور ان کے ساتھیوں کے عمل سے زیاد بن ابی سفیان والے حوالے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ

تذکرة الحفاظ (ج1 ص207 تا 213) میں مروی ہے: امام مالک رحمہ اللہ کی پیدائش صحیح ترین قول کے مطابق 93 ہجری میں ہوئی اور انہوں نے وفات 179ھ میں پائی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جب علماء کا ذکر کیا جائے گا تو امام مالک رحمہ اللہ ان میں ستارے کی مثل ہوں گے۔

شذرات الذهب (ج1 ص289) میں امام الشافعی رحمہ اللہ کا ہی قول منقول ہے: مجھ سے امام محمد بن الحسن نے کہا: امام ابوحنیفہ اور امام مالک میں سے زیادہ علم والا کون ہے۔ میں نے کہا: انصاف سے بات ہوگی، امام محمد نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ انصاف ہی سے بات ہوگی۔

امام شافعی کا کہنا ہے: میں نے کہا: میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ قرآن کا علم زیادہ رکھنے والا کون ہے؟ آپ کے شیخ یا ہمارے شیخ۔ امام محمد رحمہ اللہ نے کہا: آپ کے شیخ یعنی امام مالک رحمہ اللہ۔

امام شافعی کا دوسرا سوال تھا: سنت کے بارے میں زیادہ جاننے والا کون ہے؟ امام محمد رحمہ اللہ نے کہا: آپ کے شیخ۔

امام شافعی کا تیسرا سوال تھا: صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کے بارے میں زیادہ جاننے والا کون ہے؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: آپ کے شیخ۔

امام شافعی نے کہا: باقی صرف قیاس رہ گیا تو وہ بھی ان تین کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

جس جلیل القدر امام کے بارے میں دو بہت بڑے اہل علم گواہی دیں کہ وہ قرآن و سنت اور اقوال صحابہ کے سلسلے میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے کیا ان کو سورۃ النساء کی اس آیت کے شان نزول کا علم نہ تھا یا ان کو یہ بھی علم نہ تھا کہ اس آیت مبارکہ کا تعلق آپ کی دنیاوی حیات مبارکہ سے ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے چالیس سال بنوامیہ کی خلافت میں گزرے اور بقیہ چالیس سے چند اوپر بنوعباس کے دور میں گزرے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اہل اسلام کی باہمی خانہ جنگی کا خود مشاہدہ کیا اور ان کے ساتھ بھی ظلم ہوا۔

شذرات الذھب کی ایک روایت کے مطابق جب انہوں نے بنوعباس کی حکومت کے آغاز میں ان کی خلافت کو تسلیم نہ کیا تو ان کو ستر کوڑے مارے گئے۔ ان کا ایک ہاتھ اس زور سے کھینچا گیا کہ ان کا کندھا اتر گیا۔

دوسری روایت کے مطابق مدینہ کے حاکم نے زبردستی دی جانے یا دلوانے والی طلاق کے جائز ہونے کا فتویٰ امام مالک سے مانگا تو انہوں نے انکار کردیا۔ جس کی وجہ سے ان کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش نہ کیا۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں جس طرح بہت سی اسرائیلی روایات کا ذکر کیا ہے ویسے ہی قصوں اور حکایات والی ایک کتاب کی بھی نشاندہی کردی اور اس میں سے ایک حکایت بھی نقل کردی حالانکہ اس سے پہلے حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے:

اس میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔ نافرمانوں اور گناہ گاروں کے لیے کہ جب ان سے کوئی خطا یا نافرمانی ہوجائے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں۔ آپ کے پاس اللہ سے بخشش طلب کریں اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کریں۔ جب ایسا کریں گے تو اللہ ان پر متوجہ ہوجائے گا اور ان پر رحم کرتے ہوئے ان کے گناہوں کو معاف فرمائے گا۔

یہ معاملہ آپ کی زندگی مبارک میں ہی تھا۔ آپ کی وفات کے بعد صحابہ وتابعین میں سے کسی ایک کے بارے میں کسی بھی کتاب میں منقول نہیں کہ انہوں نے وہی کچھ کیا کہ جو ایک اعرابی نے کیا۔ عجیب پہلو یہ ہے کہ بشارت العتبی کو ملی اور اعرابی کو خبر نہ ہوئی۔

امام مالک کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ انہوں نے قرآن کی اسی آیت کے مطابق ابوجعفر المنصور کو عمل کرنے کا حکم یا مشورہ دیا ہو۔ امام مالک کی یہ عظمت ہی تھی کہ ابوجعفر المنصور نے امام مالک سے درخواست کی تھی کہ حدیث کی کوئی ایسی کتاب لکھ دیں کہ جس کو میں سلطنت اسلامیہ میں نافذ کردوں۔ پہلے تو امام صاحب تیار نہ ہوئے لیکن اس کے اصرار پر یہ عظیم کام شروع کیا تو المنصور اللہ کو پیارا ہوگیا اور اس کے بیٹے المہدی کی زندگی میں موطا امام مالک پایہ تکمیل کو پہنچی جس میں ابوجعفر المنصور کے واقعہ کی حکایت کا کوئی ذکر نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ امام تھا۔ جیسے سفیان الثوری، سفیان بن عیینہ، شعبۃ، یحیی بن سعید القطان اور یحییٰ بن الاندلسی وغیرہ میں سے کسی ایک نے اس موضوع حکایت کا ذکر نہیں کیا لیکن قاضی عیاض (المتوفی 544ھ) نے کذاب راوی سے نقل کردی اور اس کے نیچے راویوں کا حال اور بھی غیر واضح ہے۔

اصل میں قاضی عیاضؒ کو جو جو روایات و حکایات جہاں جہاں سے ملیں، انہوں نے

ان کو الشفاء میں جمع کر دیا ہے۔ اب ان کو بیان یا نقل کرنے والوں کا فرض ہے کہ ان میں جو ضعیف و موضوع ہیں ان سے اہل علم اور عام قاریوں کو اچھی طرح آگاہ کریں۔

علامہ تقی الدین السبکی نے خود ہی قاضی عیاض کی الشفاء (ج2ص88) کے حوالے سے لکھا ہے۔ جب امام مالک رحمۃ اللہ سے کہا گیا کہ بعض اہل مدینہ نہ سفر پر جاتے ہیں اور نہ ہی آتے ہیں لیکن قبر مبارک پر دن میں ایک سے زیادہ مرتبہ حاضری دیتے ہیں۔ جمعہ کے دن یا اس کے علاوہ دنوں میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ قبر مبارک کے پاس کھڑے ہو کر کچھ دیر کے لیے سلام کہتے اور دعا مانگتے ہیں۔

امام صاحب نے جواب میں فرمایا: ہمارے شہر کے کسی ایک اہل فقہ کی طرف سے مجھے یہ بات نہیں پہنچی۔ اس کے چھوڑنے میں وسعت ہے۔ اس امت کے آخر میں آنے والے لوگوں کی اصلاح اسی سے ہوگی کہ جس سے امت کے پہلے لوگوں کی ہوئی۔ مجھے یہ بات اس امت کے پہلے لوگوں سے نہیں پہنچی کہ وہ ایسا کیا کرتے تھے۔ جو شخص سفر سے آئے یا اس کا ارادہ کرے، اس کے علاوہ مکروہ ہے۔

ابن القاسم نے کہا: میں نے اہل مدینہ کو دیکھا کہ وہ جب مدینہ سے نکلتے یا داخل ہوتے ہیں تو قبر مبارک پر آ کر سلام کہتے ہیں۔ قَالَ ذٰلِكَ رَأْيٌ۔ انہوں نے کہا: یہ ایک رائے ہے یعنی کوئی شرعی حکم نہیں۔

قاضی عیاضؒ کی کتاب میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک بھی موجود ہے بلکہ آپ نے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے یہ دعا کی تھی:

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰی قَوْمٍ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَآئِهِمْ مَسَاجِدَ وَقَالَ لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا۔

”اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا دینا، کہ اس کی پوجا ہو یعنی جو کام بتوں کی پرستش

کرنے والے بتوں کے پاس کرتے ہیں وہ کام میری قبر کے پاس نہ ہوں۔(یہ تو دعا تھی لیکن ساتھ ہی امت کے لیے تنبیہ یہ تھی کہ) جن لوگوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا ان پر اللہ کا غضب زبردست ہوا یعنی امت کو اللہ کے غضب سے ڈرایا۔"

اس تنبیہ کے بعد امت کو واضح حکم آپ نے یہ دیا کہ میری قبر کو عرس گاہ نہ بنالینا۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے جو قومیں اپنے بزرگوں کی قبروں یا ان کے بتوں کے پاس بڑے بڑے اجتماع کرتی ہیں یا فرداً فرداً ان کی زیارت کرتی ہیں تو ان کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ زیادہ غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ سیدھی سی بات یہی ہے کہ وہاں جا کر ان کے ذریعے اپنے گناہوں کی بخشش کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت ان ہی سے اپنی مشکلات وتکالیف کو دور کرانے میں ہی ایمان ویقین رکھتے ہیں۔ سیدالانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ غیر مسلموں کے عقائد سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے آپ نے اپنی امت کو ویسے عقائد اپنانے اوران کے مطابق عمل کرنے سے منع فرمادیا۔

اگر علامہ تقی الدین السبکی کی کتاب کو چند جملوں میں جمع کیا جائے تو اس کا جوہر یہ ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہوکر آپ کو اپنا شفیع بنائے اور آپ سے دعا کرائے گا تو قیامت کے روز اس کو آپ کی خصوصی شفاعت نہ صرف حاصل ہوگی بلکہ زیارت کے لیے کیا جانے والا سفر عین عبادت اور باعث اجر ہوگا۔

غیر مسلم بھی اپنے نبیوں اور بزرگوں کی قبروں یا ان کے بتوں یا ان کے متبرک مقامات کے پاس حاضر ہوکر اسی کے طلبگار ہوتے ہیں اور ہوا کرتے تھے۔

حضرت زین العابدین کا فیصلہ اور علامہ السبکی کا اقرار وانکار

علامہ تقی الدین السبکی چونکہ اپنے وقت کے چیف جج تھے لہٰذا جو واضح بات ان کے

خلاف جاتی اس میں تاویل کر کے مطلب کی کوئی راہ نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔خود ہی انہوں نے مصنف عبدالرزاق (ج 3 ص 576) میں الحسن بن الحسن سے مروی روایت کا حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے کچھ لوگوں کو نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس دیکھا۔ان کو روکا اور کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری قبر کو عیدگاہ نہ بنانا اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنانا،تم جہاں کہیں بھی ہوا کرو،وہیں سے مجھ پر درود وسلام بھیج دیا کرنا،وہ مجھ تک پہنچ جایا کرے گا۔

علامہ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ قاضی اسمٰعیل نے اپنی کتاب فضل الصلوۃ علی النبی ﷺ میں متصل سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا۔ایک شخص روزانہ آکر نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرتا ہےاور درود وسلام کہتا ہے۔حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا: تم ایسا کیوں کرتے ہو۔اس نے عرض کیا: مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ میں نبی ﷺ کو سلام عرض کرتا رہوں۔

حضرت زین العابدین نے کہا: کیا میں تمہیں وہ حدیث نہ سناؤں جو میں نے اپنے والدگرامی سے سنی۔اس نے کہا:ضرور سنائیں۔

حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: میرے والد محترم نے اپنے والد محترم کے حوالے سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری قبر کو عید نہ بنانا اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنانا جہاں کہیں بھی تم ہوا کرو،وہیں سے مجھ پر درود وسلام بھیج دیا کرنا،وہ مجھے پہنچ جایا کرے گا۔

علامہ موصوف نے مصنف عبدالرزاق اور قاضی اسمٰعیل کی کتاب فضل الصلوۃ علی النبی ﷺ کے جو دو حوالے دیئے ہیں۔ان سے ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کے لیے آپ کی قبر مبارک پر حاضر ہونا شرط نہیں۔بلکہ جہاں سے بھی

درود و سلام بھیجا جائے گا، وہ آپ تک پہنچ جائے گا اور زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کو روزانہ زیارت کرنے والی بات پسند نہ تھی اور اسی بنا پر الحسن بن الحسن لوگوں کو روکا کرتے تھے۔

جبکہ علامہ قاضی تقی الدین السبکی کی تاویل اور ان کا کہنا ہے کہ اس قصہ سے معلوم ہوا کہ حضرت زین العابدین نے روزانہ زیارت کرنے والے کو اس لیے جھڑکا کہ وہ اس معاملے میں حد سے تجاوز کرتے ہوئے مسنون طریقہ کو چھوڑ رہا تھا اور اس کو بتانا یہ مقصود تھا کہ دور سے بھی سلام پہنچ جاتا ہے اور ہر وقت حاضر ہو کر سلام کرنے میں مشقت ہوتی ہے۔

حضرت زین العابدین کا قول بھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول جیسا ہے ورنہ سلف میں سے کسی سے کیسے ممکن ہے کہ مطلق قبر کی زیارت پر اعتراض کرے اور نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کو مکروہ قرار دے۔

علامہ موصوف اپنی عادت کے مطابق بحث کو پھر آگے بڑھاتے ہوئے لَا تَجْعَلُوا قَبْرِیْ عِیْدًا۔ ''میری قبر کو عید نہ بنانا'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں عبداللہ بن نافع راوی ہے جس سے سنن اربعہ کے ائمہ اور امام مسلم نے روایت لی ہے۔ لیکن امام بخاری کا کہنا ہے کہ اس کے حافظے کا اعتراف بھی کیا گیا ہے اور انکار بھی۔ امام احمد بن حنبل کا کہنا تھا کہ وہ صاحب الحدیث نہ تھا اور حدیث میں اس کا مقام نہیں تھا۔ ابو حاتم نے کہا: وہ حافظ نہیں، اس کے حافظے کا اعتراف وانکار کیا جاتا ہے۔ یحییٰ بن معین نے اس کو ثقہ کہا۔ ابو زرعہ کا کہنا ہے: اس میں کوئی خرابی نہیں۔

ابن عدی کا کہنا ہے: وہ امام مالک سے غرائب روایات بیان کرتا ہے اور اپنی روایات میں مستقیم الحدیث ہے۔ اگر یہ حدیث ثابت نہ ہو تو کوئی کلام نہیں۔ اگر ثابت ہو جائے تو وہ اقرب ہوگی۔

شیخ زکی الدین المنذری کا کہنا ہے: اس کے معنی میں یہ بھی احتمال ہے کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک پر کثرت سے زیارت کی ترغیب ہے جس طرح سال میں دو مرتبہ عید آتی ہے اس طرح میری قبر کی صورت نہ بنالینا بلکہ کثرت سے حاضری دینا۔

اس معنی کی تائید اس کا دوسرا حصہ ہے کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنالینا کہ ان میں نماز پڑھنا ترک کردو۔

علامہ صاحب کا بیان ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میری قبر پر حاضری کا کوئی وقت مخصوص نہ کرلینا۔ یہ بھی معنی ہوسکتا ہے کہ جیسے عیدین کے موقع پر زیب و زینت کرتے ہوویسے میری قبر پر حاضری کے وقت نہ کیا کرنا۔ حاضری دینے کے بعد زائر لوٹ جائے اور اللہ ہی اس کی بہتر مراد جانتا ہے۔

مذکورہ بحث کا تجزیہ

علامہ تقی الدین السبکی نے قاضی عیاض کی الشفآء کی کئی روایات و حکایات نقل کرتے ہوئے ان کی صحت کا بالکل خیال نہیں کیا۔ باب کے آخر میں سنن ابو داؤد میں مروی روایت کے ایک راوی عبداللہ بن نافع کے بارے میں ائمہ رجال کی آراء بیان کرتے ہوئے بھی عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا۔

امام بخاری نے التاریخ الکبیر (ج 5 ص 213) میں عبداللہ بن نافع کے حافظے پر رائے دینے کے ساتھ لکھا ہے: کتابه اصحّ۔ اس کی کتاب سب سے زیادہ صحیح ہے۔

یہی بات کتاب الجرح و التعدیل (ج 5 ص 184 رقم 856) میں بھی منقول ہے:

ابن عدی نے الکامل (ج 4 ص 1556) میں عبداللہ کے بارے میں لکھا ہے: وہ اپنی روایات میں مستقیم الحدیث تھا۔ تهذيب التهذیب (ج 4 ص 51 رقم 98) میں حافظ ابن

حجر نے نقل کیا ہے۔ امام نسائی نے کہا: اس کی روایت بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں اور دوسری مرتبہ کہا: وہ ثقہ راوی ہے۔ امام ابن حبان نے اس کو ثقات میں شمار کیا ہے اور ان کا کہنا تھا: اس کی کتاب صحیح ہے۔

ابوداؤد کا بیان ہے کہ عبداللہ امام مالک کو زیادہ جاننے والا اور صاحب الفقہ تھا۔ یحییٰ سے مروی ہے کہ امام مالک کے ان کے پاس چالیس ہزار مسئلے تھے۔

امام الدارقطنی کا کہنا تھا کہ اس پر اعتبار کیا جاتا ہے۔

امام الشافعی نے نہ صرف ان کی تعریف کی بلکہ ان سے دو یا تین حدیثیں بھی روایت کیں۔ امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج2 ص513رقم 4647) میں لکھا ہے کہ وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھی تھے وُثِقَ ان کی توثیق کی گئی۔ امام بخاری اور امام ابوحاتم کے حوالے سے عبداللہ بن نافع کی کتاب سب سے زیادہ صحیح تھی۔ اگرچہ ان کے حافظے میں کمزوری تھی۔ امام الدارمی نے یحییٰ کے حوالے سے کہا کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے وہ بڑی عقیدت کے ساتھ امام مالک کی خدمت میں رہے۔ کسی کو ان سے آگے نہیں کرتے تھے۔

رہی بات امام احمد بن حنبل کی، انہوں نے عبداللہ بن نافع والی ہی سند کے ساتھ "لَا تَتَّخِذُوا قَبرِیُ عِیدًا" کو (ج2 ص 367 میں) روایت کیا ہے اور (ج2 ص246 میں) اَللّٰھُمَّ لَا تَجعَلُ قَبرِی وَثَنًا ایک اور سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

الحسن بن الحسن سے مروی روایت مصنف عبدالرزاق (ج3 ص577 رقم 6726) اور ابن ابی شیبۃ (ج3 ص345) میں بھی موجود ہے۔

اصح الکتاب والے راوی کو علامہ موصوف نے ضعیف بنا دیا اور خود چوتھے باب میں محمد بن مروان سے مروی روایت کا حوالہ بھی دے دیا۔ جس کے انتہائی ضعیف ہونے کا

اقرار خود عربی میں ص 50، اردو میں ص 74 میں کیا تھا۔

اَللّٰھُمَّ لَا تَجۡعَلۡ قَبۡرِی وَثَنًا میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ سیدھی سی بات یہ ہے کہ بتوں کے بارے میں بت پرستی کرنے والے جو عقائد رکھتے ہیں ویسے ہی میری قبر کے بارے میں میری امت میں رائج نہ ہوجائیں۔ میری قبر کے پاس آکر وہی کام نہ کریں جو بت پرست اپنے بتوں کے پاس کرتے ہیں۔

عِیۡدًا...... سے مزید وضاحت ہوجاتی ہے۔ بت پرستوں کے ہاں جیسے میلے ان کے بتوں کے ناموں سے لگتے ہیں ویسے ہی آج کل اہل اسلام کے اولیاء کی قبور اور مزاروں پر لگائے جاتے ہیں۔ یہی وَثَنًا اور عِیۡدًا ہے۔

علامہ موصوف نے عبداللہؓ بن عمر کا حوالہ بھی بار بار نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کو مستحب ثابت کرنے کے لیے دیا ہے۔

چنانچہ مصنف عبدالرزاق (ج 3 ص 576 رقم 6724) میں مروی ہے کہ ابن عمر جب سفر سے واپس آتے تو قبر مبارک کے پاس آکر کہتے: السلام علیك یارسول الله، السلام علیك یا ابابکر، السلام علیك یا ابتاه۔ ”اللہ کے رسول! آپ پر سلامتی ہو، ابوبکر آپ پر سلامتی ہو، اباجان آپ پر سلامتی ہو۔“

اس روایت کے ساتھ امام ابن ابی شیبہ (المتوفی 235ھ) کی مصنف میں مروی روایت کو بھی ملا لیا جائے تو بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ کتاب الجنائز: باب من کان یاتی قبر النبی ﷺ (ج 3 ص 341) میں نافع سے ابن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے:

اِنَّهٗ كَانَ اِذَا اَرَادَ اَنۡ يَّخۡرُجَ دَخَلَ الۡمَسۡجِدَ فَصَلّٰى ثُمَّ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيۡكُمۡ يَارَسُوۡلَ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيۡكَ يَا اَبَا بَكۡرٍ، اَلسَّلَامُ عَلَيۡكَ يَا اَبَتَاه ثُمَّ يَأۡخُذُ وَجۡهَهٗ وَكَانَ اِذَا قَدِمَ مِنۡ سَفَرٍ يَفۡعَلُ ذٰلِكَ

قَبلَ اَنُ یَدُخلَ مَنُزِلَہٗ۔

جب وہ سفر کرنے کا ارادہ کرتے تو مسجد میں داخل ہوکر نماز پڑھتے۔ پھر نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس آکر کہتے: اللہ کے رسول! آپ پر سلامتی ہو۔ ابا بکر! آپ پر سلامتی ہو اور اپنے ابا جان سے کہتے: آپ پر سلامتی ہو۔

ان دعائیہ کلمات کے علاوہ اور کچھ نہ کہتے اور نہ رسول اللہ ﷺ سے کسی کام میں مدد طلب کرتے اور نہ آپ کو شفیع بناتے اور نہ علامہ السبکی کے بیان کردہ طریقہ کے مطابق عمل کرتے۔ مسجد نبوی میں پہلے نماز پڑھتے، پھر قبر مبارک کے پاس آتے۔

مسجد نبوی میں نماز پڑھنے والی روایت علامہ موصوف سے اوجھل رہی یا انہوں نے خود ہی اوجھل رکھی۔ تاکہ ان کے موقف پر زد نہ پڑ جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مصنف عبدالرزاق کی جو روایت علامہ السبکی صاحب نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نقل کی ہے اس کا یہ حصہ بھی ہے:

امام عبدالرزاق کے شیخ معمر کا بیان ہے: میں نے عبیداللہ بن عمر سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا: مَا نَعلَمُ اَحَدًا مِنُ اَصُحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وسلّم فَعَلَ ذٰلِکَ اِلَّا ابُنُ عُمَرَ۔ نبی ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے عبداللہ بن عمرؓ کے علاوہ کسی نے ایسا کیا ہو، اس کا ہمیں علم نہیں۔

عبیداللہ بن عمر نے گواہی دے دی کہ تمام صحابہ میں سے یہ عمل کرنے والے صرف ابن عمر ہی تھے۔ علمی دیانت کا تقاضا تھا کہ قاضی السبکی صاحب مصنف عبدالرزاق کی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے پوری روایت نقل کرتے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، خلافت سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سفر پر

جاتے اور واپس آتے لیکن قبر مبارک کی زیارت کرنے کا کوئی واقعہ کسی حدیث، تاریخ اور سیرت کی کتاب میں منقول نہیں۔ خلفائے راشدین کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے سفر کرنے والوں کے بارے میں بھی ایسی کوئی روایت مروی نہیں۔

رہی بات ان کی کہ جو مدینہ میں مقیم ہیں یا باہر سے آ کر مقیم ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے شرعی زیارت یقینی طور پر مستحب ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں لیکن علامہ موصوف نے اس کو بھی طویل بے مقصد بحث میں الجھا دیا ہے۔ حالانکہ انہوں نے الحسن بن الحسن اور حضرت زین العابدین کا جو حوالہ دیا اس کے بعد کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جب درود و سلام دور سے بھی پہنچتا ہے تو زیارت سے اس کو مشروط کرنا کسی طور پر مناسب نہیں۔

۸

شفاء السقام کا پانچواں باب

قاضی السبکی صاحب نے اس میں بھی اپنی خصوصی سوچ اور موقف کو آگے بڑھایا ہے۔ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے امت کو جن اعمال وعقائد سے روکا تھا انہی کو حق وسچ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات وممات کے فرق کو مٹا کر زائرین کو ترغیب وتلقین کی گئی ہے کہ آپ کو اس طرح پکارا جائے اور پکارتے ہوئے وہ الفاظ استعمال کئے جائیں گویا کہ آپ سن رہے ہیں اور گناہوں کی بخشش اور قیامت کے روز ان کی شفاعت کرنے کی بشارت دے رہے ہیں اور زائرین کو اجر وثواب سے نوازا جا رہا ہے۔

سورۃ النساء کی آیات سے عجیب استدلال

قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم ہے کہ صرف اللہ کو پکارا جائے۔ گناہوں کے سرزد ہونے کی صورت میں اسی سے بخشش طلب کی جائے۔ اس تک پہنچنے اور اپنے گناہوں کو معاف کرانے میں کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بڑا ہی سننے والا، بڑا ہی دیکھنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔ اس کی بارگاہ میں جھکنے اور اپنی سیاہ کاریوں کا اعتراف کرتے ہوئے معافی مانگنے والے کے گناہوں کو وہ نہ صرف معاف کرتا ہے بلکہ ان کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

سورۃ الفرقان کے الفاظ ہیں:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ

حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا(۷۰) وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا(۷۱)﴾

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور اس نے نیک عمل کئے۔ پس وہ ہی ہیں کہ جن کی برائیوں کو اللہ نیکیوں میں بدل دیتا ہے اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑا ہی رحم کرنے والا ہے اور جس نے توبہ اور نیک عمل کئے پس وہی اللہ سے حقیقی توبہ کرتا اور اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔

یہاں توبہ کی شرط نیک اعمال سے توبہ کی تصدیق ہے کسی کو وسیلہ بنانے یا سفارش کرنے کا ذکر نہیں۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا: اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ. "جب پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔"

صحیح بخاری (کتاب الادب: باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ ص886) میں عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے:

نبی ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی کہ جس کی چھاتیوں سے دودھ چھلک رہا تھا اس نے قیدیوں میں ایک بچہ پایا، اس کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کو اپنا دودھ پلایا۔

نبی ﷺ نے ہم سے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینکے گی۔ ہم نے عرض کیا: اگر وہ اس کو بچانے پر قادر ہو تو نہیں پھینکے گی۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

لَلّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا.

جس طرح یہ اپنے بچے پر رحم کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ اس سے بہت زیادہ اپنے

بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔

اس روایت سے اگلی روایت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے رحمت کی تخلیق کرتے ہوئے اس کے ایک سو حصے بنائے۔ ایک کم سو تو اپنے پاس رکھ لئے اور صرف ایک حصہ زمین میں نازل فرمایا۔ اسی ایک حصے کی وجہ سے اللہ کی مخلوق آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتی ہے۔ یہاں تک کہ گھوڑا بھی اپنا پاؤں اپنے بچے سے اٹھالیتا ہے تاکہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے۔

قرآن وسنت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت عظیمہ کے بارے میں بہت کچھ بیان ہوا ہے جبکہ حضرت علامہ السبکی صاحب نے اللہ تعالیٰ کی بخشش ورحمت کو مشروط ومحدود کردیا ہے اور سورۃ النساء کی آیت کا ایک بار پھر ذکر فرماتے ہیں۔

جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کرلیا تو آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے بخشش طلب کرتے اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔

علامہ موصوف کا فرمان ہے: یہ آیت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہونے پر راہنمائی کرتی اور بتاتی ہے کہ گنہگار رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور وہاں بخشش چاہیں اور رسول اللہ ﷺ ان کی مغفرت کی سفارش کریں۔ یہ آیت اگرچہ آپ کی زندگی مبارک میں نازل ہوئی لیکن آپ کا رتبہ ایسا ہے کہ آپ کی تعظیم کی وجہ سے اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ یعنی حیات والا سلسلہ ممات میں بھی جاری ہے۔

پھر علامہ صاحب نے خود ہی سوال اٹھا کر اس کا جواب یوں دیا ہے:

اگر کہا جائے کہ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہونا تو آپ سے بخشش کی دعا کرنے کے

لیے تھا اور یہ بات آپ کی وفات کے بعد متصور نہیں ہو سکتی۔

علامہ صاحب کا بیان ہے کہ اس آیت کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ تواب و رحیم کا انحصار تین امور پر ہے:

1- گناہگار کا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا۔

2- اللہ کی بارگاہ میں معافی چاہنا۔

3- رسول اللہ ﷺ کا اس کے لیے مغفرت کی دعا فرمانا۔

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کا دعا فرمانے کا تعلق ہے تو آپ نے تمام مومنوں کے لیے دعا فرمادی ہوئی ہے جیسا کہ سورۃ محمد میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾

پوری آیت مبارکہ یوں ہے:

﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰكُمْ (١٩)﴾

پس آپ جان لیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اپنے گناہ کی بخشش اور مومنوں اور مومنات کے لیے بھی بخشش طلب کرتے رہیں اور اللہ آپ کے چلنے پھرنے اور ٹھہرنے کی جگہ کو جانتا ہے۔

علامہ صاحب نے اپنی عادت کے مطابق سیاق و سباق سے بے نیاز ہو کر آیت مبارکہ کا اتنا ہی ٹکڑا لیا جو ان کے خیال کے مطابق ان کے حق میں تھا۔ حالانکہ یہی حصہ ان کی تمام محنت و کوشش کو ضائع کرنے کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ استغفار کا حکم رسول اللہ ﷺ کو اپنے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے تھا۔ جبکہ سورۃ النساء کی آیت گناہگاروں اور ظالموں کی بخشش و شفاعت کے سلسلے میں پیش کردی جو منافقوں کے

بارے میں وقتی طور پر نازل ہوئی۔ اس میں مسلمان گناہگاروں کو بھی شامل کر دیا۔ یوں معاملے کو خلط ملط کر کے الجھا دیا ہے۔

دوسری بات یہاں یہ واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مومنوں اور مومنات کے لیے دعا فرمائی اور آپ کی دعا قبول ہوگئی۔ لہٰذا پھر قبر مبارک پر حاضری کی ضرورت تو نہ رہی۔ علامہ صاحب نے خود ہی صحیح مسلم کا حوالہ بھی دیا ہے۔

کتاب الفضائل باب اثبات خاتم النبوۃ ج 2 ص 260 میں عاصم نے عبداللہ بن سرجس سے بیان کیا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اور ان کے ساتھ روٹی اور گوشت یا ثرید کھایا۔ عاصم کا کہنا ہے: میں نے عبداللہ بن سرجس سے کہا: آپ کے لیے نبی ﷺ نے استغفار کی۔ انہوں نے کہا: ہاں بلکہ تمہارے لیے بھی، پھر انہوں نے اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ. تلاوت کر دی۔

استغفار کی فضیلت

صحیح بخاری (کتاب الدعوات: باب استغفار النبی ﷺ ص 933) میں ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا۔ آپ نے فرمایا:

وَاللّٰهِ اِنِّی لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوبُ اِلَیْهِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً۔

اللہ کی قسم! بے شک میں ایک دن میں اللہ تعالیٰ سے ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا ہوں اور اس کی طرف رجوع کرتا یعنی توبہ کرتا ہوں۔

صحیح مسلم (کتاب الذکر: باب استحباب الاستغفار ج2 ص346) میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

يَآيُّهَا النَّاسُ تُوبُوْا اِلَى اللّٰهِ فَاِنِّي اَتُوبُ اِلَى اللّٰهِ فِي الْيَوْمِ مِآئَةَ مَرَّةٍ۔

آپ نے فرمایا: اے لوگو! اللہ سے توبہ کرتے رہو، بے شک میں ایک دن میں ایک سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔

دوسری روایت کے مطابق:

اِنِّي لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ۔

ایک دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

صحیح بخاری (کتاب الدعوات) میں سید الاستغفار بھی مروی ہے جس کے الفاظ ہیں:

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَ وَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَ أَبُوْءُ لَكَ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْلِيْ فَاِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اَنْتَ۔

اے اللہ! تو ہی میرا رب ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو نے ہی مجھے پیدا کیا ہے اور میں تیرا ہی بندہ اور اپنی استطاعت کے مطابق تیرے ہی عہد و وعدہ پر ہوں۔ برا کام میں نے جو کیا ہے تیرے ہی ساتھ اس سے پناہ مانگتا ہوں۔ تیرے لیے تیری اس نعمت کا اقرار کرتا ہوں کہ جس سے تو نے مجھے نوازا اور تیرے لیے اپنے گناہ کا بھی اقرار کرتا ہوں۔ پس مجھے بخش دے۔ بلاشبہ تیرے سوا گناہوں کو کوئی معاف نہیں کرتا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے یقین رکھتے ہوئے صبح کے وقت یہ استغفار کی اور شام ہونے سے پہلے اگر اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ جنتی ہوگا اور جس نے اس پر یقین رکھتے ہوئے رات کو یہ استغفار کی اور صبح ہونے سے پہلے اس کی موت واقع ہوگئی تو

وہ جنتی ہوگا۔

سورۃ ال عمران میں اللہ تعالیٰ کا حکم اور ساتھ ہی بہت بڑی بشارت بھی ہے:

﴿وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ(۱۳۲) وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ(۱۳۳) الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ(۱۳۴) وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ(۱۳۵) اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ(۱۳۶)﴾

اور اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے اور اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جلدی کرو کہ جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ جو متقی لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ وہ جو تنگی اور آسانی میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو دبا لیتے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور وہ جو کوئی فحاشی کا کام کر لیتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر لیتے ہیں تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش کے طلبگار ہو جاتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہوں کو کون بخشتا ہے اور انہوں نے جو کیا ہوتا ہے اس پر مصر نہیں ہوتے اور اللہ کے بارے میں ان کو علم ہوتا ہے، وہی لوگ ہیں کہ ان کے رب کی طرف سے ان کی جزا بخشش اور وہ جنت ہوگی جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ عمل کرنے والوں کا بہترین اجر ہوگا۔

اہل اسلام کے لیے یہ ایسا طریقہ ہے جو قیامت تک جاری وساری رہے گا اور صحیح بات یہی ہے کہ سورۃ النساء والی آیت کا تعلق ان لوگوں سے تھا کہ جو رسول اللہ ﷺ کی بجائے اپنے جھگڑوں کے فیصلے اوروں سے کراتے یا کرنے کے حق میں تھے اور اس آیت کا آپ کی قبر مبارک کی زیارت سے کوئی تعلق نہیں اور قبر مبارک پر حاضر ہو کر سفارش یا دعا کرانے کا تصور صحابہ اور تابعین اور ائمہ امت میں نہ تھا۔ یہ سراسر علامہ تقی الدین السبکی کے ذہن کی اختراع ہے۔ اس کی وضاحت ان کی اس عبارت سے بھی ہو جاتی ہے:

سورۃ النساء کی آیت کا نزول اگر چہ خاص قوم کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک میں ہوا لیکن علت کے عام ہونے کی وجہ سے یہ حکم ہر آنے والے کے لیے ہوگا۔ خواہ وہ آپ کی زندگی میں آپ کی خدمت میں پہنچا یا، وصال کے بعد۔ اسی لیے علماء نے آیت سے دونوں حالتوں میں اس کا حکم عام ہی سمجھا ہے اور جو شخص بھی آپ کی قبر مبارک پر پہنچے اس کے لیے اس آیت کی تلاوت اور استغفار کو مستحب قرار دیا ہے اور اس بارے شیخ عتبی کا قصہ مشہور ہے جو ہم تیسرے باب کے آخر میں ذکر کر چکے ہیں جس کو ہر مذہب کے علمائے کرام نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے اور اس کو مستحب خیال کرتے ہوئے آداب زائر میں سے قرار دیتے ہیں۔

عبارت کا تجزیہ

علامہ السبکی صاحب ایک طرف اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سورۃ النساء والی آیت خاص قوم یعنی منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی لیکن دوسری طرف اس کا حکم عام رکھتے ہوئے آپ کی وفات کے بعد اور آپ کی زندگی میں حاضر ہونے والوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ ائمہ تفسیر نے جو لکھا اس کی بھی انہوں نے پروانہ کی اور ایک بے

اصل حکایت کی حمایت کی۔

علامہ السبکی صاحب کو ضرور معلوم ہوگا کہ جس نے سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کو حالت اسلام میں دیکھا اور آپ کی خدمت میں اس کو حاضر ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا وہ صحابیت کا درجہ پانے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ اگر آپ کی حیات و ممات میں کوئی فرق نہیں تو کیا قبر مبارک پر حاضری دینے والا بھی صحابیت کا شرف حاصل کر لیتا ہے۔

آیت مبارکہ کی تلاوت اور استغفار کے مستحب ہونے یا کرنے کی دلیل ایک قصے کو بنایا ہے اور یہ بھی دعویٰ کر دیا کہ ہر مذہب کے علماء نے اپنی کتابوں میں اس کو نقل کیا۔

موت کی حقیقت

محترم علامہ صاحب جس واقعہ کو دلیل بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ وہ ایک آدمی کا دیکھا ہوا خواب تھا اور شرعی احکام میں خواب و حکایت کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ابو منصور صباغ کی کتاب میں منقول قصوں میں سے کسی قصے کو دین کی اصل نہیں بنایا جا سکتا۔

انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ نسل انسانی کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے بنایا، اپنی روح ان میں پھونکی، فرشتوں سے ان کو سجدہ کرایا اور ان کے جسم سے ان کی زوجہ کو نکال کر دونوں کو جنت میں بسایا۔ جب ان کو زمین میں اتارا تو ان کو اولاد سے نوازا۔ پھر حیات کے ساتھ ممات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو بھی اپنی عمر پوری کرتا زمین میں دفن کر دیا جاتا۔ اس وقت سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہی قانون ہے۔ سورۃ الانبیاء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِکَ الْخُلْدَ اَفَائِنْ مِّتَّ فَھُمُ الْخٰلِدُوْنَ (۳۴)

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (٣٥)﴾

اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر کے لیے دنیا میں ہمیشہ رہنے والا معاملہ نہیں بنایا۔ اگر آپ فوت ہو گئے تو کیا وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ہر نفس نے موت کا مزا چکھنا ہے اور ہم تم کو خیر و شر کے فتنہ سے آزمائیں گے اور تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

سورۃ الانبیاء کی ان دو آیتوں میں پہلی وضاحت یہ ہوتی ہے کہ جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کی دنیاوی زندگی کی عمر اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھی ہے جب وہ عمر پوری ہو جاتی ہے تو وہ انسان دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ پھر اس سے دنیا کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔

صحیح مسلم (باب فضائل ام ایمن: ج 2 ص 291) میں انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ہمیں ام ایمن کے پاس لے چلو تاکہ ہم ان کی اسی طرح زیارت کریں جس طرح رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔ جب ہم ام ایمن کے پاس پہنچے تو انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ دونوں نے ان سے کہا: آپ کیوں رو رہی ہیں۔ اللہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے۔

ام ایمن نے کہا: یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ اللہ کے پاس ان کے لیے خیر ہی خیر ہے میں تو اس لیے رو رہی ہوں کہ اب وحی کا نزول منقطع ہو گیا۔ ام ایمن کے رونے کی وجہ سے ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ بھی رونے لگے۔

حضرت علامہ السبکی نے جس طرح کا تصور رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر حاضری دینے والوں کے لیے اپنی کتاب میں دیا ہے اگر اس کی کوئی حقیقت ہوتی تو یہ تینوں اصحاب بھی قبر مبارک پر حاضر ہو کر مسئلے کو حل کراتے یا اس بارے میں کوئی راہنمائی لیتے۔

صحیح مسلم (باب وصول ثواب الصدقات الی المیت: ج 2ص41)

میں ابوھریرہ ﷛ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ. اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ .وْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْلَهٗ

جب انسان مرجاتا ہے تو اس سے اس کا سلسلۂ عمل منقطع ہوجاتا ہے سوائے تین صورتوں کے جن میں ایک صدقہ جاریہ ہے یعنی رفاہ عامہ کا کوئی ایسا کام کہ جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا رہے۔

دوسرا کوئی علمی کام جس سے لوگ مستفید ہوتے رہیں (جس میں علمی ادارے اور علمی کتب وغیرہ شامل ہیں۔)

تیسرا کام نیک صالح اولاد ہے جو اپنے والدین کے لیے دعا کرتی ہے (اور ایسے نیک کاموں میں مصروف رہتی ہے کہ جس کا اجر وثواب اس کے ذریعہ اس کے والدین کو پہنچتا رہتا ہے۔)

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ دنیا میں اپنی عمر پوری کر کے زمین میں دفن ہونے والے کا دنیا سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ سے محبت وعقیدت کے اظہار کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ کی تعلیم کے مطابق آپ کے نمونہ کو سامنے رکھتے ہوئے عمل کیا جائے۔ یہود ونصاریٰ اور مشرکوں کی نقالی سے بچا جائے۔

سورۃ انبیاء کی آیت سے دوسری وضاحت یہ ہوتی ہے۔ موت کا قانون ایسا ہے کہ آج تک کوئی اس کو بدل نہیں سکا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک ایسا ہی رہے گا۔

تیسری وضاحت یہ کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خیر اور شر کے ذریعے آزماتا ہے۔ شر میں استقامت وصبر کا مظاہرہ کون کرتا ہے۔ خوشحالی اور نعمتوں سے مالا مال ہونے

والا اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے اس کا شکر کرتا ہے یا تکبر و غرور کا شکار ہو کر اپنی آخرت برباد کر لیتا ہے۔

چوتھی وضاحت ایسی ہے کہ انسان ذرا سا بھی غور کرے تو کبھی بہک نہیں سکتا۔ اللہ نے اپنے بندوں پر کھلے الفاظ میں واضح کر دیا کہ ہر شخص نے بالآخر اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے اور اپنے کئے کا اسی سے حساب پانا ہے اور جو اس کے پاس چلا جاتا ہے وہ دنیا میں واپس نہیں آتا۔ اگر چاہے بھی تو اس کی چاہت پوری نہیں ہوتی۔

بڑی سیدھی سی بات ہے۔ انسان کتنا ہی نیک اور بلند مرتبے والا ہو، لیکن اس کے وفات پانے پر اس کو نہلایا، کفنایا اور کندھوں پر اٹھایا جاتا ہے۔ قبرستان لا کر اس کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ پھر اس کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ یوں اس کا اپنے اہل اور اہل دنیا سے رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔

لہٰذا خوابوں اور حکایت کا سہارا لے کر اہل اسلام میں ان تصورات کو رائج کرنا کہ جن سے سختی کے ساتھ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا، کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اسلام کی بنیادی تعلیم ہی یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا رحم کرنے اور سننے والا ہے جب بھی کوئی مشکل ہو تو اس کی طرف رجوع کرو۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی یہی سنت رہی ہے اور یہی حقیقت ہے کہ اس کے سوا کوئی بھی مشکل آسان نہیں کر سکتا۔

درود و سلام پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ یہ دعائیہ کلمات ہی ہیں۔ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے آپ پر رحمتوں، برکتوں اور سلامتی کے لیے دعا کی جاتی ہے۔

مردوں اور عورتوں کا قبرستان آنا

اس موضوع پر بھی علامہ السبکی صاحب نے بحث کو طول دیا ہے۔ بات صرف اتنی

ہے کہ اسلام کے آغاز میں رسول اللہ ﷺ نے یہود و نصاریٰ اور مشرکوں کے مشرکانہ اعمال کو دیکھ کر اپنے صحابہ وصحابیات کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا۔ اسلام سے پہلے عوام الناس اپنے اپنے عقائد کے مطابق بہت سی جگہوں کو متبرک خیال کرتے ہوئے وہاں خیر و برکت کے لیے اکٹھے ہوا کرتے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے صالح ولیوں کے نام پر بننے والے بتوں کے نام اللہ تعالیٰ نے سورۃ نوح میں خود بیان فرمائے ہیں۔ اسی طرح سورۃ النجم میں لات، مناۃ اور عزیٰ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ عزیر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنانے اور اپنے احبار کو ارباب بنانے کا ذکر بھی سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمایا ہے۔

سیرت ابن ھشام (قصۃ عمرو بن لحی وذکر اصنام العرب ج1 ص76) میں منقول ہے کہ عمرو بن لحی پہلا شخص تھا جس نے اسمٰعیل علیہ السلام کے دین کو بدل دیا اور اس نے عرب میں بت پرستی کو رائج کر دیا۔ مذکورہ باب میں عرب کے مختلف قبائل کے مختلف بتوں کی پوری تفصیل منقول ہے۔

چونکہ عورتوں میں قبرستان جانے اور نوحہ و ماتم کرنے کا رجحان زیادہ تھا۔ اس لیے سب سے پہلے قبرستان جانے اور قبروں کی زیارت کرنے سے عورتوں ہی کو روکا گیا۔

جامع الترمذی (ج1 ص158) اور ابن ماجه (113) میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت اور عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح حسن حدیث مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیادہ زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی۔

علامہ السبکی نے صحیح مسلم کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت کا قصہ خود ہی بیان کیا ہے۔ (عربی ص 86، اردو ص 119) جو صحیح مسلم (ج1 ص314) کے علاوہ سنن ابن ماجه (ص113)، سنن ابو داؤد (ص461)،

سنن النسائی (ج1ص232)، مصنف ابن ابی شیبہ (ج3ص343)، مسند احمد (ج2ص441) اور المستدرک (ج1ص375-376) میں ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت کی۔ آپ روئے اور جو آپ کے پاس تھے ان کو بھی رلایا۔ پھر نبی ﷺ نے فرمایا:

اِسْتَأْذَنْتُ رَبِّی اَنْ اَسْتَغْفِرَلَهَا فَلَمْ یُؤْذَنْ لِیْ وَاسْتَأْذَنْتُ فِی اَنْ اَزُوْرَ قَبْرَ هَا فَاُذِنَ لِیْ فَزُوْرُوْا الْقُبُوْرَ فَاِنَّهَا تُذَكِّرُ الْمَوْتَ۔

میں نے اپنے رب سے اجازت چاہی کہ اپنی ماں کی بخشش کے لیے دعا کروں۔ مجھے اجازت نہ دی گئی۔ میں نے ان کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگی تو مجھے اجازت دے دی گئی، پس تم قبروں کی زیارت کیا کرو بے شک یہ موت یاد دلاتی ہیں۔

اس حدیث پاک میں عبرت کے کئی پہلو ہیں لیکن بحث کو قبروں کی زیارت تک محدود رکھنا ہی مناسب ہے۔ قبروں کی زیارت کا حکم دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے اس کی حکمت بھی بیان فرمادی۔ یعنی قبریں موت یاد دلانے کا سبب ہیں۔

ابن ماجه (ص 112) اور مصنف عبدالرزاق (ج3ص569) کے مطابق آپ نے فرمایا: فَاِنَّهَا تُذَكِّرُ الْاٰخِرَةَ. قبریں آخرت کی یاد دلاتی ہیں یعنی ہر پیدا ہونے والے انسان کا یہی انجام ہوتا ہے۔

ابن ماجه کی دوسری روایت ہے: فَاِنَّهَا تُزَهِّدُ فِی الدُّنْیَا وَ تُذَكِّرُ الْاٰخِرَةَ۔ یقینی طور پر قبریں دنیا کی زندگی میں دنیا سے بے رغبت کرتی ہیں اور آخرت کے معاملے کی یاد دلاتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ فرمائیں کہ قبریں موت یاد دلاتی ہیں لیکن علامہ السبکی نے آپ کی قبر مبارک کے بارے میں وہی تصور دینے کی کوشش کی ہے جو یہود و نصاریٰ کے ہاں اپنے

انبیاء کے بارے میں پایا جاتا ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف منع فرمایا بلکہ انبیاء ﷺ کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر لعنت فرمائی۔

جہاں تک عورتوں کے قبرستان جانے کا تعلق ہے اگر وہ اسلامی تعلیم کے خلاف عمل نہیں کرتیں تو ان کے قبرستان جانے پر علمائے کرام کو کوئی اعتراض نہیں اور زُورُوا قُبُورَکُمْ میں ان کو بھی شریک رکھا ہے۔ اگر کوئی عورت اسلامی تعلیم کے مطابق عمل نہیں کرتی تو پھر اس کو زیارت کی اجازت نہیں دی جاتی۔

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے مستحب ہونے میں جب کوئی اختلاف نہیں تو اس کو بار بار دوہرا کر بحث کو صرف طول دیا گیا ہے جس کا علامہ صاحب نے شفاء السقام (عربی ص 95 اور اردو ص 129) میں خود ہی اعتراف کیا ہے۔

قبر مبارک کی زیارت کے لیے نذر ماننا

ایک سیدھا سا سوال علامہ تقی الدین السبکی نے خود ہی اٹھایا اور چاہیے تو یہ تھا کہ اس کا جواب بھی سیدھا سا ہی ہوتا لیکن حضرت قاضی صاحب نے جواب کی کئی جہتیں بنا دیں۔ کھینچ تان اور تاویلوں کے ایسے الجھاؤ پیدا کئے کہ قاری کو اصل مسئلہ کی کوئی واضح دلیل دکھائی نہیں دیتی۔ اگر دینی مسائل میں فتویٰ دینے والے حضرات سوالوں کے جوابات دینے کا یہی طریقہ اپنائیں تو کتابوں کے انبار لگ جائیں۔ اور تو اور خلف وسلف کے اجماع کا دعویٰ کرنا کہ قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر جائز ہے، کسی طریقے سے بھی مناسب نہیں۔ اگر خلف وسلف کا اجماع ہوتا تو قاضی صاحب کو اپنی یہ کتاب لکھنے کی قطعاً ضرورت پیش نہ آتی۔ کیونکہ اہل علم اور ائمہ حدیث کی اکثریت قاضی صاحب کی سوچ وفکر کے خلاف ہے اور حیرت اس پر ہوتی ہے کہ ضعیف وموضوع روایات کو اپنے حق میں بیان

کرنا اور صحیح و مرفوع احادیث کو ٹھکرا دینا یا ان میں تاویلیں کرنا اپنے وقت کے قاضی القضاۃ کے لیے کیسے مناسب تھا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

اٹھائے گئے سوال کے جواب کے سلسلے میں امام مالک (المتوفی 179ھ) کا ایک فتویٰ نقل کرنے سے پہلے ہی اس کو مشکوک بنانے کی کوشش کی گئی۔ قاضی صاحب کا فرمان ہے:

ولو ثبت عن احد من العلماء انه يقول لا تلزم بالنذر لم يكن فى ذلك ما يَقْتَضِى انه يقول انها ليست بقربة وقد وقفت على كلام بعض المتعصبين للباطل قال فيه ان القاضى اسمٰعيل قال فى المبسوط انه روى عن مالك انه سئل عمن نذر ان ياتى قبر النبى صلى الله عليه وسلم فقال ان كان اراد مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم فليأته وليصل فيه وان كان انما اراد القبر فلا يفعل للحديث الذى جاء لا يعمل المطى الا الى ثلاثة مساجد۔

اور اگر علماء میں سے کسی ایک سے یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا کہنا ہے: قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کرنے کی نذر لازم نہیں ہوتی تو اس بارے میں اس کا قول اس کا متقاضی نہیں ہوگا کہ زیارت قربت نہیں۔ باطل کے بارے میں تعصب رکھنے والوں میں سے بعض کے کلام سے میں واقف ہوں۔ اس نے کہا ہے کہ قاضی اسمٰعیل نے المبسوط میں بیان کیا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی گئی ہے کہ ان سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا کہ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضر ہونے کی نذر مانی۔ (کیا وہ اس کو پورا کرے) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: اگر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کا ارادہ کیا تھا تو اس کو مسجد نبوی آنا چاہیے اور اس

میں نماز پڑھنی چاہیئے اور اگر اس نے قبر مبارک کا ارادہ کیا تھا تو اس کو نذر پوری نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں حدیث مبارک ہے۔ تین مساجد کے علاوہ سواریوں کو حصول اجر کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

امام مالکؒ کے فتویٰ میں تاویل

ایک جلیل القدر محدث اور ایک قاضی میں کتنا فرق ہے۔ امام مالک سے سوال ہوا اور انہوں نے سیدھا سا مختصر جواب دے دیا۔ انہوں نے اپنے فتویٰ کے حق میں دلائل کے ڈھیر نہ لگائے لیکن قاضی صاحب نے فرمایا:

اگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کو درست مانا جائے تو اس میں ایسی تاویل ضروری ہے کہ جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی قربت کی نفی نہ ہو، کیونکہ خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور تمام علمائے کرام اور تمام مسلمانوں سے وہ ثابت ہے۔

قاضی السبکی صاحب نے پہلے ہی ایک مفروضہ قائم کرلیا، پھر اس پر طویل بحث کی اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت عین عبادت اور کارثواب ہے۔ لہٰذا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی بات کو تسلیم کرنے کی بجائے اس میں تاویل بھی اپنے مطلب کی کرنی چاہی۔ چنانچہ قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ امام مالک والی روایت کی کئی توجیہات ہیں:

۱- ان میں سے پہلی یہ ہے کہ وہ ایسی قربت ہو کہ جس سے نذر لازم نہ ہوتی ہو جیسا کہ مدینہ اور اس کے آس پاس رہنے والوں کے لیے مسجد قباء آنا قربت ہے اور تمام علماء اور جمہور علماء کے نزدیک اس کے لیے نذر لازم نہیں ہوتی مگر محمد بن مسلمہ مالکی کے مطابق ہو جاتی ہے۔

قاضی السبکی کا کمال ہے کہ سیدھی سی بات میں شک کی آمیزش کر دیتے ہیں۔ خود

ہی فرماتے ہیں کہ اہل مدینہ یا مدینہ کے آس پاس رہنے والوں میں سے کوئی مسجد قبا جانے کی نذر مانے تو اس کو پورا کرنا جمہور علماء کے نزدیک لازم نہیں ہوتا لیکن محمد بن مسلمہ مالکی کی مخالفت کا بھی ذکر کردیا۔ قاضی ابن کج (التوفی 405ھ) کا یہ قول بھی نقل کردیا کہ میرے نزدیک نذر لازم ہوجاتی ہے جس کا ترجمہ مترجم نے یہ کردیا: بالاتفاق اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ قاضی السبکی نے اپنی کتاب میں ایسے راویوں کی روایات کو بھی دلیل بنایا ہے کہ جن کے حالات اگر رجال کی کتابوں میں تلاش کیئے جائیں تو ملتے ہی نہیں۔

۲- دوسری توجیہ و تاویل قاضی السبکی صاحب نے یہ فرمائی کہ یہ اس کے ساتھ خاص ہوگی جو دور سے آنے کی نذر مانے۔ جیسا کہ حدیث کے ساتھ استدلال کیئے جانے والے بقیہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ سواریوں کا استعمال صرف تین مساجد کے لیے کیا جائے جس کا مطلب ہے کہ اگر سفر کی نذر مانی ہے تو یہ نذر لازم نہیں ہوگی۔

حضرت قاضی تقی الدین السبکی نے سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی مشہور حدیث پاک کی خود ہی وضاحت کردی کہ اجر و ثواب کے حصول کے لیے صرف تین مساجد کی طرف سفر کرنا جائز ہوگا اس کے علاوہ دوسرے دنیاوی مقاصد کے سفر پر کوئی پابندی نہیں۔

عجیب نکتہ: امام ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد القزوینی الرافعی الشافعی (التوفی 623ھ) کی کتاب الشرح الکبیر کی تلخیص و تخریج کرنے والے الامام الحافظ ابن حجر عسقلانی (التوفی 852ھ) بھی الشافعی ہی تھے اور قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی بھی اسی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ قاضی صاحب نے اپنی کتاب شفاء السقام میں مذکور حدیث کے حکم کو تسلیم نہ کرنے اور اپنے غیر مسنون موقف کو ثابت کرنے پر کتاب رقم کردی۔ جبکہ حافظ ابن حجر نے تلخیص الحبیر (مطبوعہ دارالکتاب العلمیۃ، بیروت ج4 ص432-433) حدیث نمبر 2066۔ لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدَ۔ الحدیث متفق علیہ من

حدیث ابوھریرۃ وغیرہ کی تلخیص وتخریج کرتے ہوئے لکھا ہے: یہ حدیث بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد، حمیدی، عبدالرزاق، ابن الجارود، ابویعلی، ابن حبان، البیھقی اور الخطیب البغدادی نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کی۔ حدیث کے مکمل حوالے اور ان کے راویوں کے نام ہی ذکر نہیں کیے بلکہ ان پر بحث بھی کی ہے۔

نکتے کی بات یہ ہے کہ اس حدیث کا ذکر ''کتاب النذور'' میں ہی ہوا ہے یعنی اجر وثواب کے حصول کے لیے صرف ان تین مساجد کے لیے خصوصی سفر کرنے کی اجازت ہے۔ ان کے علاوہ انبیاء و اولیاء کی قبور کی زیارتوں اور ان سے شفاعت کرانے یا ان کو مساجد بنانے کی اسلام میں اجازت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دینوی زندگی کے آخری ایام میں یہود ونصاریٰ پر اسی وجہ سے لعنت فرمائی کہ انہوں نے اپنے انبیاء واولیاء کی قبور کو سجدہ گاہ بنایا اور ان کی زیارت کو عین عبادت اور کار ثواب سمجھتے تھے۔

اسی لیے امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جس نے مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی نذر مانی وہ تو اس کو پورا کرے اور جس نے قبر مبارک کی زیارت کی نذر مانی تھی وہ اس کو پورا نہ کرے۔

تلخیص الحبیر کی حدیث (رقم 2067) کے مطابق جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں نے نذر مانی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو فتح مکہ سے نواز دے تو میں بیت المقدس میں دو رکعتیں پڑھوں گا۔ آپ نے فرمایا: صَلِّ هٰهُنَا. تو یہاں یعنی بیت اللہ ہی میں پڑھ لے۔

تین مساجد کے علاوہ اجر وثواب حاصل کرنے کی خاطر سفر میں ممانعت کی تائید میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام الطحاوی کی شرح معانی الآثار (ج1 ص242-243) کے حوالے سے سعید بن ابی سعید المقبری سے نقل کیا ہے کہ وہ طور پہاڑ پر گئے اور وہاں انہوں نے نماز پڑھی۔ ان کا کہنا ہے: میری ملاقات جمیل بن بصرۃ الغفاری سے ہوگئی۔

انہوں نے پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ میں نے اپنے سفر کے بارے میں ان کو جب بتایا تو انہوں نے کہا: اگر تیری مجھ سے پہلے ملاقات ہو جاتی تو تم وہاں نہ جاتے۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: سواریوں کو صرف تین مساجد کے لیے استعمال کیا جائے۔ وہ میری مسجد، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ ہیں۔

ابوداوٗد الطیالسی (ج 1 ص 108) کے حوالے سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی روایت نقل کی ہے جس میں صحیح بخاری، صحیح مسلم میں مروی ممانعت کے جو الفاظ ہیں۔ انہی کا حوالہ دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ، تابعین اور ائمہ حدیث کے نزدیک زیارتوں اور شفاعتوں کے لیے سفر کرنے کو ممنوع سمجھا جاتا تھا۔

اس کے باوجود قاضی صاحب کا اصرار تھا کہ اگرچہ سفر کی نذر لازم نہیں ہوتی لیکن نذر کے بغیر قربت کے لیے سفر کی ممانعت بھی اس سے نہیں ہوتی۔ جیسا کہ مسجد قباء کے قریب رہنے والوں کے لیے مسجد قباء آنا ہے اور نہ قریب والوں کو زیارت کو لازم رکھنا جیسا کہ محمد بن مسلمہ نے مسجد قباء کے بارے میں کہا ہے۔

کیسا عجیب استدلال ہے۔ بات رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کی تھی لیکن استدلال مسجد قباء سے کرنے کی کوشش کی اور یہ بھی فرما دیا کہ تاویلات میں سب سے زیادہ قریب امام مالک رحمہ اللہ کے قواعد سے یہی ہے۔

امام مالکؒ کی اس سیدھی سی بات کو تاویل کے ذریعے الجھا دیا کہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے والی نذر کو پورا کرنا ہوگا اور اگر قبر مبارک کی نذر مانی تھی تو وہ لازم نہیں ہوگی۔

قاضی السبکی صاحب نے التھذیب للمسائل المدونۃ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ اس میں مذکور ہے کہ جس نے نذر مانی کہ وہ مدینہ یا بیت المقدس جائے گا، یا یہ کہا کہ وہ چل کر مدینہ یا بیت المقدس جائے گا، تو وہ اپنی نذر پوری نہ کرے جب تک دونوں جگہوں کی

مسجدوں میں نماز کی نیت نہ کی ہو، یا ان مسجدوں کا نام نہ لیا ہو، یا یوں نہ کہا ہو کہ میں مسجد رسول یا مسجد بیت المقدس تک پیدل جاؤں گا۔

اگر اس نے مساجد کی نیت نہ کی ہو تو اس صورت میں سوار ہو کر جائے اس پر کچھ دینا واجب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ مسجدوں کا نام لینا، گویا یہ کہنا ہوگا کہ میں ان میں نماز پڑھوں گا۔

اگر کسی اور شہر کی مسجد میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو وہاں جانا ضروری نہیں۔ اپنے شہر کی کسی مسجد میں نماز پڑھ لینے سے اس کی نذر پوری ہو جائے گی۔

اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ وہ سرحد کی نگرانی کرے گا یا کسی جگہ روزہ رکھے گا۔ اگر وہ مقام ایسا ہے کہ وہاں جانا قربت ہو تو یہ نذر لازم ہوگی۔ جیسے عسقلان اور اسکندریہ ہیں تو یہ نذر لازم ہوگی۔ اگر چہ وہ اہل مکہ یا اہل مدینہ میں سے ہو۔ اگر کسی نے چل کر جانے کی نذر مانی تو اس کا پورا کرنا لازم نہ ہوگا۔ مگر یہ کہ اس نے بیت اللہ کو یا مسجد حرام یا کعبہ یا حجر اسود یا رکن تک چل کر جانے کی نذر مانی ہو تو اس کو پورا کرنا لازم ہوگا۔

قاضی تقی الدین السبکی صاحب نے مذکورہ عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مدینہ تک جانے کی نذر کو پورا کرنا لازم ہے۔ اگر مسجد کی تصریح کی گئی ہو یا وہاں جا کر نماز پڑھنے کا ذکر کیا گیا ہو تو اس کے علاوہ وہاں کسی اور حوالے سے جانے کی نذر کا کوئی لزوم نہیں ہوگا، اگر چہ یہ قربت ہی ہو۔

اس مذکورہ عبارت میں زیارت کے لیے نذر ماننے اور اس کو لازم کرنے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ قاضی السبکی صاحب کے خلاف یہ عبارت واضح کرتی ہے کہ مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کی طرف جانے والی نذر پوری کرنا لازم ہے اور اگر کسی اور مسجد کی نذر مانی جائے گی تو اس کا پورا کرنا لازم نہیں ہوتا۔ جب کسی اور مسجد میں نماز پڑھنے کی نذر لازم نہیں ہوتی تو

زیارت کی نذر کیسے لازم ہوگی۔

۳۔ قاضی تقی الدین السبکی نے اپنی تیسری تاویل میں فرمایا کہ جن احادیث مبارکہ کا ذکر ہم کتاب کے شروع میں کر چکے ہیں ان کی بنیاد پر نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت بالخصوص اور سلف وخلف کے عمل اور قبروں کی زیارت کے بارے میں صحیح مشہور احادیث کے تحت اس کے درج ہونے کی بنا پر بالعموم مطلوب ہے۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے دو جہتیں متعین کر دیں چونکہ ان کے نزدیک زیارت کی نذر لازم ہوتی ہے۔لہٰذا وہ جہت اول اور جہت ثانی ان کے متعدد دلائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زیارت تقرب ہے یا نہیں، اس کے باوجود اگر کسی معین قبر کی زیارت کی نذر کا مقصد میت کے حق میں دعا کرنا ہو تو نذر لازم ہو جائے گی اور اگر برکت کا حصول مقصود ہو تو نبی ﷺ کی قبر مبارک والی نذر لازم ہو جائے گی اور اگر عبرت حاصل کرنے کی نیت ہو تو اس میں اختلاف ہے۔اگر کوئی مقصد متعین نہ کیا گیا ہو تو نذر کو پورا کرنا لازم نہ ہوگا۔

تاویل کا عجیب پہلو

قاضی السبکی کے مطابق امام مالک سے سوال کرنے والے نے شاید صرف بغیر مقصد آنے کے حوالے سے سوال کیا ہو اور امام صاحب نے اسی حیثیت سے جواب دیا ہو اور نذر کو لازم نہ کیا ہو۔

شاید امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے بارے میں جو خاص روایات ہیں، وہ نہ پہنچی ہوں اور وہ عام قبور والی احادیث کی بنیاد پر عدم لزوم کے قائل ہو گئے۔ حالانکہ یہ قبر مبارک سب سے زیادہ شرف والی ہے اور سب سے زیادہ زیارت

کے لائق ہے مگر اس کے باوجود اگر مقصد کے تعین کے بغیر نذر مانی جائے تو ایسی نذر لازم نہیں ہوگی خواہ یہ قبر نبی یا غیر نبی کی ہو۔

عجیب تاویل کا تجزیہ

قاضی القضاۃ علامہ تقی الدین السبکی (المتوفی 755ھ) کی اپنی کتاب میں دیئے گئے دلائل میں سے اعجوبہ دلیل امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے فتوی میں تاویل ہے۔ امام مالک 179ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے 80 سال سے زیادہ عمر پائی جو مدینہ طیبہ میں ہی گزری۔ حصول علم اور حج وعمرہ کے لیے ہی صرف انہوں نے سفر کیے۔ لیکن رہائش وقیام مدینہ میں ہی رہا۔

قاضی صاحب کے بیٹے کے استاد امام الذھبی نے تذکرہ الحفاظ میں ان کو فقیہ الامۃ اور امام دار الھجرۃ کہا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی الشافعی نے تھذیب التھذیب (ج10 ص8 رقم3) میں حرملہ کے حوالے سے امام الشافعی کا یہ قول نقل کیا ہے: مَالِكٌ حُجَّةُ اللهِ عَلٰى خَلْقِهٖ بَعْدَ التَّابِعِيْنَ۔ امام مالک تابعین کے بعد اللہ کی مخلوق پر اللہ کی حجت ہے۔

صبحی صالح کی علوم الحدیث کے مطابق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی موطا کی ترتیب وتہذیب چالیس سال میں کی۔ پھر ستر فقہائے مدینہ کو دکھائی۔ ایک لاکھ احادیث میں سے انہوں نے ایک ہزار ستائیس کا انتخاب کیا جن میں 600 مسند، 222 مرسل، 613 موقوف اور 285 اقوالِ تابعین ہیں۔

امام مالکؒ کی غیر مسند روایات دوسرے محدثین نے سند کے ساتھ بیان کر کے مؤطا کا درجہ بلند کیا ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے اس پر ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے۔

جس جلیل القدر امام کی زندگی مدینہ میں گزری، جنہوں نے کوئی سرکاری عہدہ قبول نہ کیا، نہ سرکار کے آگے جھکے اور نہ بکے۔ ایک سرکاری قاضی صاحب جوان کی وفات کے 576 سال بعد فوت ہوئے، وہ ان امام دار الہجرۃ کے بارے میں فرماتے ہیں:

شاید امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے بارے میں جو خاص روایات ہیں وہ نہ پہنچی ہوں، شاید کہ سائل کا سوال بے مقصد نذر کا تھا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ جو امام اپنی ساری زندگی مدینہ میں گزاریں اور بڑے بڑے امام ان کے شاگرد ہوں۔ قاضی السبکی صاحب کی بیان کردہ ضعیف و موضوع اور مجروح روایات سے واقف نہ ہوں۔

قاضی صاحب نے کتاب کے آغاز میں جو روایات نقل کی ہیں اور جن کو انہوں نے بنیاد بنایا ہے ان میں سے ایک بھی ائمہ حدیث کے معیار پر پوری نہیں اترتی جیسا کہ ان کے بارے میں ہونے والی تحقیق و تدقیق سے ظاہر ہو گیا ہے۔

سورۃ الحجرات میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (١٢)﴾

اے ایمان والو! زیادہ بدگمانی سے اجتناب کرو بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

لیکن جب کسی شخص کے دل و دماغ میں کسی کی مخالفت سما جاتی ہے یا کسی خاص چیز کی محبت کا غلبہ ہو جاتا ہے تو پھر اسی کو وہ اپنی زندگی کا مقصود و مطلوب بنا لیتا ہے۔ مسند احمد (ج5 ص194-ج6 ص450)، ابو داؤد (کتاب الادب: باب فی الھوی ص699) میں ابو الدرداء سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ۔ کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرہ کر دے گی۔

امام ابوداؤد نے اس حدیث پاک کو خواہش کے باب کے تحت نقل کر دیا کہ کسی بھی

چیز کی انتہا کو پہنچنے والی اس کی خواہش کسی خیر خواہ کی بات سننے یا قبول کرنے اور راہ حق اختیار کرنے میں مانع ہو جاتی ہے۔

محترم قاضی صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ان کی لکھی ہوئی کتاب میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ حق کو قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۴۔ چوتھی دلیل میں بھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ میں ''شاید'' کے حوالے سے گنجائش نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر مَنْ زَارَ قَبْرِی میں تاویل یہ کی کہ مَنْ زَارَنِی فِی قَبْرِی۔ جس نے میری قبر میں میری زیارت کی۔

مَنْ زَارَنِی فِی قَبْرِی پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔صحابی ہونے کا شرف ان کو حاصل ہوا کہ جنہوں نے حالت اسلام میں آپ کو دیکھا یا آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے جیسا کہ قاضی صاحب نے فرمایا۔اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہر وہ مسلمان جو آپ کی قبر مبارک پر حاضر ہوتا ہے درحقیقت وہ آپ کی زیارت قبر مبارک کے اندر ہی کر کے صحابی ہونے کا شرف حاصل کر لیتا ہے۔یوں رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابہ اور آج کے امتیوں میں فرق مٹ جاتا ہے جبکہ صاحب مشکوٰۃ المصابیح نے باب مناقب الصحابۃ میں بخاری مسلم کے حوالے سے عمران بن حصین سے نقل کیا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

میری امت کا بہترین زمانہ میرا، پھر ان کے بعد والوں کا جو ان سے ملے ہوئے ہوں گے۔ پھر ان کا جو ان کے بعد ان سے ملے ہوئے ہوں گے۔'' یعنی یہ تین زمانوں میں پائے جانے والے امت محمدیہ کے بھلے اور اچھے لوگ ہوں گے۔

پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو گواہی طلب کئے بغیر گواہی دیں گے۔ امین بنائے بغیر امانتوں میں خیانت کریں گے۔ نذر مان کر پوری نہیں کریں گے۔ ان

میں سے موٹاپا ظاہر ہوگا۔ یہاں موٹاپے سے مراد جسمانی موٹاپا نہیں بلکہ دماغی طور پر کسی کی پروا نہیں کریں گے۔ تکبر وغرور کا مظاہرہ کریں گے۔

دوسری روایت کے مطابق ان سے قسم کھانے کو نہیں کہا جائے گا مگر وہ قسمیں کھائیں گے۔

قبر مبارک کی زیارت کے ذریعے قاضی صاحب نے اپنے زمانے کے لوگوں کو خیر القرون میں شامل کردیا۔ اسی روایت سے قاضی صاحب نے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے جس کی صحت میں ائمہ رجال نے کلام کر کے اس کو بے اعتبار قرار دیا ہے۔

قبر مبارک کی زیارت کی نذر کے لازم ہونے پر امت کے ائمہ کی بجائے ان کو ایک قاضی ابن کج (المتوفی 475ھ) کی اپنی رائے کی تائید مل گئی۔ جن کے حالات رجال کی کتابوں میں ملنا محال ہیں۔

حضرت عائشہ کا بھائی کی قبر پر آنا

قاضی صاحب نے قبر کی زیارت کے سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر پر آنے کا بھی حوالہ دیا ہے کہ وہ مکہ کے قریب حُبشی میں فوت ہوئے جو مکہ سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ ان کا جنازہ مکہ لاکر ان کو وہاں دفن کردیا گیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب ان کی قبر پر پہنچیں تو انہوں نے مالک بن نویرہ کے بھائی عاصم کے چار اشعار کہے اور انہوں نے کہا: اگر میں وصال کے وقت موجود ہوتی تو قبر کی زیارت کو نہ آتی اور اگر میں اس وقت موجود ہوتی تو تمہیں اسی جگہ دفن کراتی جہاں تم فوت ہوئے تھے۔

قاضی صاحب کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف اپنے موقف کو تقویت دینے کے لیے

روایات نقل کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کا بھی حوالہ دے دیتے ہیں جو ان کے اپنے دعویٰ کی نفی کر دیتا ہے۔

یہاں بھی ایسا ہی ان سے ہوا ہے۔ عائشہ کے بھائی کی قبر پر آنے سے قبر کی زیارت کا ثبوت دینا تھا۔ جب امام محمد بن حسن کی کتاب السیر الکبیر کا خود ہی حوالہ دے دیا کہ وہ حج یا عمرہ کے لیے مکہ آئی تھیں مکہ میں ہوتے ہوئے بھائی کی قبر پر بھی چلی گئیں۔ یہ تو ویسے ہی ہے جیسے کوئی مدینہ میں ہوتے ہوئے آپ کی قبر مبارک یا شہداء احد یا جنت البقیع میں مدفون قبروں کی زیارت کو جائے۔

اسد الغابة (ج3ص468)، الاصابة (ج4ص169)، الاستیعاب (رقم 1680 ص 393) میں مروی ہے: جب ان کو بھائی کی موت کی خبر ملی۔ ظَعَنَتْ مِنَ الْمَدِيْنَةِ حَاجَّةً حتّٰى وَقَفتُ عَلٰى قَبْرِهٖ. دوسری روایت کے مطابق خَرَجَتْ حَاجَّةً فَوَقَفتُ عَلٰى قَبْرِهٖ. تو وہ مدینہ سے حج کی نیت سے نکلیں اور اپنے بھائی کی قبر پر رکیں۔

اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہو سکتی ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھائی کی قبر پر آنے کی نیت و نذر سے نہیں بلکہ حج کی نیت سے مکہ آئیں اور بھائی کی قبر پر بھی گئیں۔

اسی طرح عبداللہ بن عمرؓ کے اپنے بھائی عاصم اور اپنے بیٹے کی قبر پر دعا کرنے کا معاملہ تھا۔ اس میں ہرگز قبر کی زیارت کے لیے سفر کرنے کا قصد یا نذر نہ تھی۔

پانچویں باب کا اختتام بھی انہوں نے امام مالک کی سیدھی سی بات میں کھینچا تانی کی کوشش ہی کے ساتھ کیا ہے۔

قاضی صاحب نے خود ہی امام شعبی اور امام ابراہیم نخعی کے حوالے دے دیئے کہ وہ قبروں کی زیارت کو مکروہ سمجھتے تھے۔ پھر دونوں کے قول کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہوئے

رد کر دیا۔

امام الشعبی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں

قاضی محترم کے بیٹے تاج الدین السبکی کے استاد امام الذہبی کی تذکرۃ الحفاظ (ج1،ص79، رقم76) میں امام الشعبی کے بارے میں منقول ہے کہ ان کا نام عامر بن شراحبیل تھا۔ الہمدان کے قبیلہ کی ایک شاخ سے ان کا تعلق تھا اور ان کو الشعبی الکوفی کہا جاتا تھا۔ امام الذہبی نے ان کے ترجمہ کا عنوان یوں قائم کیا ہے: الشعبی علامۃ التابعین ابوعمرو، یعنی ابوعمرو الشعبی تابعین کے علامہ تھے۔ پھر امام الذہبی نے لکھا ہے۔ عمر فاروقؓ کی خلافت میں پیدا ہوئے۔

عاصم الاحول نے کہا: مَا رَأَيْتُ اَحَداً اَعْلَمَ بِحَدِيْثِ اَهْلِ الْكُوفَةِ وَالْبَصْرَةِ وَالْحِجَازِ مِنَ الشَّعْبِي۔ (ص85) الشعبی سے بڑھ کر اہل کوفہ و بصرہ اور حجاز میں حدیث کو جاننے والا کوئی ایک میں نے نہ دیکھا۔

امام ابوحنیفہؒ نے نہ صرف ان سے روایت کی۔ بلکہ امام الشعبی ہی ان کے سب سے بڑے شیخ تھے۔ تقریباً دس صفحات میں امام الذہبی نے ان کے حالات کا ذکر کیا ہے۔ ابن قتیبہ (المتوفی 276ھ) کی المعارف (ص 199) کے مطابق ان کی وفات 104 یا 105ھ میں ہوئی۔

امام ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں امام الذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے تذکرۃ الحفاظ (ج 1 ص 83 رقم 70) میں عنوان بنایا۔ ابراھیم النخعی فقیہ العراق، یعنی وہ عراق کے فقیہ تھے۔ بچپن میں ان کو ام المومنین کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان سے حماد بن ابی سلیمان الفقیہ، سماک بن حرب الحکم بن عتیبہ، ابن عون، الاعمش، منصور اور

خلق کثیر نے روایت کی۔ وہ صاحب الاخلاص علماء میں سے تھے۔

مغیرہ کا بیان ہے ہم ان سے ایسے ڈرتے تھے جیسے امیر سے ڈرا جاتا ہے۔ ہیبت کا لفظ تعظیم وتوقیر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ امام حماد نے ان کو بتایا کہ جب میں نے ابراہیم نخعی کو الحجاج کی موت کی بشارت دی تو انہوں نے شکرانے کا سجدہ کیا اور خوشی سے رونے لگے۔ ان کی وفات 95ھ میں ہوئی۔

قاضی السبکی کو دو عظیم اہل علم جن کا ان کے زمانے میں علمی مقام تھا اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ سے زیادہ واقف اور آگاہ تھے۔ ان کے قول کو رد کرتے ہوئے ذرا سا خیال نہ آیا اور جن کے اقوال پر انہوں نے اپنی کتاب کی بنیاد اٹھائی اور پھیلائی ہے وہ سارے کے سارے ائمہ رجال کے نزدیک قابل اعتماد نہ تھے چونکہ قاضی صاحب نے دونوں اماموں کا ذکر مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے کیا ہے لہٰذا مناسب ہوگا کہ دیکھا جائے یہ کتاب مذکور مسئلہ پر کیا روشنی ڈالتی ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ

اس کتاب کی تصنیف کا شرف امام ابوبکر بن ابی شیبہ کو حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عزت بھی عطا فرمائی کہ امام ابوزرعہ، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ابن ماجہ، امام ابوبکر بن ابی عاصم، امام بقی بن مخلد، امام البغوی، امام جعفر الفریابی اور کئی دوسرے اصحاب حدیث نے ان سے روایت کی۔

امام الذہبی نے اپنی تذکرۃ الحفاظ (ج 2 ص 422 رقم 439) میں یہ تفصیل بیان کی ہے اور امام بخاری سے انہوں نے یہ بھی نقل کیا کہ ان کی وفات 235ھ کے محرم میں ہوئی۔

امام ابو بکر ابن ابی شیبہ نے المصنف کی کتاب الجنائز میں زیارتِ قبور کے سلسلے میں دو باب باندھے ہیں۔ پہلا مَنْ رَخصَ فِی زِیَارۃِ الْقُبُورِ اور دوسرا مَنْ کَرِہَ زِیَارۃَ الْقُبُورِ۔

جنہوں نے قبروں کی زیارت میں رخصت دی ہے

1- ابن بریدہ اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا اب ان کی زیارت کیا کرو۔

2- انس بن مالک سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت سے منع فرمایا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔ قبروں کی زیارت کیا کرو لیکن کوئی غیر مناسب بات نہ کہنا یعنی شریعت کے خلاف کوئی کام نہ کرنا۔

3- ربیعہ بن نافعہ نے اپنے باپ کے حوالے سے علیؓ سے بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت سے منع فرمایا۔ پھر آپ نے فرمایا: میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا اب ان کی زیارت کیا کرو، وہ تمہیں آخرت یاد دلاتی ہیں۔

4- ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی، آپ روئے اور جو آپ کے اردگرد تھے ان کو بھی رلایا۔ پھر آپ نے فرمایا:

میں نے اپنی ماں کے لیے استغفار کرنے کی اپنے رب سے اجازت چاہی جو اس نے مجھے نہ دی، میں نے ان کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگی جو مجھے مل گئی پس قبروں کی زیارت کیا کرو بلاشبہ یہ موت یاد دلاتی ہیں۔

5- ابن بریدہ اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا تو آپ ایک قبر کے حرم کے پاس آئے اور مخاطب کے انداز میں اس کے پاس بیٹھ گئے اور لوگ بھی آپ کے آس پاس بیٹھ گئے۔ پھر آپ کھڑے ہوئے اور رونے

لگے۔لوگوں میں سب سے زیادہ آپ سے بات کرنے میں جرأت والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ چنانچہ انہوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا: اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کس بات نے آپ کو رُلایا۔

آپ نے فرمایا: یہ میری ماں کی قبر ہے۔ میں نے اپنے رب سے زیارت کی اجازت چاہی، وہ مل گئی لیکن جب ان کے لیے استغفار کی اجازت چاہی تو وہ نہ ملی۔ میں نے ماں کو یاد کیا تو میرا نفس بے قابو ہو گیا اور آنسو جاری ہو گئے۔

راوی کا بیان ہے کہ جو لوگوں کا رونا اُس دن دیکھا گیا وہ پھر نہ دکھائی دیا۔

نوٹ: اس روایت سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ فتح مکہ کے سفر کے دوران میں آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سفر خصوصی زیارت کا نہ تھا۔

6- نافع سے مروی ہے: عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عاصم فوت ہو گئے اور ان کے بھائی ابن عمرؓ وہاں موجود نہ تھے۔ جب آئے تو انہوں نے کہا: مجھے اس کی قبر کے پاس لے جاؤ۔ وہاں آئے تو چند لمحوں کے لیے رکے اور دعا کی۔ عربی کے الفاظ ہیں۔ (فَوَقَفَ عَلَيْهِ سَاعَةً يَّدْعُو)

7- مسروق نے عبداللہ کے حوالے سے بتایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا پس اب زیادہ کیا کرو یہ تمہیں آخرت یاد دلاتی ہیں۔

8- ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی وفات حُبشیٰ میں ہوئی جو مکہ سے بارہ میل کے فاصلہ پر تھا۔ ان کو مکہ میں دفن کر دیا گیا۔ جب عائشہ آئیں تو ان کی قبر پر بھی آئیں اور انہوں نے مالک بن نویرہ کے بھائی عاصم کے اشعار پڑھے۔ پھر کہا: اللہ کی قسم! اگر میں تمہاری موت کے وقت تمہارے پاس ہوتی تو تم

کو وہیں دفن کرتی جہاں تمہاری موت واقع ہوئی تھی۔ اگر اس وقت موجود ہوتی تو تمہاری زیارت نہ کرتی۔

9- نافع سے مروی ہے: ابن عمرؓ سفر سے واپس آئے تو ان کی اولاد میں سے کسی بچے کی وفات ہو چکی تھی۔ انہوں نے کہا: مجھے اس کی قبر پر لے چلو، جب ان کو اس کی قبر پر لے گئے تو وہ اس کے پاس کھڑے ہوئے اور اس کے لیے دعا کی۔

10- ابن بریدہ اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضر تھا۔ میں نے آپ کو غمزدہ دیکھا۔ قوم میں سے ایک آدمی نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا بات ہے؟ آپ کچھ غمزدہ ہیں۔ آپ نے فرمایا: مجھے میری ماں یاد آگئی، پھر آپ نے فرمایا: میں نے تم کو منع کیا تھا کہ تین دن سے زیادہ قربانیوں کا گوشت نہ کھایا کرو۔ اب کہتا ہوں: کھاؤ، کھلاؤ اور چاہو تو اپنے لیے رکھ لیا کرو۔

وَنَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَمَنْ اَرَادَ اَنْ يَزُوْرَ قَبْرَ اُمِّهٖ فَلْيَزُرْهُ۔

اور میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے روکا تھا پس جو چاہے کہ اپنی ماں کی قبر کی زیارت کرے تو وہ کرلے۔ میں نے تمہیں کدو کے تونبے، لاکھے، روغن کیے اور لکڑی کے برتن میں نبیذ بنانے سے منع کیا تھا، ہر نشہ والی چیز سے بچتے رہو اور جس برتن میں چاہو نبیذ بنالیا کرو۔

مذکورہ روایات کا تجزیہ

دس مذکورہ روایات میں دو کا تعلق ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اور ایک کا عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے۔ باقی سات رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ کے حوالے سے مختلف طرق سے نقل ہوئی ہیں جن میں قبروں کی زیارت کا حکم محض امر فَزُوْرُوْهَا سے ہوا۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ

زُورُوا امر وجوبی ہے یا استحبابی ہے۔ اگر اس کو وجوب کا مانا جائے تو اس وقت تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو فوراً قبروں کی زیارت کے لیے نکل جانا چاہئے تھا۔ اس مشکل مسئلہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حل کر دیا، جب آپ نے فرمایا: تم میں سے جو ماں کی قبر کی زیارت کا ارادہ کرے تو زیارت کر لے۔ اگر کوئی ارادہ نہیں کرتا اس پر زُورُوا کی پابندی نہیں۔ اس سے وضاحت ہوگئی کہ قبروں کی زیارت مستحب ہے جب دور سے ان کے لیے سواریاں استعمال نہ کی جائیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا اور ائمہ حدیث نے اس مسئلہ کو صحیح صورت میں سمجھ لیا۔

جبکہ حضرت قاضی القضاۃ علامہ تقی الدین السبکی کی سمجھ میں نہ آیا یا انہوں نے سمجھنا نہ چاہا یا امام ابن تیمیہ کی مخالفت نے ان کو چین نہ لینے دیا۔ واللہ اعلم بالصواب

جنہوں نے قبروں کی زیارت کو پسند نہ کیا

-1 ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے قبروں کی زیارت کرنے والیوں، ان کو سجدہ گاہ بنانے والیوں، اپنے بالوں کو اونچا کرنے والیوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی۔

-2 عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک گرجا کا ذکر کیا جو انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا جس کو ماریہ کہا جاتا تھا۔ اس میں ام سلمہؓ نے جو تصاویر دیکھی تھیں، ان کا ذکر کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ایسی قوم ہے کہ جب ان میں کوئی نیک صالح بندہ یا مرد مرے تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے ہیں اور اس کو ان تصویروں سے سجا لیتے ہیں۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بری مخلوق ہیں۔

-3 عبداللہ رحمہ اللہ سے مروی ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: بے شک

لوگوں میں سے بہت برے لوگ وہ ہیں کہ جن پر قیامت واقع ہوگی اس حال میں کہ وہ زندہ ہوں گے اور قبروں کو سجدہ گاہ بنا لینے والے ہوں گے۔

4- یحییٰ بن سعید نے عمران کے حوالے سے بتایا: امام ابن سیرین ناپسند کرتے تھے کہ قبر کی زیارت کی جائے اور اس کے پاس نماز پڑھی جائے۔

5- حسن بن حسن کا کہنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری قبر کو عید نہ بنا لینا اور نہ اپنے گھروں کو قبروں کی طرح نہ کر لینا اور مجھ پر درود و سلام وہاں سے بھیجو کہ جہاں تم ہو، بے شک تمہارا درود مجھ کو پہنچ جائے گا۔

6- زید بن اسلم سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری قبر کو بت نہ بنا دینا کہ اس کی عبادت کی جائے۔ اللہ کا غضب اس قوم پر بڑا سخت ہوا جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔

7- سعید بن میتب حضرت عائشہؓ سے بیان کرتے ہیں۔ بے شک رسول اللہ ﷺ نے ان اقوام پر لعنت فرمائی جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔

8- عبداللہ بن الحارث کا کہنا ہے: ہم نے عورتوں کو اس لیے منع کیا کہ قبروں کی زیارت کرنے والیوں سے بڑھ کر ہم نے کسی کو گمراہ نہیں پایا۔

9- امام منصور نے ابراہیم سے بیان کیا کہ وہ لوگ قبروں کی زیارت کو ناپسند کرتے تھے۔

10- حضرت حسان بن ثابت کے بیٹے عبدالرحمٰن اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر لعنت فرمائی۔

11- امام الشعبی کا بیان ہے اگر رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت سے منع نہ کیا ہوتا تو میں اپنی بیٹی کی قبر کی زیارت کرتا۔

قاضی صاحب کی ناانصافی

قاضی السبکی صاحب نے ابن ابی شیبہ کے حوالے سے لکھا ہے قبروں کی زیارت کی کراہت کے سلسلہ میں صرف یہی دو قول ہیں کہ جن سے قبروں کی زیارت سے روکنے والا استدلال کرسکتا ہے۔ یعنی ایک امام الشعبی والا جو فہرست میں گیارہویں نمبر پر ہے اور دوسرا وہ جو نمبر 9 میں منقول ہے۔ ان کے نزدیک ان دو کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ حالانکہ امام ابن ابی شیبہ نے گیارہ روایات کراہت کے باب میں نقل کی ہیں۔ اگر ان کے نزدیک ان میں کراہت لفظی یا معنوی نہ ہوتی تو وہ کراہت والے باب میں ان کا ذکر نہ کرتے۔ ان روایات میں ایک روایت امام ابن سیرین (المتوفی 110ھ) کی ہے۔ صبحی صالح کی علوم الحدیث کے مطابق ان کی ملاقات تین صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہوئی۔ وہ بھی قبروں کی زیارت کو پسند نہیں کرتے تھے۔

مصنف عبدالرزاق (3 ص569) میں بھی امام الشعبی اور امام النخعی کے اقوال کے ساتھ قتادہ (المتوفی 118ھ) سے یہ قول بھی منقول ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے قبروں کی زیارت کی وہ ہم میں سے نہیں۔

مصنف (ج3 ص577 رقم 6726) میں ہی سہیل سے مروی ہے۔ الحسن بن الحسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ نے ایک قوم کو دیکھا۔ فَنَھاھُمْ تو انہوں نے ان کو منع کیا اور انہوں نے کہا: بے شک نبی ﷺ نے فرمایا: میری قبر کو عید اور اپنے گھر کو قبریں نہ بنالینا، جہاں تم ہو وہیں سے مجھ پر درود بھیجا کرو بلاشبہ تمہارا درود مجھے پہنچ جایا کرے گا۔

روایت میں واضح طور پر منقول ہے کہ حسن بن حسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ نے قبر مبارک کے پاس جمع ہونے سے منع کیا اور دور سے درود بھیجنے کی ان کو تلقین کی اور ان کو یقین دلایا کہ ان کا

دوردراز جگہوں سے بھی درود آپ کو پہنچتا ہے۔ زیارت کی ضرورت نہیں۔

محترم قاضی صاحب نے اس روایت کے ساتھ حضرت زین العابدین کی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں حد سے تجاوز کر رہا تھا اور مسنون طریقہ کو چھوڑ رہا ہے جبکہ حسن بن حسنؓ بن علیؓ پر انہوں نے کوئی تبصرہ نہ فرمایا جس میں صریحاً زیارت کرنے والی قوم کو منع کیا گیا تھا۔

ایک طرف تو زیارت کو واجب کرنے پر اصرار اور دوسری طرف حد سے نہ بڑھنے اور مسنون طریقہ کو چھوڑنے کی تاویل۔

قاضی صاحب کو ابن ابی شیبہ میں کراہت کے صرف دو قول دکھائی دیئے۔ جبکہ کراہت کو اپنانے والے صحابہ اور تابعین اکثریت میں تھے۔ اس کی صراحت مصنف عبدالرزاق (ج 3 ص 576) میں عبیداللہ بن عمرؓ کی روایت سے موجود ہے کہ سفر پر جانے سے پہلے اور سفر سے واپس آکر قبر مبارک پر جانا اور اللہ کے رسول اور ابو بکرؓ اور عمر فاروقؓ کو سلام کہنا۔ ایسا صرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ہی معمول تھا۔ دیگر صحابہ ایسا نہیں کرتے تھے اگر کرتے تو اس کا ذکر قاضی صاحب کی کتاب میں ضرور ہوتا۔

اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے قاضی صاحب نے کبار تابعین کے اقوال کو شاذ قرار دے دیا اور ان کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ائمہ حدیث کے نزدیک وہ بلند مقام والے تھے۔ جس بنا پر رسول اللہ ﷺ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائی اور اپنی امت کو ان کی پیروی کرنے اور آپ کی قبر مبارک کو عید اور بت بنانے سے منع کیا تھا۔ قاضی صاحب نے رسول اللہ ﷺ کی امت کو اسی طرف لگانے کے لیے کتاب رقم کر دی۔ قبر مبارک کی زیارت اور اس کے لیے سفر کو عین عبادت اور کار ثواب فرما دیا۔

شفاء السقام (عربی ص 83-84 اور اردو ص 114) میں قاضی صاحب کا

استدلال ہے کہ قبر کی زیارت صاحب قبر کی تعظیم ہوتی ہے اور نبی کی تعظیم واجب ہے اور غیر نبی کی تعظیم واجب نہیں۔ اسی وجہ سے آپ کی قبر مبارک کے لیے مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں اور نبی کی قبر مبارک کے لیے عورتوں کو گھر سے نکلنے کی بھی کوئی ممانعت نہیں لیکن دیگر قبور کی زیارت کے استحباب میں اجماع صرف مردوں کے لیے ہے۔

پھر عورتوں کے لیے زیارت قبور پر مسلک شافعیہ کے چار اقوال نقل کر دیئے۔ مشہور قول ان کے نزدیک یہ ہے کہ قبرستان جانا مکروہ ہے۔ شیخ ابو حامد محاملی الصباغ، جرجانی، نصر قدسی اور ابن ابی عصرون وغیرہ رحمہم اللہ اسی کے قائل تھے۔ رافعی کا کہنا ہے کہ اکثر نے اس کے سوا کوئی ذکر نہیں کیا۔ امام نووی نے بھی یہی کہا۔ لیکن صراحت کردی کہ کراہت تنزیہی ہے۔

دوسرے قول کے مطابق جو صاحب المہذب اور صاحب البیان کا ہے یہ جائز ہی نہیں، تیسرا قول ہے کہ یہ نہ مباح ہے اور نہ ہی مکروہ۔

چوتھا قول ہے کہ ان کا زیارت کرنا، غم تازہ کرنے یا نوحہ کرنے کے لیے ہو تو حرام ہے۔ جیسی کہ ان کی عادت تھی۔ اگر نوحہ کرنے اور غم تازہ کرنے کے لیے نہ ہو اور عورت بھی بوڑھی ہو تو مکروہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ ان کا مساجد میں حاضر ہونا ہے۔ الشاسی نے فرق اس کے لیے کیا کہ مردوں میں ضبط وقوت ہونے کی وجہ سے وہ روتے نہیں اور جزع بھی نہیں کرتے اور اس کے برعکس عورتوں میں اس کی کمی ہوتی ہے۔

منع کرنے والوں کی دلیل امام ترمذی کی روایت ہے جو ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبروں کی زیادہ زیارت کرنے والیوں پر اللہ کی لعنت ہو، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا اور ابن ماجہ نے حسان بن ثابتؓ سے روایت کی۔

قبروں کی تعظیم اور زیارت میں فرق

جناب قاضی السبکی نے قبر کی زیارت کو صاحب قبر کی تعظیم قرار دیتے ہوئے نبی ﷺ کی تعظیم کو واجب کیا ہے۔ حالانکہ آپ کی تعظیم ہر مسلمان پر ویسے ہی واجب و لازم ہے اور اس کا ثبوت مہیا کرنے کے لیے آپ کی قبر مبارک کی زیارت کرنا اس پر واجب نہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ غیر نبی کی تعظیم واجب نہیں، جبکہ اسلام کی تعلیم ہے کہ ہر میت کی تعظیم اسی طرح کی جائے جیسے اس کی زندگی میں کی جاتی تھی۔

صحیح مسلم (کتاب الجنائز ج 1 ص 312) میں اس سلسلے میں تین روایات منقول ہیں:

1- جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو گچ چونا لگا کر پکا کرنے اور ان پر عمارت بنانے اور ان پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔

2- ابو مرثد الغنوی کا کہنا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قبروں پر نہ بیٹھنا اور نہ ان کی طرف نماز پڑھنا۔

3- ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں کوئی ایک انگارے پر بیٹھے جس سے اس کے کپڑے جل جائیں اور وہ اس کی جلد تک پہنچ جائے۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی قبر پر بیٹھے۔

موطا امام مالك (باب ماجاء فی الاختفاء، تنویر الحوالك ج1 ص185)

ابو داؤد (کتاب الجنائز ص 458) ابن ماجه (کتاب الجنائز باب فی النهی عظام المیت ص 116) میں عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام سلمۃ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میت کی کسی ہڈی کو توڑنا ایسے ہی ہے جیسے اس کی زندگی میں اس کی ہڈی کو توڑنا تھا،

الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔

میت کو نہلانا، کفنانا، کندھوں پر اٹھا کر جنازگاہ لانا، پھر اس کا جنازہ پڑھنا پڑھانا اور دفنانے کے بعد اس کے لیے دعا کرنا اور جب بھی موقع ملے اس کی قبر پر آ کر اس کی بخشش طلب کرنا اور اپنی دعاؤں میں اسے یاد رکھنا۔ یہی میت کی تعظیم ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قبروں کی زیارت کیا کرو۔ یہ موت اور آخرت یاد دلاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ موت کا سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور قیامت تک جاری رہے گا۔ بڑے بڑے عظیم اور جلیل القدر انسان آئے اور اپنا وقت پورا کر کے چلے گئے۔ بقول قاضی السبکی رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک سید القبور رہے۔ لہٰذا وہاں موت کا تصور بھی اسی کے مطابق ہونا چاہیے۔

سورۃ فاطر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے اور خطاب سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ سے تھا:

﴿وَ مَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ (۱۹) وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ (۲۰) وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ (۲۱) وَ مَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ (۲۲) اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ (۲۳)﴾

اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں ہیں اور نہ ہی اندھیرے اور اجالے اور نہ ہی دھوپ اور سایہ اور نہ ہی زندہ اور مردے برابر ہیں۔ بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے سنا دیتا ہے اور آپ ان کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں۔ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں۔

میت کی تعظیم سے مراد اس کی قبر اور اس کی ہڈیوں وغیرہ کا احترام ہے جبکہ زیارت سے مراد میت کے لیے دعا اور موت و آخرت کو یاد کرنا ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرتے ہوئے درود و سلام کی صورت میں دعا ہی کی جاتی ہے۔

جہاں تک عورتوں کی زیارت کا تعلق ہے قاضی السبکی صاحب نے اپنے مسلک کے ائمہ کرام کے حوالے سے خود ہی نقل کر دیا کہ ان کی اکثریت عورتوں کے قبرستان جانے کو مکروہ سمجھتی تھی۔ حالانکہ قبروں کی زیارت کرنے کی رخصت سے وہ اچھی طرح آگاہ تھے لیکن قاضی صاحب نے ان کے فیصلے کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے اپنی سوچ کو غالب کرنے کی کوشش ہی کی۔

قاضی صاحب نے شفاء السقام (ص 88 عربی اور ص 119 اردو) میں ایک روایت ابن عباس سے بغیر سند نقل کر کے فرما دیا کہ اس حدیث کو بہت سے لوگوں نے روایت کیا ہے۔ حدیث ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی مومن اپنے اس مومن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے کہ جس کی دنیا میں اس سے جان پہچان تھی۔ وہ اس کو سلام کرتا ہے، مردہ اس کو پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

اہل علم پر واجب ہوتا ہے کہ کوئی حوالہ دیتے ہوئے اصل کتاب کا نام اور روایت کی سند کے اصل راوی کے دو تین نچلے راویوں کے نام بھی ساتھ لکھیں، تا کہ تحقیق کرنے والے کو موقع ملے کہ وہ بھی اپنی تسلی کر لے۔

کتاب المتروکین (ج 2 ص 22) اور میزان الاعتدال (ج 2 ص 565) میں یہ روایت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے مروی ہے جس کے بارے میں امام الذہبی نے یحیی بن معین، النسائی، اور امام بخاری سے اس کا ضعیف ہونا نقل کیا ہے۔ امام ابن حبان کا کہنا ہے: وہ خبر بدل دیتا تھا۔ (نوح علیہ السلام کی کشتی کو بیت اللہ کا طواف کرانے اور مقام ابراہیم پر نفل پڑھوانے والا یہی راوی ہے)۔

روایت میں یہ نہیں بتایا کہ مردہ اس کے سلام کا جو جواب دیتا ہے سلام کہنے والا بھی سنتا ہے کہ نہیں۔

صحیح مسلم (کتاب الجنائز ج1 ص314) میں سلیمان اپنے باپ بریدہ سے بیان کرتے ہیں:

جب صحابہ مقابر کی طرف نکلتے تو رسول اللہ ﷺ ان کو سکھایا کرتے تھے یعنی کہو:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ نَسْئَلُ اللّٰہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ۔

اے مومنوں اور مسلمانوں کے گھروں میں رہنے والو! تم پر سلامتی ہو اور بے شک ہم اگر اللہ نے چاہا تو تمہارے ساتھ ضرور ملنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔

اس دعا ہی میں اہل قبور کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ رہی بات نذر کی تو اس کے لیے رحمۃ للعالمین ﷺ نے بڑی خوبصورت راہنمائی فرمائی۔

صحیح بخاری (کتاب الایمان والنذر: باب الوفاء بالنذر ص990)، صحیح مسلم (کتاب النذر ج2 ص44) میں ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

لَا تَنْذِرُوْا فَاِنَّ النَّذَرَ لَا یُغْنِی مِنَ الْقَدْرِ شَیْئًا وَّ اِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِہٖ مِنَ الْبَخِیْلِ۔

نذریں نہ مانا کرو، بے شک نذر مقدر شدہ سے کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی بلکہ اس کے ذریعہ بخیل سے مال نکالا جاتا ہے۔

۹

شفاء السقام کا چھٹا باب

اس باب میں قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی صاحب نے نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کو قربت ثابت کرنے کی کوشش میں پہلی دلیل سورۃ النساء کی آیت نمبر 64 کو ہی بنایا۔ دوسری دلیل میں پہلے باب میں بیان ہونے والی ضعیف روایات کا ذکر فرمایا جن پر تفصیلاً بحث ہو چکی ہے۔

ان کی تیسری دلیل کے الفاظ ہیں:

فَقَدْ ثَبَتَ خُرُوْجُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم مِنَ الْمَدِیْنَۃِ لِزِیَارَۃِ الْقُبُوْرِ وَاِذَا جَازَ الْخُرُوْجُ اِلَی الْقَرِیْبِ جَازَ اِلَی الْبَعِیْدِ فَمَا وَرَدَ فِی ذٰلِکَ خُرُوْجُہٗ اِلَی الْبَقِیْعِ کَمَا ھُوَ ثَابِتٌ فِی الصَّحِیْحِ۔ (ص 101 عربی۔ ص 136 اردو)

نبی ﷺ کا قبروں کی زیارت کے لیے مدینہ سے نکلنا ثابت ہے جب قریب جانا جائز ہے تو دور جانا بھی جائز ہوگا۔ بقیع کی طرف جانا بھی اس سلسلہ میں وارد ہوا ہے جیسا کہ صحیح میں ثابت ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے شہدائے احد کی قبروں کی طرف جانے سے قاضی صاحب نے ایسا استدلال کیا کہ جو ان سے پہلے کسی نے نہ کیا۔ انہوں نے بقیع غرقد اور شہداء احد کی قبروں کا مدینہ سے باہر ہونا ثابت کر دیا حالانکہ دونوں ہی مدینہ میں ہیں۔ بقیع تو مسجد نبوی کے بالکل قریب ہے اور شہدائے احد کی قبریں بھی مدینہ کے اندر ہی ہیں لیکن قاضی صاحب نے دعویٰ کر دیا کہ آپ مدینہ سے باہر قبروں کی زیارت کے لیے

نکلے۔ ساتھ ہی یہ فرما دیا کہ جب قریب کی قبروں کی زیارت کے لیے جانا جائز ہے تو دور والی قبروں کی طرف جانا بھی جائز ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ جب غیر نبی کی قبر کی زیارت کے لیے نکلنا جائز ہے تو نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کرنا اور نکلنا اولیٰ ہوگا۔

تان سفر پر آکر ٹوٹی، جنت البقیع اور جنگِ احد کے شہداء کی قبور تک جانے کو سفر قرار دے دیا۔ قاضی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ وہ سفر کیسے اور کتنی دیر میں طے کیا کرتے تھے۔ سنن ابو داؤد: کتاب المناسک: زیارۃ القبور کے باب میں مذکور حدیث میں واضح طور پر منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ شہدائے احد کی قبور کی طرف پیدل ہی نکلے۔ اصل مسئلہ تو بیرون مدینہ سے زیارت کے قصد سے مدینہ کا سفر کرنا ہے۔ آیا وہ جائز ہے کہ نہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے واضح الفاظ میں اس کو جائز فرمایا تو پھر اس اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب آپ کا کوئی ایسا ارشاد مبارک موجود نہیں تو پھر گنجائش پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن قاضی صاحب نے نہ صرف اس کو جائز بلکہ عین عبادت ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

حق کا اعتراف اور انحراف

چوتھی دلیل میں انہوں نے سلف وخلف کے اجماع واتفاق کا ذکر یوں فرمایا کہ حج کرنے کے بعد ہر سال لوگ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کے لیے مدینہ جاتے ہیں۔ قاضی صاحب کی عادت وہی ہے کہ اپنی ہر دلیل اور حوالے پر سلف وخلف کا اجماع ضرور تحریر کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ اپنا دعویٰ ہی ہوتا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ پھر بات بھی ایسے انداز میں رقم کرتے ہیں جس میں اصل حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہوتا

ہے چنانچہ (عربی ص 102، اردو ص 138 میں) ان کا فرمان ہے:

اگر کوئی کہے کہ وہ اس سفر میں دوسری عبادت کا قصد بھی کر لیتے ہوں گے بلکہ ظاہر یہی ہے کہ وہ اس سفر میں دوسری عبادت کا قصد بھی کر لیتے ہوں گے اور ضرور ایسا کرتے ہوں گے۔ اس لیے کہ اکثر مصنفین مناسک کی بحث میں کہتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کے ساتھ مسجد نبوی میں جانے اور وہاں نماز پڑھنے کی بھی نیت کر لے۔ زیارت کا انکار کرنے والے بھی دراصل زیارت کے منکر نہیں بلکہ مستحبہ زیارت کی کیفیت بیان کرتے ہیں اور وہ یہ کہ زیارت کے ساتھ مسجد کا بھی قصد کر لیا جائے۔

قاضی صاحب کی چوتھی دلیل کی پہلی عبارت میں زیارت پر سلف وخلف کا اجماع مذکور ہے جبکہ بعد والی عبارت میں مناسک کے اکثر مصنفین کے بارے میں ان کا اپنا کہنا ہے کہ ان کے مطابق مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی نیت بھی ہونی چاہیۓ۔ ان کا یہ قول بڑا اہم ہے کہ زیارت کے منکرین بھی زیارت کے منکر نہیں بلکہ وہ زیارۃ مستحبہ کی کیفیت بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ زیارت کے ساتھ مسجد کا بھی قصد کر لیا جائے۔

قاضی صاحب نے اگرچہ حق کو قبول کیا لیکن الٹی طرف سے یعنی زیارت کے ساتھ مسجد نبوی کی بھی نیت ہونی چاہیۓ حالانکہ سیدھی بات یہ ہے کہ مسجد نبوی کی نیت کی جائے اور وہاں جا کر قبر مبارک کے پاس جا کر درود وسلام کہا جائے۔

قاضی صاحب نے یہ بھی عجیب بات لکھی کہ

لوگ جب مدینہ منورہ کا قصد کرتے ہیں تو زیارت ہی کا قصد کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں زیارت کے علاوہ ثواب کی دیگر باتوں کا خیال تک نہیں آتا۔ ان کی بڑی غرض زیارت ہی ہوتی ہے۔ اگر وہاں زیارت کا معاملہ نہ ہوتا تو وہاں کا سفر ہی نہ

کرتے۔ چنانچہ مسلمان بیت المقدس کا سفر بہت کم کرتے ہیں۔ اگرچہ وہاں بھی نماز کی فضیلت احادیث سے ثابت ہے پس ثابت ہوا کہ مدینہ منورہ جانے کا اصلی مقصد زیارت ہے جیسے مکہ معظمہ جانے کا اصلی مقصد حج اور عمرہ ہے۔

باقی رہا مناسک حج کے بارے میں کتابیں لکھنے والوں کا طریقہ جو وہ اختیار کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انہوں نے زیارت کے لیے مسجد نبوی کے قصد کو بمنزلہ شرط کے ذکر کیا ہے بلکہ ان کا مقصود یہ ہے کہ زیارت کی قربت کے ساتھ دوسری قربتیں بھی حاصل کرلی جائیں۔ جیسے شہدائے احد کی قبروں کی زیارت ہے۔ مصنفین نے اس خیال کی تنبیہ کی ہے کہ کہیں زیارت کو جانے والا دیگر قربات کی نیت کو زیارت کے اجر کی کمی کا سبب نہ سمجھ لے۔ اسی وجہ سے ابوعمرو ابن الصلاح نے تصریح کی ہے کہ دیگر قربات کا قصد زیارت کے ثواب میں کوئی کمی پیدا نہیں کرتا۔ اب اگر کوئی سمجھ لے کہ مسجد نبوی کا قصد زیارت کے قصد کے لیے بمنزلہ شرط بیان ہوا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔

مذکورہ عبارت کا تجزیہ

اس عبارت میں قاضی صاحب نے کسی مستند حوالہ سے کسی مصنف کی ایسی کتاب کی عبارت نقل نہیں کی کہ جس سے وہ ثابت ہوتا جو قاضی صاحب نے بیان فرمایا۔ مستند کتابوں میں مدینہ منورہ جانے والوں کو مسجد نبوی کی ہی نیت کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ اسی لیے قاضی صاحب کو یہ تاویل کرنی پڑی کہ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انہوں نے زیارت کے لیے مسجد نبوی کے قصد کو بمنزلہ شرط کے ذکر کیا ہے۔

قاضی تقی الدین السبکی نے قاضی عیاض کی الشفاء کے کئی ایسے حوالے دیئے ہیں جو

ائمہ حدیث کے نزدیک بے اصل ہیں۔اس کے باوجودانہوں نے بھی الشفاء (ج 2 ص 85) میں فقیہ اسحاق بن ابراہیم سے نقل کیا ہے۔ جو لوگ حج کرتے ہیں ان کا مدینہ جانے کا ہمیشہ سے معمول رہا ہے۔ پھر انہوں نے معمول کی وضاحت یوں کی ہے:

وَالْقَصْدُ اِلَی الصَّلَاۃِ فِی مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلی اللّٰہُ علیہ وسلم وَالتَّبَرُّکُ بِرُؤْیَۃِ رَوْضَتِہٖ وَمِنْبَرِہٖ وَقَبْرِہٖ وَمَجْلِسِہٖ وَمَلَامِسِ یَدَیْہِ وَمَوَاطِئِ قَدَمَیْہِ وَالْعَمُوْدِ الَّذِیْ کَانَ یَسْتَنِدُ اِلَیْہِ وَیَنْزِلُ جِبْرَئِیْلُ بِالْوَحْیِ فِیْہِ وبِمَنْ عَمَرَہٗ وَقَصَدَہٗ مِنَ الصَّحَابَۃِ وَاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَاِعْتِبَارُ بِذٰلِکَ کُلِّہٖ۔

اور ان کا رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں نماز پڑھنے کا قصد کرنا اور آپ کے روضہ مبارک اور آپ کے منبر اور آپ کی قبر مبارک اور وہ جگہ جہاں آپ بیٹھا کرتے اور جن کو آپ کے ہاتھ چھوا کرتے اور آپ کے قدم جہاں پڑا کرتے اور وہ ستون کہ جس سے آپ ٹیک لگایا کرتے تھے اور جہاں جبرائیل وحی کے ساتھ نازل ہوا کرتے اور وہ جن کو آپ نے آباد کیا اور صحابہ وائمہ مسلمین نے ان کا قصد کیا اور اسی اعتبار سے تمام جگہوں سے برکت حاصل کرنا ہوتا ہے۔

اس حوالے کو نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مدینہ جانے والوں کا قصد مسجد نبوی میں نماز پڑھنا اور اس کے ساتھ مذکور دوسرے کام کرنا ہیں لیکن اصل قصد مسجد نبوی ہی ہوتا تھا۔

مسند احمد کی شرح الفتح الربّانی (ج 13 ص 17) میں ''تتمۃٌ فِی حُکْمِ زِیَارَۃِ قَبْرِ النَّبِی صلی اللہ علیہ وسلم وَ اٰدَابِھَا'' کے تحت شارح کا کہنا ہے۔ اللہ تجھے اور مجھے ہدایت سے نوازے۔ جان لے کہ امام احمدؒ کی مسند اور صحاح ستہ میں نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت خصوصی طور پر کرنے کی رغبت دلانے والی ایک بھی صریح حدیث کا

مجھے علم نہیں۔ البتہ ان کتابوں کے علاوہ اور کتابوں میں آپ کی قبر مبارک کی زیارت کرنے کی رغبت دلانے والی احادیث ہیں لیکن وہ تمام ضعیف ہیں جیسا کہ تحقیق کرنے والوں نے کہا ہے۔

پھران تمام احادیث کا ذکراوران کی تخریج کرنے کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانی کا فیصلہ بھی نقل کیا ہے۔ اَکْثَرُ مُتُونِ ھٰذِهِ الْاَحَادِیْثِ مَوْضُوْعَةٌ۔ ان احادیث کے اکثر متون من گھڑت ہیں۔

امام بیہقی کی السنن الکبری (ج 5 ص 244) میں باب کا عنوان ہے:

"اَلْخُرُوْجُ اِلَی الْمَدِیْنَةِ مَدِیْنَةِ الرَّسُوْلِ صلی اللّٰهُ عَلیه وسلم" رسول اللہ ﷺ کے شہر مدینہ کی طرف نکلنا۔

اس باب میں پہلی حدیث ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ سفر کے لیے صرف تین مساجد کی طرف کجاوے باندھے جائیں۔ وہ مسجد حرام، مسجد اقصی اور میری مسجد ہے۔

دوسری حدیث کے راوی بھی ابوھریرہؓ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تین مساجد کی طرف سفر کیا جائے۔ وہ مسجد کعبہ، میری مسجد اور مسجد ایلیاء ہے۔ میری مسجد میں نماز پڑھنا مسجد کعبہ کے علاوہ دوسری مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے زیادہ مجھے محبوب ہے۔

پہلی حدیث کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بخاری مسلم کی اور دوسری صحیح مسلم کی ہے۔ ابوسعید الخدری اوران کے علاوہ دوسروں سے بھی ثابت ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تلخیص الحبیر (ج 2 ص 475) میں پہلی حدیث کو نقل کرکے اس کے دوسرے صحابہ راویوں کے نام بھی درج کردیئے ہیں اور وہ ابو بصرہ الغفاری رضی اللہ عنہ، ابن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمروؓ، عمرؓ بن الخطاب، ابوالجعدؓ الضمری، علیؓ بن ابی

طالب، المقدامؓ اور ابو امامۃؓ۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان مذکور صحابہ کی روایت جن جن کتابوں میں ہے ان کے مکمل حوالے بھی نقل کر دیئے ہیں۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ جاتے ہوئے مسجد نبوی کی ہی نیت ہونی چاہئے۔

پانچویں دلیل

بحث کو مزید طول دینے کے لیے قاضی السبکی صاحب نے زیارت کے لیے کئے جانے والے سفر کو بھی قربت ہی ثابت کرنے کی کوشش میں اصولیوں والا بھی انداز اختیار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے قربت کا وسیلہ بھی قربت ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے نماز کے لیے وضو کرنا، نماز کے لیے مسجد آنا، نماز کی خاطر دور سے آنا، مسجد کے قریب گھر لینے کی بجائے دور والے کو ترجیح دینا، جمعہ کے لیے غسل کر کے مسجد میں امام کے قریب بیٹھنا اور مریض کی عیادت کرنا۔ ان احادیث کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ یہ تمام احادیث واضح کرتی ہیں کہ قربت کا وسیلہ بھی قربت ہوتا ہے۔

قاضی صاحب نے اپنے موقف کی بہترین دلیل سورۃ النسآء کی اس آیت کو بنایا:

﴿مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (١٠٠)﴾

جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے اپنے گھر سے نکلے پھر موت اس پر واقع ہو جائے تو اللہ پر اس کا اجر ثابت ہو گیا۔

قاضی صاحب کا کہنا ہے: زیارت کے لیے سفر کرنے والا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کرنے والا ہی ہوتا ہے اور انہوں نے سورۃ التوبہ کی دو آیتیں

نقل کردیں۔

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ لَا یُصِیْبُھُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَطَئُوْنَ مَوْطِئًا یَّغِیْظُ الْکُفَّارَ وَ لَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۲۰) وَ لَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِیْرَةً وَّ لَا کَبِیْرَةً وَّ لَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۲۱)﴾

یہ اس لیے کہ ان کو اللہ کی راہ میں جو پیاس ومشقت اور بھوک پہنچے گی اور جس زمین پر وہ چلیں گے جو کفار کو غضبناک کردے اور دشمن سے جو تکلیف پائیں گے مگر اس کے بدلے ان کے لیے نیک عمل لکھ لیا جائے گا۔ بے شک اللہ احسان کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا اور جو بھی تھوڑا اور زیادہ خرچہ وہ خرچ کریں گے اور کسی وادی میں سے گزریں گے مگر ان کے لیے لکھ لیا جائے گا۔ تاکہ اللہ ان کو بہترین جزا دے جو وہ کیا کرتے تھے۔

قاضی صاحب نے مذکورہ حوالوں اور دیگر بے مقصد اور غیر متعلقہ طویل بحث سے یہ ثابت کیا ہے کہ قربت کا وسیلہ بھی قربت ہوتا ہے۔ اس لیے زیارت کے قصد سے زیارت کے لیے سفر بھی قربت ہے۔

مذکورہ دلیل کا تجزیہ

قاضی صاحب نے قبر مبارک کی زیارت اور اس کے لیے سفر کو عبادت اور کار خیر ثابت کرنے کے لیے ان فرائض پر قیاس کیا ہے کہ جن کو ترک کرنے والا اسلام سے خارج یا گناہگار ہوجاتا ہے جبکہ قبر مبارک کی زیارت فرائض میں شامل نہیں۔ اس کے

ترک کرنے پر کوئی گناہ نہیں۔لیکن کرنا مستحب ہے۔اس کا بھی طریقہ رسول اللہ ﷺ نے سمجھا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ قبروں کی زیارت کا مقصد موت اور آخرت کو یاد کرنا اور عبرت حاصل کرنا ہے۔

قاضی صاحب نے سورۃ النساء کی جس آیت مبارکہ کا حوالہ دیا ہے اس کا جو حصہ چھوڑ دیا وہ یہ ہے:

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَ سَعَةً.

اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سی جگہیں اور کشادگی پائے گا۔

یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی جو لا الہ الا اللہ کا اقرار تو کرتے تھے لیکن مکہ میں مقیم رہے۔ان کو ہجرت کرنے کی ترغیب و تلقین تھی۔

ہجرت کا معنی

هَجَرَ يَهْجُرُ هَجْراً وهِجْرَاناً کا معنی ہے: قطع تعلق کرنا اور چھوڑ دینا۔اگر مزید فیہ کے باب مفاعلۃ پر لایا جائے تو هَاجَرَ يُهَاجِرُ مُهَاجَرَةً بن جاتا ہے جس کا معنی ہے: وطن کو چھوڑ دینا یعنی اپنی جائے پیدائش و رہائش کو ترک کر کے کسی اور جگہ منتقل ہو جانا۔

اس کا سلسلہ اسلام میں اس وقت شروع ہوا جب اہل مکہ کی اسلام دشمنی کی وجہ سے اہل اسلام کی ایک جماعت نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور جب مدینہ طیبہ میں انصار اسلام کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا تو مکہ میں قریش مکہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے والے اہل ایمان مدینہ طیبہ منتقل ہونے لگے اور جب دار الندوہ میں سید الانبیاء ﷺ کو ختم کرنے کا پروگرام بن گیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آپ کے گھر کو گھیر لیا گیا تو آپ نے ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ایسی ہجرت اہل

اسلام کے فتح مکہ تک فرض رہی کیونکہ اس وقت تک مدینہ طیبہ دار السلام تھا اور اس کے علاوہ سارا عربَ دارالحرب تھا۔ مگر جب مکہ فتح ہوگیا اور اسلام کی روشنی سے جن علاقوں میں لوگوں کے دل منور ہوگئے تو تمام وہ علاقے بھی دارالسلام کا حصہ بن گئے۔ اس لیے مدینہ کی طرف ہجرت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

صحیح بخاری (کتاب الجہاد ص 390-396,433)، صحیح مسلم (باب المبایعة بعد فتح مكة ج2 ص130) میں ابن عباس سے مروی ہے: نبی ﷺ نے فتح مکہ والے دن فرمایا۔ فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں ہوگی لیکن جہاد اور اخلاصِ نیت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جب تمہیں جہاد کے لیے بلایا جائے تو اس کے لیے نکلا کرو۔

سنن النسائی (کتاب البیعة رقم 4176) میں نعیم بن دجاجۃ سے مروی ہے: میں نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا: لَا هِجْرَةَ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ہجرت نہیں، یعنی دارالسلام کی طرف ہجرت کا سلسلہ جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں شروع ہوا تھا اب وہ ختم ہوگیا ہے۔ جس ہجرت کا سلسلہ قیامت تک جاری رہنے والا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی بھی وضاحت کردی۔

صحیح بخاری (کتاب الایمان ص6، کتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصی ص959) میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ.

اللہ نے جس سے منع کیا ہے اس کو جو چھوڑ دے وہی مہاجر ہے۔

سنن ابو داؤد (ابواب الوتر ص204) کی روایت کے مطابق آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا:

اَیُّ هِجْرَةٍ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ هَجَرَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ۔

افضل ہجرت کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا: جس نے وہ چھوڑ دیا جو اللہ نے حرام کر دیا ہے۔

ہجرت اور زیارت میں فرق

قاضی تقی الدین السبکی نے زیارت کے لیے سفر اور صحابہ کی ہجرت والے سفر اور جہاد والے سفر کو ایک ہی درجہ میں رکھ دیا۔ یوں انہوں نے زائرین کو مہاجروں اور مجاہدوں سے ملا دیا۔ ان کو ذرا سا خیال نہ آیا کہ زائر تو زیارت کر کے واپس آ جاتا ہے جبکہ مہاجر صحابہ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ میں منتقل ہو جاتے تھے اور اسلام کی خاطر اللہ کی راہ میں نکل کر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا کرتے تھے۔

ان کے بارے میں سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۲۰)﴾

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے عظیم درجہ میں ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

قاضی تقی الدین السبکی نے سورۃ النساء کی جس آیت مبارکہ کو اپنے لیے بہترین دلیل بنایا اس کے شان نزول کے بارے میں حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ المعروف ابن عبدالبر (المتوفی 463ھ) نے اپنی کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: (رقم 290) میں نقل کیا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ ''اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا '' کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے تو جندب بن

ضمرۃ (ضمرۃ بن جندب) نے بارگاہ الٰہ میں عرض کیا: اے اللہ! اگرچہ معذرت و حجت کی گنجائش مجھے ہے لیکن میں اسے حجت نہیں بناتا اور وہ بڑی عمر والے بزرگ تھے۔ ہجرت کے لیے نکلے لیکن راستے میں ہی کسی جگہ ان کی موت واقع ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ نے کہا: ہجرت کے مقصد کو پانے سے پہلے ہی فوت ہوگئے۔ معلوم نہیں ہجرت کا اجر ان کو ملے گا کہ نہیں۔ اس پر اللہ نے وہ آیت مبارکہ نازل فرمادی کہ جس کو زیارت کے لیے قاضی صاحب نے بہترین دلیل بنایا۔

تفسیر الطبری (پ 5 آیت نمبر 100 ص 240) میں ابن زید سے مروی ہے بنو کنانہ کے ایک شخص نے نبی ﷺ کے پاس پہنچنے کے ارادے سے ہجرت کی۔ جب راستے میں اس نے وفات پائی تو اس کی قوم نے اس کا مذاق اڑاتے اور اہانت کرتے ہوئے کہا: نہ اپنی منزل تک پہنچا اور نہ اپنے اہل میں رہا۔ جو اس کی تجہیز و تکفین کرتے اور اس کو دفناتے۔ اس پر قرآن نازل ہوا:

”جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف اپنے گھر سے ہجرت کے ارادے سے نکلتا ہے اور موت اسے آلیتی ہے تو اللہ کے ہاں اس کا اجر واقع ہوجاتا ہے۔“

اسد الغابۃ (ج 3 ص 61-62 رقم 2577) میں سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے:
جب ہجرت کا حکم دیا گیا تو ضمرۃ بیمار تھے لیکن انہوں نے اپنے اہل کو حکم دیا کہ ان کے لیے ایک چارپائی بچھائی جائے اور اس پر لٹا کر ان کو رسول اللہ ﷺ کی طرف لے جایا جائے۔ ان کے اہل نے ان کی خواہش کے مطابق عمل کیا لیکن مکہ کے قریب تنعیم کے مقام پر ان کی وفات ہوگئی جس پر اجر والی آیت نازل ہوئی۔

چونکہ قاضی صاحب چیف جسٹس تھے لہٰذا انہوں نے ائمہ تفسیر و حدیث کے قائم کردہ اصولوں کو جس طرح چاہا پامال کردیا اور اپنی سوچ کو ہی فروغ دیا۔

عزت والی جگہوں کی طرف سفر کرنے کی صلاحیت

امام ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف ابن العربی (التوفی 543ھ) نے اپنی کتاب احکام القرآن میں مباح سفر کی مختلف قسموں کا ذکر کرتے ہوئے ساتویں قسم ''قَصْدُ البُقَاعِ الْکَرِیْمَۃِ'' (عزت والی جگہوں کا قصد کرنا) کے بارے میں لکھا ہے:

وَذٰلِکَ لَا یَکُوْنُ اِلَّا فِی نوعَیْنِ۔ اَحَدُھُمَا اَلْمَسَاجِدُ الْاِلٰھِیَّۃُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدَ، مَسْجِدِی ھٰذَا وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی۔

اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک اللہ کی مساجد کی طرف سفر کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صرف تین مساجد کی طرف سفر کے لیے کجاوے باندھے جائیں۔ وہ میری یہ مسجد اور مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ ہیں۔

سفر کی دوسری قسم سرحدوں کی رکھوالی اور دشمن سے بچاؤ کے لیے مجاہدین کی تعداد کو بڑھانے کے واسطے سفر کرنا ہے۔ اس میں بہت زیادہ فضیلت ہے۔

تعلیم کے حصول اور تجارتی سفروں کی بھی ابن العربی نے خوب وضاحت کی ہے لیکن قاضی السبکی صاحب نے اپنی عادت کے مطابق حق کو ٹھکراتے ہوئے لمبی بحث میں سیدھی سی بات کو بار بار الجھانے کی کوشش کی ہے۔

زیارت کو قربت اور قربت کے سفر کو قربت ثابت کرنے میں عبارت کو چار قسموں میں تقسیم کرنے اور اصولیوں کے امر و مامور بہ اور کلی جزئی کی بحث کا بھی سہارا لیا ہے۔ ان کی سمجھ میں اتنی سی بات نہ آئی کہ وہ امام ابن تیمیہ کی مخالفت نہیں بلکہ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی واضح حدیث پاک ''تین مساجد کے علاوہ حصول اجر وثواب کے لیے

سفر نہ کیا جائے'' کوٹھکرا رہے ہیں کیونکہ امام ابن تیمیہؒ نے جو کہا یا لکھا وہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہی لکھا اور کہا: اگر کہا جائے کہ امام ابن تیمیہ کو اس حدیث کی وہ سمجھ نہ آئی جو قاضی السبکی کو آئی تو یہ بات کسی بھی طرح مناسب نہیں کیونکہ امام ابن تیمیہؒ کو علم الحدیث میں جو عبور اللہ نے دیا تھا اس کی وجہ سے وہ اپنے زمانے میں ممتاز تھے۔

دارالکتب العلمیۃ کے مجموعہ الکتب ''فی ترجمۃ شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ الحنبلی'' کے سلسلے کی العقود الدریۃ ص 71 اور الکواکب الدریۃ ص 328 میں قاضی السبکی صاحب کے بیٹے قاضی تاج الدین السبکی کے استاد امام الذہبی کا بیان ہے:

امام الذہبی کی گواہی

احادیث کے راویوں، ان کے طبقات اور ان کے بارے میں جرح وتعدیل کی ان کو یعنی امام ابن تیمیہ کو پوری خبر تھی۔ فنون حدیث، احادیث کے عالی و نازل اور صحیح وسقیم کی بھی خوب معرفت تھی۔ احادیث کو حفظ کرنے میں وہ منفرد تھے۔ ان کے زمانے میں نہ کوئی ان کے علمی رتبے والا تھا اور نہ ہی کوئی قریب تھا۔ احادیث کے استحضار اور ان کے دلائل کے استخراج میں عجوبۂ روزگار تھے۔ صحاح ستہ اور مسند احمد بن حنبل کی احادیث کے لیے وہ مرجع کی حیثیت رکھتے تھے اسی لیے ان پر یہ قول صادق آتا ہے۔

''ہر وہ حدیث جس کو ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں۔''

ہر شے کا احاطہ کرنا تو صرف اللہ ہی کے لائق ہے لیکن امام ابن تیمیہؒ اور دوسرے ائمہ کے درمیان اتنا فرق ضرور تھا کہ ان کے علوم کا سرچشمہ وسیع سمندر تھا جبکہ دیگر اماموں کے علوم کا منبع چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ امام الذہبی قاضی السبکی کے ہم مسلک یعنی الشافعی تھے مگر اہل

علم ہونے کی بنا پر اہل علم کے قدر دان تھے اور حق بیان کرنے میں کسی کی ملامت کی کوئی پروانہ کیا کرتے تھے۔

سوچنے اور سمجھنے والی بات تو یہ ہے کہ جو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا، وہ ان کی کوئی اپنی ذاتی رائے نہ تھی بلکہ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک تھا جس کے مطابق خلفائے راشدین اور صحابہ نے عمل کیا۔ سات سو سال گزرنے کے باوجود قاضی السبکی صاحب کو بلال کے خواب کے واقعہ کے علاوہ کسی اور صحابی کا عمل نہ مل سکا۔ عمر بن عبدالعزیز کے سلام بھیجنے اور عبداللہ بن عمر کے سلام کرنے سے زیارت کے لیے سفر نہ تو قربت ہے اور نہ ہی قربت کا وسیلہ۔ طویل بحث و تاویل سے الجھاؤ تو پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن حق مسخ نہیں ہوتا۔ حق وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

✿✿✿

۱۰

شفاء السقام کا ساتواں باب

اس باب میں مخالف کے شبہات کا رد اور اس کے کلمات کا تتبع کیا گیا ہے اور اس کی دو فصلیں بنائی ہیں پہلی میں تین شبہات اور ان کا رد کرنے کی کوشش کی ہے۔

پہلا شبہ

رسول اللہ ﷺ کی مشہور حدیث "لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ" کے بارے میں قاضی صاحب کا فرمان ہے کہ اس حدیث کا معنی سمجھنے میں مخالف کو وہم ہوگیا کہ یہ حدیث زیارت کے سفر کی مخالفت کے لیے ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ پھر انہوں نے اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدُ'' استثناء مفرغ ہے اور اس کی تقدیر یہ ہوگی۔ ''کسی مسجد کی طرف رخت سفر نہ باندھا جائے مگر تین مساجد کی طرف'' یہ دونوں تقدیریں ضروری ہیں تا کہ مستثنٰی، مستثنٰی منہ داخل ہو جائے۔

ان دونوں تقدیروں میں سے مسجد والی تقدیر زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ مسجد مساجد کی جنس سے قریب ہے اور اس میں زیادہ تحقیق بھی نہیں کرنی پڑے گی۔

سفر میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو سفر کرنے پر آمادہ کرتی ہے جیسے حج یا جہاد یا طلب علم یا والدین کی زیارت یا ہجرت وغیرہ۔

دوسری چیز وہ مکان ہوتا ہے جو سفر کا اختتام ہوتا ہے جیسا کہ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ یا بیت مقدس یا کوئی اور جگہ، خواہ کوئی غرض ہو۔ اب اس امر میں کوئی شک نہیں کہ عرفات

کے میدان کے لیے رخت سفر باندھنا حج کے افعال کے لیے واجب ہے اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے حالانکہ وہ تین مساجد میں داخل نہیں بلکہ ایک الگ مقام ہے۔ اسی طرح طلب علم کے لیے سفر کرنا اور رخت سفر باندھنا بالاجماع جائز ہے۔ خواہ ان مساجد کے علاوہ کوئی مکان ہو، کسی مکان کا سفر کبھی مستحب کبھی واجب علی الکفایۃ اور کبھی فرض عین ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جہاد کے لیے سفر اور خاص حالات میں بلاد کفر سے بلاد اسلام کی طرف ہجرت، والدین کی زیارت کے لیے سفر اور بھائیوں کی ملاقات اور تجارت کے لیے سفر وغیرہ۔ ان سب امور کے لیے سفر بالاتفاق جائز ہے حالانکہ وہ مساجد ثلاثہ کے لیے سفر نہیں ہوتا۔

چنانچہ قاضی صاحب کا فرمان ہے کہ اصل معنی اس حدیث کے یہی ہیں کہ مساجد میں سے صرف ان تین مساجد کی طرف سفر کرنا چاہیے۔ اب دونوں تقدیروں پر مساجد یا امکنہ غایت سفر ہیں اور باعث سفر کوئی اور چیز ہے مثلاً علم حاصل کرنا وغیرہ تو یہ سفر ہر مسجد اور مکان کی طرف جائز ہوگا۔ حدیث کی یہ مراد نہیں ہو سکتی۔ پھر اس تقدیر پر نبی ﷺ کی زیارت کے قصد سے سفر کی غایت مسجد نبوی ہوگی کیونکہ وہ قبر مبارک کے ساتھ ملحق ہے تو نبی ﷺ کی زیارت کے لیے سفر کی غایت تینوں مساجد میں سے ایک مسجد ہوئی۔ اگر مساجد اور امکنہ کو علت قرار دیا جائے تو علت کے معنی یہ ہوئے کہ ان مقامات کی تعظیم کی وجہ سے سفر کیا جا رہا ہے اور ان میں داخل ہو کر تبرک حاصل کرنا مقصود ہے اور یہ اس اعتبار سے ہوگا کہ سفر کرنے والا اس سرزمین کو دوسری سرزمینوں سے افضل قرار دے رہا ہے۔

قاضی صاحب نے اپنی طویل بحث کا خلاصہ یوں بیان فرمایا۔ سفر کی ممانعت دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ ایک یہ کہ سفر کی غایت مساجد ثلاثہ کے علاوہ اور کوئی مقام ہو اور دوسری یہ کہ علت سفر کی غایت مسجد نبوی ہے اور اس کی علت اس سرزمین میں مدفون

کی تعظیم ہے نہ کہ اس مقام کی تو اس کو ممنوع کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ مطلوب سفر کے دو سبب ہونے چاہئیں۔ایک یہ کہ غایت تینوں مساجد میں کوئی مسجد ہو۔ دوسرے یہ کہ عبادت مقصود ہو، اگر وہ سفر مساجد ثلاثہ کے علاوہ ہو جبکہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر میں دونوں باتیں جمع ہیں تو یہ سفر بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہئے اور جو سفر ان اماکن کے علاوہ کے لیے ہو اور اس میں جگہ کی تعظیم مدنظر ہو تو وہ اس روایت کا مصداق ہوگی اور وہ سفر ممنوع ہوگا۔ روایت ہے تابعین میں سے بعض نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کوہ طور کی زیارت کے لیے سفر کرنے کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو انہوں نے ممانعت کی یہی روایت بیان کر دی اور اس کو اس سفر سے روک دیا اور فرمایا: کوہ طور کو چھوڑو، وہاں نہ جانا۔

مذکورہ عبارت و تاویل کا جائزہ

قاضی السبکی صاحب نے لَا تُشَدُّ الرِحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدَ میں حرف استثناء "اِلَّا" کو مفرغ قرار دے کر سیدھی سی بات کو الجھا دیا۔

کیا رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مسائل ایسے ہی سمجھایا کرتے تھے کہ ایک واضح صحیح حدیث میں اشکال پیدا ہو جائے۔ حالانکہ اہل عرب میں یہ طریقہ رہا ہے کہ کسی بات کو ہر شک و شبہ سے محفوظ کرنے کے لیے ایسی ترکیب استعمال کرتے تھے کہ جس میں حرف استثناء "اِلَّا" کو لایا جاتا تھا جیسا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

سورۃ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ (۱۴۴) نہیں ہیں محمد ﷺ مگر رسول یعنی محمد ﷺ رسول ہیں۔

اللہ کی الوہیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت میں کوئی شخص اپنے علمی تبحر کے زور پر کوئی تاویل کرنے کی کوشش کرے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا جبکہ قرآن و حدیث میں حرف ''اِلّا'' کا بہت استعمال ہوا ہے۔لسان العرب (ج 15 ص 432) میں الازھری سے منقول ہے کہ یہ بمعنی غَیرَ۔ سِوٰی ۔ لمّا۔ لٰکِنَّ اور الاستثناء المحض کے لیے آتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ قاضی صاحب کی کتاب کے مترجم نے مذکورہ صحیح حدیث کا ترجمہ ص 154 میں یوں کیا ہے۔رخت سفر نہ باندھا جائے مگر تین مساجد کی طرف، میری یہ مسجد اور مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کی طرف۔

صحیح مسلم: کتاب الحج میں ''اِلّا'' کے بغیر مروی حدیث کا ترجمہ یہ کیا ہے:

حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: (زیادہ ثواب کے حصول کی نیت سے) صرف ان تین مساجد کی طرف سفر کیا جائے۔ مسجد کعبہ، میری مسجد اور مسجد ایلیاء (بیت المقدس)

مترجم نے ثواب کے حصول سے پہلے ''زیادہ'' کا لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ قاضی السبکی نے بھی اپنی الجھاؤ والی طویل بحث کی خود ہی نفی کردی جب انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے طور پہاڑ کی زیارت کرنے کا ارادہ رکھنے والے کو سفر سے روکتے ہوئے لَا تُشَدُّ الرِحَالُ والی روایت کا ہی حوالہ دیا۔

کئی مرتبہ پہلے بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ تجارت، حصول علم کے لیے اور عزیز و اقارب کی ملاقات کے لیے کسی سفر کی ممانعت رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں۔ بلکہ ان سفروں سے روکا گیا ہے جن میں قبروں، مشاہد اور ایسی جگہوں کا قصد ہو کہ جہاں سے ثواب کے حصول کی نیت ہو، لیکن قاضی صاحب نے مجرد سفر کو مباح سے ملا کر مغالطہ

دینے کی کوشش کی۔ اسلام میں قبروں کی زیارت کا مقصد اہل قبور کے لیے دعا کرنا اور آخرت کو یاد رکھنا اور عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے جبکہ یہود و نصاریٰ اور مشرکوں کا عمل اس کے برعکس ہوا کرتا تھا اور اب بھی ہے۔ اور قاضی صاحب نے بھی اہل اسلام کے لیے راہ ہموار کردی۔ اسی لیے سید الانبیاء ﷺ نے اپنی امت کو ایسے سفروں سے منع فرما دیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سیدھی سی بات کو سمجھ کر اسی کے مطابق عمل کیا۔ اسی لیے قاضی صاحب کو تمام تر کوشش کے باوجود اجر وثواب کے حصول کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک صحابی کا حوالہ نہ مل سکا۔ بلال رضی اللہ عنہ کے خواب کا واقعہ بھی اجر وثواب کے سفر میں شمار نہیں ہوتا بلکہ ملاقاتوں والے سفروں ہی میں شمار ہوگا۔ رہی بات ابن عمر رضی اللہ عنہ کے سفر سے واپسی پر سلام کرنے اور عمر بن عبدالعزیز کے سلام بھیجنے کی تو وہ بھی ممنوعہ سفر میں شمار نہیں ہوتے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک تین مساجد کے علاوہ اجر وثواب کے حصول کے لیے سفر کرنا جائز نہ تھا۔ اسی لیے طور پہاڑ کی زیارت کا ارادہ رکھنے والے کو انہوں نے روک دیا۔

مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی مسجد کی طرف سفر کی شرعی حیثیت

مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی مسجد کی طرف سفر کی شرعی حیثیت کے تحت شفاء السقام میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مساجد ثلاثہ کے علاوہ اجر وثواب کے لیے سفر کرنے کو غیر شرعی سمجھنے والے صرف امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہی نہ تھے بلکہ اور بھی فقہاء کرام تھے۔ لیکن تنقید و ظلم کا نشانہ صرف انہی کو بنایا گیا اور قاضی القضاۃ السبکی نے تو تمام ضعیف و موضوع روایات اور خوابوں اور حکایات کا سہارا لے کر ایک کتاب بھی رقم کردی جس سے غیر شرعی زیارتوں کو فروغ ملا۔ قاضی صاحب نے اپنے منصب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر

اس واضح اور صریح نص میں تاویل کر کے اس کے مقصد کو مشکوک بنانے کی کوشش کی جو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد مبارک کے مطابق اور قاضی صاحب کی سوچ کے خلاف تھی، حالانکہ انہوں نے خود لکھا ہے:

مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی دوسری مسجد کے لیے سفر کرنے کے بارے میں فقہائے کرام نے کلام کیا ہے۔ امام الحرمین نے اپنے شیخ ابو محمد سے نقل کیا ہے کہ وہ مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی مسجد کے لئے سفر کرنے سے منع کرتے تھے اور بسا اوقات کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ سفر مکروہ ہے اور کبھی کہہ دیتے کہ حرام ہے۔ (عربی ص 121، اردو ص 157)

شیخ ابو علی نے فرمایا کہ یہ سفر نہ مکروہ ہے اور نہ ہی حرام۔ ہاں رسول اللہ ﷺ نے یہ واضح کر دیا کہ قربت صرف مساجد ثلاثہ کے سفر میں ہے۔ کسی دوسری مسجد کے لیے سفر کرنے میں کوئی قربت نہیں ہے۔ (انہوں نے کہا: میرے نزدیک یہی حسن اور صحیح ہے) مترجم نے یہ حصہ چھوڑ دیا۔ دونوں اقوال میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اگر مساجد ثلاثہ کے علاوہ دیگر مسجد کے سفر میں اس مسجد و مکان کی تعظیم مقصود ہو تو ابو محمد کا قول صحیح ہے اور اگر تعظیم مقصود نہیں تو پھر شیخ ابو علی کے قول کو ترجیح ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بعض فقہاء کا قول نقل کیا ہے کہ اگر یہ سفر نذر مان کر کرے تو ممنوع ہے اور اگر نیک لوگوں کے نشانات دیکھنے کے لیے محض فضیلت کی بنیاد پر سفر کرے تو ممنوع نہیں۔

مذکورہ تین اقوال کے علاوہ چوتھا قول الداودی کا ہے جس کا ترجمہ مترجم نے چھوڑ دیا ہے یعنی جو شہر فضیلت والی مساجد کے قریب ہو وہاں سے سوار ہو کر یا پیدل چل کر آنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کی حیثیت مسجد قباء جیسی ہوگی۔ کجاوے باندھ کر جن سفروں سے منع کیا گیا ہے ان میں اس کا شمار نہیں ہوگا بلکہ قریب ہونے کا حکم اس پر

غالب ہوگا۔

مترجم نے قاضی عیاض کے قول کے ساتھ ہی یہ جملہ جوڑ دیا: "نبی ﷺ بغیر نذر مسجد قباء کا سفر فرماتے تھے۔"

مذکورہ عبارت کا جوہر

ائمہ رجال کے نزدیک جب یہ جملہ استعمال ہو کہ ائمہ یا فقہائے کرام نے اس میں کلام کیا ہے تو وہ اثر و حدیث یا قول صحت کے اعتبار سے مجروح ہو جاتا ہے۔

قاضی السبکی نے نہ صرف مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے سفر کے بارے میں یہ لکھ دیا کہ اس کے بارے میں فقہائے کرام نے کلام کیا ہے۔ بلکہ شیخ ابوعلی کا یہ قول بھی نقل کر دیا کہ قربت یعنی اجر و ثواب کا حصول صرف مساجد ثلاثہ کے سفر میں ہے اور ان کا یہ کہنا کہ میرے نزدیک حسن اور صحیح یہی ہے۔

جب مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی اور مسجد کے سفر میں کوئی قربت نہیں تو زیارت کے سفر میں قربت کیسے ہوگی؟ قاضی صاحب نے اس سلسلے میں بھی اگرچہ عجیب و غریب تاویلیں کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان سے حق و حقیقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے نذر ماننا

اس سلسلے میں قاضی القضاۃ السبکی نے تین مذاہب نقل کیے ہیں:

1- یہ درست نہیں، یہ ہمارا اور جمہور کا مذہب ہے۔

2- مطلق جائز ہے۔ یہ مذہب ابن لیث ہے۔

3- یہ نذر لازم ہوگی۔ جب رخت سفر باندھنا نہ ہوگا۔ جیسا کہ مسجد قباء کے لیے نذر

مانتا ہے۔

تیسرے مذہب کی وضاحت کے لیے انہوں نے لکھا ہے کہ امام مالکؒ نے نقل کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مسئلہ دریافت کیا ہے۔ اگر کوئی شخص پیدل مسجد قباء جانے کی نذر مانے تو کیا لازم ہو گی یا نہیں۔ انہوں نے فرمایا: لازم ہو جائے گی اور اس کو حکم دیا جائے گا کہ وہ پیدل جائے۔

عبدالملکؒ نے اپنی کتاب الواضحۃ میں لکھا ہے۔ یہی حکم اس شخص کا ہے جس نے اس مسجد میں جانے کی نذر مانی جس میں وہ پانچ وقتی نماز یا جمعہ پڑھتا ہے اور جو مساجد دور ہوں، ان میں جانے کی نذر لازم نہیں ہوگی۔ نہ پیدل جانے اور نہ سوار ہو کر جانے کی۔

اسی طرح ابن وہبؒ نے امام مالکؒ سے روایت کیا ہے۔ مگر مساجد ثلاثہ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر مسجد حرام کے بارے میں نذر مانی جائے، خواہ پیدل جانے کی یا سوار ہو کر جانے کی تو وہ نذر لازم ہو جائے گی اور بقیہ دونوں مسجدوں کے بارے میں نذر لازم نہ ہوگی اور نذر ماننے والے پر لازم ہوگا کہ دونوں مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لیے سوار ہو کر جائے۔

یہ مسائل تو بعینہٖ کسی مکان کے قصد کے بارے میں یا ایسی عبادت کے قصد کے بارے میں ہیں جو دوسری جگہ بھی ادا ہو سکتی ہے، لیکن بغیر نذر کے کسی غرض کی وجہ سے سفر کرنے کے بارے میں نہ تحریم کا قول ہے نہ کراہت کا۔ (یہاں خیال رہے کہ اس سے مراد مباح سفر ہیں)

مذکورہ عبارت کا نچوڑ

قاضی تقی الدین السبکی نے خود جمہور کا مذہب نقل کر دیا کہ مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی

دوسری مسجد کے لیے نذر لازم نہیں ہوتی۔

اپنی کتاب شفاء السقام کے پانچویں باب (اُردو ص 131-130، عربی ص 97) میں انہوں نے امام مالکؒ کا فتویٰ نقل کیا ہے جس کے مطابق مسجد نبوی کے لیے نذر ہو تو اس کو پورا کیا جائے اور مسجد میں نماز پڑھی جائے اور اگر نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے نذر ہو تو اس پر عمل نہ کیا جائے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے: لَا یُعْمَلُ الْمَطِیُّ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ. سواری کو استعمال نہ کیا جائے مگر تین مساجد کی طرف۔

اس مسئلے پر پہلے ہی بحث ہو چکی ہے چونکہ قاضی صاحب کی کتاب کا اصل موضوع رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر عین عبادت اور کارِ ثواب اور قربت ہے اور اس سفر کے لیے نذر کا پورا کرنا بھی لازم ہے اس لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ کا حوالہ دے دیا گیا۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی بات اپنی طرف سے نہ کہی تھی بلکہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث پاک سے جو ائمہ حدیث نے سمجھا تھا وہی انہوں نے بیان کیا تھا۔ جس پر قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی جیسے بزرگوں نے اس کو غلط رنگ دے کر جیل خانے بھجوا دیا تھا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف کی نشاندہی کرنا

قاضی صاحب نے خود ہی لکھا ہے کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم کے "باب سفر المرأة مع محرم الی الحج" (عورت کا محرم کے ساتھ حج کے لیے سفر کرنا) میں فرمایا ہے کہ مساجد ثلاثہ کے علاوہ رخت سفر باندھنے اور سفر کرنے کے بارے میں علماء کرام کا اختلاف ہے۔ مثلاً نیک لوگوں کی قبروں پر جانے اور فضیلت والی جگہوں کے بارے میں ہمارے اصحاب میں سے شیخ ابو محمد نے فرمایا: یہ سفر حرام ہے اور قاضی

عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے مختار ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے۔(حاشیہ صحیح مسلم ج1 ص433) امام نووی رحمۃ اللہ علیہ خود بھی شافعی تھے لیکن انہوں نے قبروں اور فضیلت والی جگہوں کی طرف سفر کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا تھا اس کی نشاندہی کردی۔ پھر انہوں نے کہا: ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب وہ ہے جو امام الحرمین اور محققین نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایسا سفر نہ حرام ہے اور نہ مکروہ۔ بلکہ حدیث میں نفی سے مراد یہ ہے کہ پوری فضیلت تین مساجد کے سفر میں ہے۔ واللہ اعلم

امام یحییٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک کے بارے میں پوری فضیلت کی جو بات کی اس سے ماننا پڑے گا کہ تین پوری فضیلت والی مساجد کے علاوہ دوسری مساجد کی طرف سفر کرنے میں بھی فضیلت ہے جبکہ ائمہ شافعیہ کے نزدیک ان میں سے کوئی قربت نہیں لیکن جو اصل بات ہے وہ اختلاف کی ہے جس کی نشاندہی پر قاضی السبکی نے امام نووی کے بارے میں لکھا ہے:

عربی کتاب کی عبارت ہے۔ مترجم نے اس کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔

قُلْتُ رَحِمَ اللّٰهُ النَّوَوِی لَوِ اقْتَصَرَ عَلَى الْمَنْقُوْلِ اَوْ نَقَدَهٗ حَقَّ نَقْدِهٖ لَمْ يُحْصَلْ خَلَلٌ وَاِنَّمَا زَادَ التَّمْثِيْلَ فَحُصِلَ الْخَلَلُ مِنْ زِيَادَتِهٖ (ص123)

میں کہتا ہوں اللہ النووی پر رحم کرے۔ اگر منقول پر اکتفا کرتے یا پرکھنے کا حق ادا کرتے تو اختلاف ثابت نہ ہوتا۔ انہوں نے تمثیل زیادہ کردی جس کی زیادتی سے اختلاف ثابت ہوگیا۔

قاضی السبکی صاحب کی عادت تھی کہ اپنی ہر دلیل پر امت اور علماء کا اجماع نقل کردیا کرتے تھے۔ یہاں ان کے ہم مذہب نے جب اختلاف کا اعتراف کرلیا تو قاضی صاحب کو پسند نہ آیا۔

امام الحرمین کے بارے میں وضاحت

امام الحرمین کا پورا نام ابوالمعالی عبدالملک الجوینی تھا اور مشہور شافعی فقیہ الشیخ ابومحمد عبداللہ بن یوسف الجوینی کے بیٹے تھے۔ 18 محرم 419ھ میں پیدا ہوئے اور 25 ربیع الآخر 478ھ میں وفات پائی۔ علم الکلام کے اس مکتبۂ فکر سے تعلق تھا جس کی بنیاد ابوالحسن الاشعری (المتوفی 324 یا 330ھ) نے رکھی تھی۔ 450ھ میں حجاز آئے اور چار سال مکہ اور مدینہ میں درس دیتے رہے جس کی وجہ سے ان کو امام الحرمین کا لقب مل گیا۔ حالانکہ حرمین شریفین میں نہ وہ امام تھے اور نہ ہی خطیب۔ ان کی تحقیقات و تصانیف زیادہ تر اصول فقہ اور علم الکلام کے متعلق تھیں۔

جب ان کے لیے نیشاپور میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا گیا تو انہوں نے اپنی زندگی کا بقیہ حصہ اسی میں درس دیتے ہوئے گزار دیا۔ امام ابوحامد الغزالی بھی اس مدرسہ میں کچھ عرصہ پڑھاتے رہے اور علم الکلام میں ابوالمعالی عبدالملک الجوینی سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ وفیات الاعیان (ج3 ص167 رقم 378)، شذرات الذهب (ج2 ص385)، العبر (ج2 ص339)، البداية والنهاية (ج12 ص128)۔

امام الحرمین کے والد ابومحمد الجوینی نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ نیشاپور میں گزارا اور 438ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ امام النووی رحمہ اللہ نے جس الشیخ ابومحمد الجوینی کا ذکر صحیح مسلم کی شرح میں کیا ہے وہ امام الحرمین کے والد ہی تھے۔ نیک لوگوں کی قبروں اور فضیلت والی جگہوں کی طرف سفر کرنے کو انہوں نے ہی حرام کہا تھا۔ وفیات الاعیان (ج3 ص47 رقم 332)، البداية والنهايه (ج12 ص55)، العبر (ج2 ص374)۔

دلچسپ عبارت

قاضی السبکی صاحب کا فرمان ہے۔امام رافعیؒ (المتوفی 623ھ) اورامام نوویؒ نے شرح مسلم کے علاوہ دوسری جگہ جونقل کیا ہے اس میں نیک لوگوں کی قبروں کا ذکرنہیں۔ اس میں ان کا وہی مطلب ہے جوہم ذکر کر چکے ہیں۔امام صاحب نے فرمایا کہ اگرکوئی شخص مسجد حرام کے علاوہ کسی اور مسجد میں جانے کی نذر مانے تو علمائے کرام نے کہا ہے۔ وہ نذر لازم نہ ہوگی۔ اس لیے کہ مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی مسجد کا قصد کوئی قربت نہیں جب قربت وعبادت مقصود نہ ہوتو اس کی نذر لازم نہیں ہوتی۔ میرے شیخ ان مساجد کے علاوہ کی طرف رخت سفر باندھنے کومنع کرتے تھے۔اسی طرح رافعی نے کہا ہے کہ جب کسی نے ان تین مساجد کے علاوہ کسی مسجد کی طرف جانے کی نذر مانی تواس کی نذر منعقد نہیں ہوگی۔اسی طرح کی بات امام نووی نے شرح مہذب میں کہی ہے۔

جائزہ

قاضی السبکی نے اپنی پسند کے دواماموں کی صداقت کومشکوک کردیا کہ ایک جگہ وہ نیک لوگوں کی قبروں اور فضیلت والی جگہوں کی طرف سفر کرنے کوحرام کہتے ہیں اور دوسری جگہ اس سفر کی اجازت دیتے ہیں۔اصل میں قاضی السبکی جیسے بزرگوں کی مجبوری یہ ہے کہ قاہرہ میں امام الشافعی رحمہ اللہ کی قبرکوزبردست طریقے پر مزین کیا گیا ہے۔اوراس پر بہت ہی خوبصورت لکڑی کا گنبد بنا ہوا ہے جس میں رنگین شیشے لگے ہوئے ہیں۔ظاہر ہے اگرانبیاء علیہم السلام اورصلحاء کرام کی قبروں کی زیارت کے سفرکوحرام مان لیا جائے تو امام الشافعی رحمہ اللہ کے مزین ومرقع قبرکی زیارت کوکون آئے گا۔قاہرہ میں کئی اوربھی ایسے

مزار و مشاہد ہیں جہاں کھلے عام شرک ہوتا ہے جن میں سے مشہد حسینی بھی ہے۔ غیر ثابت شدہ روایات کے مطابق حضرت حسینؓ کا سر وہاں مدفون ہے۔ البداية والنهاية (ج8 ص214) میں تفصیل مذکور ہے۔ الدرر الكامنة (ج3 ص42) کے مطابق قاضی صاحب کے بیٹے بہاء الدین نے کوشش کی تھی کہ باپ کو امام شافعی کے پہلو میں دفنایا جائے جس میں وہ کامیاب نہ ہوئے۔

قاضی صاحب کی یہ عبارت خاص طور پر قابل توجہ ہے: ''میرے شیخ ان مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی اور کی طرف رخت سفر باندھنے سے منع کیا کرتے تھے۔''

قاضی صاحب نے امام الحرمین کے والد ابو محمد کے بارے میں یہ بھی لکھ دیا کہ صحیح اغراض کے لیے مساجد و دیگر مقامات کی زیارت کے لیے جانا، علم حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا، جہاد کے لیے سفر کرنا، اس بارے میں ابو محمدؒ نے کچھ نہیں کہا اور ان کی طرف ممانعت کو منسوب کرنا درست نہیں۔ اگر کسی نے ایسا کلام کیا بھی ہے تو وہ غلط ہے۔ وہ شخص حدیث کے مقصود کو نہیں سمجھا لیکن الحمدللہ یہ واضح ہے کہ انہوں نے ایسا کلام نہیں کیا۔

اس عبارت کو کتنا مغالطہ آمیز بنا دیا گیا ہے حالانکہ بات علمی، جہادی اور عام سفر کی نہیں تھی۔ بلکہ حصول ثواب کے لیے قبروں اور جگہوں کی زیارت کی تھی، جس کو ابو محمد الجوینی نے حرام قرار دے دیا اور قاضی عیاض نے تائیداً اشارہ کر دیا۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی (المتوفی 620ھ) کا حوالہ

قاضی القضاۃ السبکی صاحب نے ابن قدامہ کی کتاب المغنی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اگر کوئی قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرے یا دیگر متبرک جگہوں کا سفر کرے تو اس کو سفر کی رخصتیں حاصل نہیں ہوں گی۔ اس لیے کہ یہ سفر ممنوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا

ارشاد مبارک ہے: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدَ۔
(المغنی میں مذکورہ قول ابن عقیل کا ہے۔ مترجم نے اس کا جواب ایسے ظاہر کیا ہے جیسا کہ یہ قاضی صاحب کا ہے حالانکہ المغنی ہی کی عبارت ہے۔)

صحیح یہ ہے کہ یہ سفر مباح ہے اور اس میں سفر کی رخصتیں حاصل رہیں گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ پیدل اور سوار ہو کر مسجد قباء جایا کرتے تھے اور قبور کی بھی زیارت کیا کرتے اور فرمایا کرتے تھے۔ ان قبروں کی زیارت کیا کرو، یہ تمہیں آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

جہاں تک آپ کے ارشاد مبارک کا تعلق ہے۔ مساجد ثلاثہ کے علاوہ کجاوے نہ باندھے جائیں تو اس کا معنی ہوگا: دیگر مساجد کے سفر میں فضیلت نہیں اور ان کی طرف سفر حرام ہے اور سفر کے مباح ہونے کے لیے فضیلت شرط نہیں اور نماز کو قصر کرنے کے لیے فضیلت والا سفر شرط نہیں۔ فضیلت کا نہ ہونا سفر کو حرام نہیں کرتا۔

جائزہ

خیال رہے کہ المغنی میں دینی مسائل بیان ہوئے ہیں اور علامہ ابن قدامہ نے اپنے علم کے مطابق ان کو حل کیا تھا جبکہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں مسجد قباء کی طرف رسول اللہ ﷺ کے آنے اور مدینہ طیبہ میں قبروں کی زیارت کرنے سے دلیل لیتے ہوئے حرام سفروں کو مباح قرار دے دیا۔ یہ استدلال کسی بھی صورت میں درست نہیں۔ ابن عقیل نے جو کہا وہی درست ہے۔ کیونکہ مدینہ کے اندر اور اس کے قرب کی طرف جانے کو سفر تصور نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی کوئی اس کے درمیان میں نمازیں قصر کیا کرتا تھا۔ لہٰذا مسجد قباء کی طرف جانا اور شہداء کی قبروں کی زیارت کرنا، اس کا قصر نماز سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ابن قدامہ کا استدلال تب صحیح ہوتا جب وہ کوئی ایسا حوالہ دیتے جس میں قباء جاتے ہوئے یا

شہداء کی قبروں کی زیارت کے لیے جاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے کوئی نماز قصر کی تھی۔
سفر کے بارے میں غیر صحیح استدلال کے باوجود قبروں کی حقیقت کے بارے میں ابن قدامہ نے بہت صحیح بات یہ کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قبروں کی زیارت کیا کرو یہ تمہیں آخرت یاد دلاتی ہیں جبکہ قاضی صاحب کا زور تبرک اور شفاعت کے حصول پر رہا ہے۔

قاضی القضاۃ السبکی کی لاعلمی یا غلط بیانی

قاضی صاحب کا بیان ہے میں نے ابن قدامہ کے اقوال کا مطالعہ کیا لیکن مجھے ابن عقیل کا قول نہیں ملا۔ ممکن ہے ان کا یہ قول مزارات کے دیکھنے کے بارے میں ہو اور ہماری بحث محض میت کی زیارت کے قصد کے سفر سے متعلق ہے۔
عجیب بات یہ ہے کہ قاضی صاحب نے ابن قدامہ کے حوالے سے جو عبارت نقل کی ہے اس کے آغاز ہی میں ابن عقیل کا قول المغنی لابن قدامة (ج2: باب صلاة المسافر ص 264) (المطبوعه المطبعة اليوسفية مصر) میں یوں منقول ہے:

فان سافر لزيارة القبور و المشاهد قال ابن عقيل: لا يباح له الترخص لانه منهى عن السفر اليها: قال نبى صلى الله عليه وسلم **لا تشد الرحال الا الى ثلاثة مساجد**

اگر اس نے قبروں اور مشاہد کی زیارت کے لیے سفر کیا تو ابن عقیل نے کہا۔ وہ مباح نہیں کیونکہ وہ ایسا سفر ہے کہ جس سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین مساجد کے سفر کے علاوہ کجاوے نہ باندھے جائیں۔
یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ اَلْمُغْنِی میں ابن عقیل کا قول موجود ہے جس سے قبروں اور مشاہد کی طرف سفر کرنے کی ممانعت واضح الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اپنے وقت کے قاضی القضاۃ ہوتے ہوئے انہوں نے وہ کہہ اور لکھ دیا جو ان کے لیے ہرگز مناسب نہ تھا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ پھر ابن عقیل کے قول کی تاویل کرتے ہوئے بات کو عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچا دیا کہ ان کی باری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع تشریف لے گئے اور کافی دیر وہاں قیام فرمایا اور تین بار ہاتھ اٹھا کر دعائیں کیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کے دریافت کرنے پر فرمایا: میرے پاس جبرئیل آئے اور کہا: اللہ کا حکم ہے کہ آپ بقیع جا کر اہل بقیع کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ نے اہل قبور کے لیے یہ دعا سکھائی:

اَلسَّلَامُ عَلٰی اَھْلِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُومِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ یَرْحَمُ اللّٰہُ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ (رواہ مسلم)

اے اس آبادی کے ساکنو، مومنو، اور مسلمانو! تم پر سلامتی ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم میں سے پہلے جانے والوں پر اور بعد میں جانے والوں پر رحم فرمائے اور ہم بھی ان شاء اللہ تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں۔ (امام مسلم نے اس کو روایت کیا)

پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر شہر و بستی والوں کا اپنے قبرستان جا کر اہل قبور کے لیے دعا کرنے میں کوئی اختلاف نہیں، بلکہ یہ مستحب ہے۔ بات تو دور سے قبروں اور مشاہد کے لیے سفر کی ہے۔ ابن عقیل نے بھی وہی کچھ کہا جو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور ائمہ حدیث نے کتابوں کا اس کو حصہ بنایا جو قاضی صاحب کی سمجھ میں نہ آیا۔

قاضی صاحب کا غصہ وتعصب

حضرت قاضی صاحب کا فرمان ہے: کچھ لوگوں نے بعض علمائے بغداد کی طرف سے کچھ فتاویٰ مجھے لا کر دیئے۔ مجھے معلوم نہیں، وہ من گھڑت فتاویٰ ہیں یا واقعی ایسے

لوگوں کے ہیں جو نام نہاد علماء ہیں اور حقیقۃً جاہل ہیں۔

مترجم نے جس عربی عبارت کا ترجمہ من گھڑت کیا ہے وہ یوں ہے:

هِيَ مُخْتَلَقَةٌ مِنْ بَعْضِ الشَّيَاطِيْنِ الَّذِيْنَ لَا يُحْسِنُوْنَ (ص126)

یہ ان بعض شیطانوں کے تخلیق کردہ ہیں جو اچھے کام نہیں کرتے۔

اسی ایک عبارت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس ظرف کے مالک تھے جن فتاویٰ کو انہوں نے شیطانوں کے تخلیق کردہ کہا۔ دراصل وہ مصر کے سلطان کی طرف لکھے گئے علمائے بغداد کے خطوط تھے جن میں انہوں نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بیان کردہ موقف کی تائید کی تھی اور امام ابن تیمیہ کے معاملے میں نرمی کرنے کی درخواست کی تھی۔ الکواکب الدریۃ کے مصنف الشیخ مرعی بن یوسف کا بیان ہے۔ ظاہرا ایسے ہوتا ہے کہ وہ خطوط سلطان ناصر تک پہنچ نہ سکے کیونکہ ان کو پہنچانے والا کوئی نہ تھا یا الشیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی پہلے ہی موت واقع ہوگئی لیکن وہ تمام خطوط دمشق پہنچ گئے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی وفات 728ھ میں ہوئی جبکہ قاضی القضاۃ السبکی کی تقرری دمشق میں 739ھ میں ہوئی اور انہوں نے امام ابن تیمیہ کو قید کروانے والے شافعی قاضی کی تائید میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ان کے خلاف کتاب لکھنے کی جرأت کی۔

جب قاضی الاخنائی نے ان کے اختیار کردہ موقف کا رد کیا تو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جیل ہی میں ایسا جواب لکھا کہ جس کی وجہ سے ان کو ان کی کتابوں اور قلم و دوات سے محروم کردیا گیا لیکن انہوں نے ردی کاغذوں پر کوئلوں سے خطوط لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

پہلا فتویٰ

اس کے بارے میں قاضی صاحب نے فرمایا کہ وہ ایک مالکی کا ہے جس میں تحریر ہے: الشیخ ابو محمد الجوینی نے اپنی کتابوں میں تصریح کی ہے کہ زیارت قبور کے لیے سفر کرنا حرام ہے اور اسی کو قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اکمال میں اختیار کیا ہے حالانکہ ایسا کہنے والا اس نقل میں بالکل جھوٹا ہے کیونکہ نہ شیخ ابو محمد نے یہ کہا اور نہ قاضی عیاض نے۔

صریح غلط بیانی

سورۃ التوبۃ میں سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (١١٩)﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈر جاؤ اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

صحیح بخاری (کتاب الادب: باب قول اللّٰہ: اِتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوا مَعَ الصَّادِقِيْنَ وما يُنْهٰى عَنِ الْكَذِب) صحیح مسلم (کتاب البر: باب قُبحِ الْكَذِبِ وَحُسْنِ الصِّدْقِ) میں عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود سے مروی ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے آدمی سچ ہی بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ صدیق ہو جاتا ہے۔

بے شک جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ جہنم کی آگ کی طرف لے جاتا ہے۔ آدمی جھوٹ ہی بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے پاس کذاب لکھ لیا جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں یہ بھی مروی ہے۔ آپ نے فرمایا: عَلَيْكُمْ الصِّدْق۔ اپنے اوپر سچائی کو لازم رکھیں۔ صحیح بخاری کے اسی باب میں سمرۃ بن جندب سے مروی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: رات میں نے خواب میں دیکھا۔ دو میرے پاس آئے۔ دونوں نے کہا: جس کو آپ نے دیکھا کہ اس کے گال چیرے جا رہے تھے وہ کذاب یعنی بہت ہی جھوٹا تھا۔ وہ کوئی جھوٹی بات کہتا تو وہ آگے پہنچائی جاتی یہاں تک کہ وہ آفاق میں پھیل جاتی۔ قیامت کے دن تک اس کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہے گا۔ اصل میں معراج روحانی میں آپ کو جو کچھ دکھایا گیا اس میں سے ایک یہ بھی نشانی یعنی آپ کے جھوٹے امتی کی دکھائی گئی۔ یہ خواب تھا اور قرآن حکیم میں جس معراج کا ذکر ہے وہ جسمانی تھا۔

محترم قاضی القضاۃ السبکی نے جس بغدادی مالکی عالم کو جھوٹا فرما دیا وہ مدرسہ الشریفہ المستنصریہ سے تعلق رکھنے والے جماعت مالکیہ کے خادم محمد بن عبدالرحمٰن البغدادی تھے۔ انہوں نے نہ صرف الشیخ ابومحمد الجوینی اور قاضی عیاض کے حوالے دیئے بلکہ انہوں نے المدونۃ القاضی ابواسحاق اسماعیل بن اسحاق (التوفی 282ھ) القیروانی، الشیخ ابن سیرین، امام مالک، محمد بن المواز، الشیخ ابوعمرو بن عبدالبر اور امام ابوعبداللہ محمد بن علی المازری جیسے بزرگوں کی بحث کو اختصاراً نقل کرکے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی حمایت کی۔ (العقود الدریۃ ص214، الکواکب الدریۃ ص379)

رہی بات الشیخ ابومحمد الجوینی اور قاضی عیاض کی تو قاضی السبکی صاحب نے خود ہی صحیح مسلم کی شرح کے حوالے سے امام نووی رحمہ اللہ کا قول شفاء السقام (عربی ص122 اور اردو 159) میں یوں نقل کیا ہے۔ جس پر انہوں نے ناراضگی کا اظہار بھی کیا ہے۔ مساجد ثلاثہ کے علاوہ رخت سفر باندھنے اور سفر کرنے کے بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ مثلاً نیک لوگوں کی قبروں پر جانے اور فضیلت والی جگہوں کے بارے میں ہمارے اصحاب (یعنی شوافع) میں سے شیخ ابومحمد نے فرمایا۔ یہ سفر حرام ہے اور قاضی عیاض نے اس کے مختار ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

کون جھوٹا ہے اور کون سچا ہے۔ پڑھنے والے حضرات خود فیصلہ کرلیں۔

دوسرا فتویٰ

یہ فتویٰ قاضی صاحب کے مطابق ایک شافعی کا ہے اس نے کہا ہے۔ علماء کے کلام سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ زیارت کوئی عبادت اور اطاعت نہیں۔

اگر سمجھ سے مراد اس کی اپنی سمجھ ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اس کی سمجھ نہیں بلکہ کج فہمی ہے۔ ہمارے نزدیک تو علمائے کرام اس کے برخلاف سمجھتے ہیں۔ اس مفتی نے پھر یہ کہا: جو شخص ان تین مساجد کے علاوہ سفر کرنے کے جواز کا اعتقاد رکھے یا وجوب کا یا مستحب کا تو وہ صریح نہی کی مخالفت کرتا ہے اور نہی کی مخالفت گناہ ہے یا کفر ہے۔ مُنْھٰی عنہ کے اعتبار سے اور اس کے وجوب اور اس کی تحریم کے اعتبار سے اس کلام کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ اس نے مُنْھٰی عنہ کو واجب اور حرام کی طرف منقسم کیا ہے۔

قاضی صاحب کی ڈھٹائی

قاضی صاحب نے جس شافعی عالم کا مذاق اڑایا۔ اس کا نام ابن الکتبی الشافعی تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی شان اور عالی مقام میں کمی کرنے یا بدگوئی کرنے سے اللہ کے ساتھ پناہ مانگتے ہوئے اس عالم نے اپنے خلوص کا مظاہرہ یوں کیا کہ علماء کے لیے کیسے جائز ہے کہ عصبیت ان کو رسول اللہ ﷺ کے حق میں بدگوئی یا مقام میں کمی کرنے والی بات کرنے پر ابھارے۔ کیا کوئی تصور کرنے والا یہ تصور کرسکتا ہے کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرنے سے آپ کی عظمت و عزت میں کوئی اضافہ ہوجاتا ہے یا نہ کرنے سے آپ کی تعظیم میں کوئی کمی واقع ہوجاتی ہے۔ یقینی طور پر ایسی کوئی بات نہیں۔

علمائے کرام کے کلام اور عقلاء کی عقلی باتوں کا مفہوم یہ ہے کہ مجرداً زیارت نہ تو عبادت ہے اور نہ ہی اطاعت۔ اگر کوئی وہاں جا کر عبادت و اطاعت کرنے کی قسم کھائے تو وہ اس کو پورا نہ کرے۔

ہمارے اصحاب متاخرین میں سے قاضی ابن کج کا کہنا ہے کہ وہ قربت ہے اور اس کا پورا کرنا لازم ہوگا جبکہ اس سلسلہ میں وہ منفرد ہیں اور ان کو نقل صریح اور صحیح قیاس کی تائید بھی حاصل نہیں۔

اس سلسلہ میں صحیح بات رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔ مساجد ثلاثہ کے علاوہ ثواب کے حصول کے لیے کجاوے نہ باندھے جائیں۔ لہٰذا مساجد ثلاثہ کے علاوہ عبادت و اطاعت کے لیے جب سفر کیا جائے گا تو وہ صریح ممانعت کی مخالفت ہوگی اور وہ مخالفت معصیت یا کفر ہوگا جہاں تک کجاوے باندھے بغیر زیارت کا تعلق ہے تو اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ (العقود الدریة ص 213 الکواکب الدریة ص 378-379) یہ وہ فتویٰ ہے جس کا مذاق قاضی صاحب نے اڑایا۔

تیسرا اور چوتھا فتویٰ

تیسرے فتویٰ کے بارے میں قاضی صاحب نے فرمایا۔ وہ پہلے کی ہو بہو نقل ہے اور چوتھا بھی اسی طرح کی خرافات کا مجموعہ ہے۔ اس کے ذکر کا کوئی فائدہ نہیں۔

قاضی صاحب کا انتہائی توہین آمیز اور گستاخانہ رویہ

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حمد وثنا اور سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام اور آپ کی آل واولاد پر رحمتوں کے نزول کی دعا کے ساتھ وہ خطوط کہ جن میں خوبصورت انداز و

الفاظ کے ذریعے مصر کے سلطان ناصر سے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں درخواست کی گئی کہ ان پر ہونے والے ظلم سے ان کو بچایا جائے کیونکہ انہوں نے ان سے کیئے گئے سوال کے جواب میں وہی کچھ لکھا جو ان سے پہلے علماء وفضلاء نے بیان کیا۔ درخواست کرنے والوں نے قرآن وحدیث کے حوالے دیئے۔ ان خطوط کو قاضی السبکی صاحب نے فتاویٰ کا نام دے کر خرافات کا مجموعہ قرار دے دیا۔

عبدالمومن بن عبدالخالق الخطیب نے اپنے خط کا آغاز یوں کیا: الحمدللّٰہ رب العالمین وصلواته علی سیدنا محمد وعلی ال الطاهرین اور اختتام بھی الحمدللّٰہ رب العالمین سے کیا۔ (العقود الدریة ص 215)

چوتھا خط لکھنے والے الشیخ الامام العلامة جمال الدین یوسف بن عبدالمحمود بن عبدالسلام بن البتی الحنبلی تھے۔ جنہوں نے اپنے خط کی یوں ابتدا کی: بعد حمد اللّٰہ الذی هو فاتح کل کلام والصلاة والسلام علی رسوله محمد خیر الانام وعلی اله واصحابه البررة الکرام۔ اعلام الهدی ومصابیح الظلام۔

الشیخ یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ابتدائی دعا میں اندھیروں کے چراغ، ہدایت کے نشان اور نیک وبزرگ صحابہ کو بھی شامل کرلیا اور انہوں نے قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کو قربت وطاعت اور فضیلت کہنے والوں اور اس سفر کو ممنوع سمجھنے والوں کے دلائل کا اختصاراً جائزہ لیتے ہوئے کہا: اصولیّین کے نزدیک کسی چیز کی ممانعت اس کے حرام یا مکروہ ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ لہٰذا ممنوع سفر میں نماز قصر کرنے کا جواز نہیں۔ جنہوں نے ایسے سفر کو حرام کہا ہے ان میں الشافعیہ کے الشیخ الامام ابومحمد الجوینی اور حنابلہ کے الشیخ ابوالوفاء بن عقیل تھے۔ (یہ وہی ہیں جن کا فتویٰ المغنی میں قاضی صاحب کو نہیں ملا تھا) اور المالکیہ کے قاضی عیاض نے اس کے مختار ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

الشیخ یوسف نے بڑی عمدہ بات یہ کی کہ اس میں کون سی برائی ہے کہ کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے اور وہ فقہاء کے خلاف رائے دے اور وہ بعض علمائے کرام کی طرف مائل ہو جائے۔ مدتوں سے یہ معاملہ اسی طرح چلتا رہا ہے۔

الشیخ کا کہنا تھا: جہاں تک قبروں کی زیارت کے مستحب ہونے کے بارے میں احادیث ہیں ان میں دور دراز سے سفر کرنے کے لیے سواریوں کو استعمال کرنے والی بات نہیں۔ یعنی اپنے ہی شہر کے قبرستان میں جا کر زیارتِ قبور مستحب ہے۔

الشیخ یوسف نے قرآن حکیم کی چار ایات کا بھی حوالہ دیا:

- ﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (المائدہ:۲)

نیکی اور تقویٰ کے کام میں تعاون کیا کرو اور گناہ و زیادتی والے کام میں تعاون نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈر جاؤ۔ بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

- ﴿وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (المائدہ:۸)

اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو بلکہ عدل کرتے رہو۔ وہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ اس سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

- ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا(۷۰) يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا(۷۱)﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈر جاؤ اور بات کرو سیدھی سیدھی۔ ایسا کرو گے تو وہ

تمہارے اعمال کی اصلاح کردے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی، اس نے بہت عظیم کامیابی حاصل کرلی۔

﴿وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ (الحج:۴۰)

اور اللہ تعالیٰ اس کی ضرور مدد کرے گا جو اس کی یعنی اس کے دین کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ بہت زیادہ قوت و غلبے والا ہے۔

امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس دعا کے ساتھ اپنے خط کو ختم کیا۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو اور ہمیں ہدایت والی راہ پر چلائے اور آپ کو اور ہمیں گمراہیوں کی راہ سے بچائے۔ وہی ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ وہی ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین وکیل اور بہترین مددگار ہے۔

والحمدللہ رب العالمین وصلوات اللہ وسلامہ علی سید المرسلین محمد النبی وآلہ الطاهرين واصحابه الكرام المنتخبين۔

(العقود الدرية ص215-216-217)

لفظ خرافات کا معنی

فیروز اللغات اور اظہر اللغات کے مطابق لفظ ''خرافات'' کا معنی: گالی گلوچ، فضول اور بے ہودہ گفتگو اور ہنسی کی باتیں ہوتا ہے۔ دیکھنے اور سمجھنے والی بات یہ ہے کہ مصر کے سلطان کو لکھے گئے خطوط میں کون سی بات یا جملہ مذکورہ معنی میں آتا ہے۔ کیا کوئی اپنے ملک کے حکمران کو خرافات پر مشتمل خط لکھنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ خاص طور پر ایسے خطوط کہ جن میں امام ابن تیمیہ کے بارے میں شفقت و رحمت کی درخواست کی جارہی ہو اور ان میں قرآن و حدیث کے حوالے بھی ہوں۔

امام ابن تیمیہ نے اپنی پوری زندگی قرآن وسنت کی عظمت کو اجاگر کرنے میں گزار دی۔ اسلام کی سربلندی کے لیے جب تلوار اٹھانے کا وقت آیا تو دشمن کے مقابلے میں میدان میں آگئے۔ کوئی سرکاری عہدہ یا سرکاری وظیفہ قبول نہ کیا۔ ان کی مخالفت میں قاضی القضاۃ السبکی صاحب نے عظیم مجاہد اسلام کی حمایت میں لکھے گئے خطوط کو مجموعۂ خرافات قرار دے دیا۔

اسی فیصلہ کن تحریر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی صحیح اتباع کرنے والا کون تھا۔ اور اپنی نفسی خواہشات کی پیروی کرنے اور امت محمدیہ کو یہود و نصاریٰ اور مشرکوں جیسے عقائد اپنانے کی تعلیم دینے والا کون تھا۔

پانچواں اور چھٹا فتویٰ

قاضی السبکی صاحب نے صرف چار فتاویٰ کا ذکر کیا جبکہ امام ابن تیمیہ کی حمایت میں مصر کے سلطان کو خط لکھنے والے ابوعمرو بن ابی الولید المالکی اور عبداللہ بن ابی الولید المالکی بھی تھے۔

ان دونوں میں سے ایک نے لکھا۔ مساجد ثلاثہ کے علاوہ اجر وثواب کے لیے سفر مشروع نہیں۔ یعنی شرع میں اس کی اجازت نہیں۔ اگر مسجد نبوی کے لیے سفر کیا جائے اور مسجد میں نماز پڑھی جائے اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کو سلام کہا جائے تو یہ سفر مشروع ہوگا۔ جیسے کہ علمائے کرام کا اس پر اتفاق ہے۔

جب محض زیارت کے لیے سفر کیا جائے اور مسجد میں نماز پڑھنے کا قصد نہ ہو، تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ ممنوع ہے یا مباح ہے۔ پھر خط لکھنے والے نے امام مالک کے حوالے سے نقل کیا کہ ان سے کسی سائل نے سوال کیا۔ اگر وہ نبی ﷺ کی قبر مبارک

کی زیارت کی نذر مانے تو اس کو پورا کرے یا نہ کرے۔

امام مالک نے فرمایا: اگر اس نے مسجد نبوی کی نذر مانی ہے تو اس کو پورا کرے اور اس میں نماز پڑھے۔ اگر اس نے قبر مبارک کا ہی ارادہ کیا ہے تو نذر پوری نہ کرے۔ کیونکہ حدیث مبارک ہے: تین مساجد کے علاوہ سواری استعمال نہ کی جائے۔

دوسرے طویل خط میں مسلمان حکمرانوں کے فرائض سے آگاہ کرنے کے لیے پہلے سورۃ الحج کی اس آیت کا حوالہ دیا:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۴۱)﴾

وہ لوگ جن کو ہم اگر زمین میں حکومت سے نوازیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔ (یعنی نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے) اور اچھائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔

پھر سورۃ النور کی آیت نقل کر دی:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا (۵۵)﴾

تم میں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ان کو زمین میں ضرور اسی طرح خلافت سے نوازے گا کہ جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو نوازا اور ان کے لیے اس دین کو مضبوط کرے گا جس پر وہ ان سے راضی ہو گیا اور ان کے خوف زدہ ہونے کے بعد ان کے خوف کو ضرور

امن میں بدل دے گا کیونکہ وہ میری عبادت کرتے ہیں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بناتے۔

پہلی آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دینے اور دوسری میں شرک سے بچنے اور اللہ کی بندگی و عبادت کرنے کرانے کی طرف اشارہ تھا۔ پھر صحیح مسلم (کتاب الایمان: باب بیان اَنَّ الدِّیْنَ النَّصِیْحَۃُ، ج1ص54) میں تمیم الداری سے مروی حدیث کا حوالہ بھی دے دیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اَلدِّیْنُ نَصِیْحَۃٌ قُلْنَا لِمَنْ قَالَ لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَتِہِمْ۔ ''دین نصیحت ہے ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کس کے لیے۔ آپ نے فرمایا: اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے ائمہ اور عام مسلمانوں کے لیے۔''

پھر دوسری حدیث جو صحیح بخاری کی پہلی اور صحیح مسلم میں 1907 میں ہے، اس کو بھی نقل کر دیا۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

خط لکھنے والے نے سلطانِ مصر کو قرآن وسنت کے حوالوں سے امام ابن تیمیہ کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور سلطان کو بتایا کہ امام ابن تیمیہ نے وہی کچھ کہا ہے جو ان شہروں کے علماء وفضلاء کہتے رہے ہیں۔ ان سے پوچھے گئے سوال کا جو جواب انہوں نے دیا ہے وہی صحیح ہے۔

ابن ابی الولید مالکی نے اپنی درخواست میں بہت ہی خوبصورت انداز میں یوں مزید کہا:

﴿فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَیْہِ قَالُوْا یٰاَیُّہَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَاَھْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَۃٍ مُّزْجَاۃٍ فَاَوْفِ لَنَا الْکَیْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَیْنَا اِنَّ اللّٰہَ یَجْزِی

الْمُتَصَدِّقِيْنَ. ﴾ (سورۃ یوسف:۸۸)

(حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی تیسری مرتبہ ان کے پاس داخل ہوئے تو اس وقت کی بات ہورہی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے) جب وہ اس کے پاس آئے تو انہوں نے کہا: اے عزیز! ہمیں اور ہمارے اہل کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم وہ تھوڑی سی پونجی لے کر آئے ہیں جو ہمارے پاس تھی۔ پس ہمیں اس کے عوض اناج پورا دے دیں اور ہم پر صدقہ کریں، بے شک اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔

جیسے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے عزیز مصر سے درخواست کی ویسے ہی خط کے راقم سلطان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں: میری پونجی قلم سے لکھے ہوئے یہ اوراق ہیں اور میرا مطلوب ہے کہ آپ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو آزاد کردیں اور جس بات نے یہ درخواست پیش کرنے پر ابھارہ ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ہے: اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ دین نصیحت ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے قید کیے جانے کی خبر جب عراق پہنچی تو وہاں کے علماء نے بھی سلطانِ مصر کو خطوط لکھے جو سب قاضی السبکی صاحب کے نزدیک خرافات کا مجموعہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ایسے تعصب سے ہمیں محفوظ رکھے۔

تعصب کا ایک اور رخ

بات فتاویٰ کی ہورہی تھی لیکن قاضی صاحب نے اس کا رخ زیارت کی طرف موڑ کر امام ابن تیمیہؒ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھا کہ وہ سفر اور نفس زیارت دونوں کے منکر تھے۔ وہ دونوں کو ممنوع قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں جو احادیث ہیں ان کو ضعیف بلکہ موضوع کہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک ''میری قبر کو عید نہ بنالینا'' اور ''یہود

ونصاریٰ پر لعنت ہو، انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا'' سے استدلال کرتے ہوئے کہتے تھے: ان کا عقیدہ توحید کے تحفظ کے لیے ہے اور قبروں پر مساجد بنالینا شرک ہے۔ یہ سب باتیں ان کے کلام میں مذکور ہیں۔

جائزہ

قاضی صاحب کا امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ پر سراسر بہتان ہے کہ وہ نفس زیارت کے منکر تھے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو اچھی طرح علم تھا کہ قبروں کی زیارت کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا لہٰذا وہ اس کے کیسے منکر ہوسکتے تھے بلکہ وہ تو اس کو مستحب کہتے تھے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فتویٰ کے حوالے سے قاضی صاحب نے شرعی زیارت کی صورت میں خود ہی ذکر کیا ہے۔ لیکن محض زیارت کے لیے دور دراز سے سفر کرنے کے وہ اس لیے خلاف تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے سفر سے منع فرمایا تھا۔ انہوں نے وہی کچھ کہا جو ان سے پہلے علماء نے فرمایا۔ جیسا کہ مصر کے سلطان کو لکھے گئے خطوط سے واضح ہوتا ہے۔

جہاں تک زیارت کے بارے میں احادیث کا تعلق ہے تو ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔ یہ قول بھی صرف امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا نہیں بلکہ ان سے بہت پہلے ائمہ رجال و حدیث کا ہے۔ جنہوں نے احادیث کے پرکھ میں اپنی زندگیاں صرف کردیں۔ اگر ان میں سے کوئی حدیث ائمہ کے معیار پر پوری ہوتی تو امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو کیوں رد کرتے۔

امام ابن تیمیہؒ نے اپنی زندگی میں ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو تسلیم کرتے ہوئے عمل کیا۔ انہوں نے دنیاوی زندگی کو سنوارنے کی بجائے اپنی آخرت سنواری۔

امام ابن تیمیہ کے ایک اور فتویٰ کا ذکر

قاضی صاحب نے اپنی تنقید کو جاری رکھتے ہوئے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ایک فتویٰ کا ذکر کیا کہ ان کے نزدیک عرفہ کے دن کسی قبر کے پاس جا کر عرفہ منانا۔ معلوم نہیں کہ مترجم نے یہ کس عربی عبارت کا ترجمہ کیا ہے حالانکہ ص 128 میں عربی عبارت یوں ہے:

واما السفر للتعریف عند بعض القبور۔ (اور بعض قبور کے پاس تعریف کرنے کے لیے سفر کرنا)

تعریف کا صلہ اگر کوئی شئی ہو تو معنی ہوگا، اس کو خوشبودار کرنا

اگر الامر ہو تو معنی ہوگا: واقف کرانا۔

اگر الضَّالَّة ہو تو معنی ہوگا: گمشدہ چیز کو ڈھونڈنا۔

اگر الطعام ہو تو معنی ہوگا: سالن زیادہ بنانا۔

اگر الاسم ہو تو معنی ہوگا: نکرہ کو معرفہ بنانا۔

اگر الحجاج ہو تو معنی ہوگا: حاجیوں کا عرفہ میں ٹھہرنا۔

اگر فُلَانًا ہو تو معنی ہوگا: خطا پر مطلع کرنا اور معاف کرنا۔

مترجم نے عرفہ کے دن کسی قبر کے پاس جا کر عرفہ منانے سے مراد یہی لی ہوگی کہ جس طرح عرفات کے میدان میں اللہ کو پکارا جاتا ہے اسی طرح اہل قبر کو پکارا جائے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کہنا ہے۔ یہ بدعت و شرک اور گناہ ہے۔ کیونکہ قبروں کی طرف سفر کرنا ہی جائز نہیں اور کوئی عالم اس کو مستحب نہیں کہتا، اگر کوئی وہاں جانے کی نذر مانے تو وہ اس پر لازم نہیں ہوتی۔ یہ متفق علیہ بات ہے۔

کوئی صحابی یا تابعی شام کے فتح ہونے سے پہلے یا بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر کی

زیارت کے لیے نہیں گیا نہ ہی دیگر انبیاء علیہم السلام کی قبروں کی زیارت کے لیے کوئی گیا، نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات قبروں کی زیارت کی۔ معراج کے سلسلے میں جو حدیث ہے کہ جبرئیل نے آپ سے کہا: یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے اس کی زیارت کرو، یہ تمہارے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے، اترو اور نماز پڑھو۔ محض جھوٹ ہے سچائی کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے شام میں سکونت اختیار کی، یا وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام گئے، کبھی قبروں کی زیارت کے لیے نہیں گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آثار کو نہ مسجد بنایا اور نہ مزار، نہ غار حراء یا غارِ ثور کی زیارت کی۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کے بارے میں کوئی لفظ ثابت نہیں۔ سورۃ الاحزاب کی آیت کے مطابق یہ حکم ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا(٥٦)﴾

اے ایمان والو! ان پر درود و سلام بھیجو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کے زمانہ میں کوئی مشہد و مزار نہ تھا کہ جس کی زیارت کی جاتی۔ حجاز، شام، یمن، عراق، مصر اور مشرق میں کسی نبی علیہ السلام یا غیر نبی کا مزار نہ تھا کہ جس کی طرف سفر کیا جاتا۔ اسی لیے زیارت دو طرح کی ہے۔ ایک شرعی اور دوسری بدعی۔

شرعی زیارت کا مقصد اگر مومن کی قبر کی ہو تو اس کے لیے دعا و سلام کرنا اور موت کو یاد کرنا ہوتا ہے۔ موت کی یاد دہانی میں مومن اور کافر کا معاملہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ مومن کی زیارت خواہ نبی علیہ السلام یا غیر نبی کی ہو، وہ ایسی ہی ہے جیسے جنازے کی نماز میں دونوں کے لیے دعا کی جاتی ہے۔

بدعی زیارت وہ ہے جو نصاریٰ کی زیارت کی طرح ہوتی ہے جس کا مقصد صاحب

قبر سے ضروریات کا مانگنا، اس کی قبر کو چھونا، چومنا اور سجدہ کرنا ہوتا ہے، جو شرک ہوتا ہے۔ یہ وہ ہے کہ جس کا حکم نہ اللہ نے دیا اور نہ ہی رسول ﷺ نے، اور نہ مسلمانوں کے کسی امام نے اس کو مستحب کہا۔

نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس یا کسی دوسری قبر کے پاس سلف ایسا نہیں کرتے تھے۔ اللہ کی مخلوق میں سے کسی نبی یا غیر نبی کی اللہ کو قسم نہیں دیتے تھے نہ کسی مردے سے سوال کرتے اور نہ ہی غائب سے اور کسی میت سے مدد چاہتے خواہ وہ نبی یا غیر نبی ہو، بلکہ غیر اللہ سے کسی شے کا سوال ہی نہیں کرتے تھے۔

قاضی السبکی صاحب نے اپنا فیصلہ یوں صادر فرمایا۔ اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ ان کا اختلاف زیارت اور زیارت کے سفر دونوں میں ہے۔ البتہ کلام میں خلط ملط ہے۔ کلام کا شروع چاہتا ہے کہ ان کے نزدیک زیارت کی پہلی قسم تو جائز ہے اور زیارت کی دوسری قسم جائز نہیں۔ لیکن انہوں نے تیسری قسم کو بالکل حذف کر دیا کہ زیارت قبر سے تبرک کے لیے ہو، شرک کے لیے نہ ہو۔

جائزہ

قاضی السبکی صاحب نے اپنی طرف سے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فتوی کی عبارت نقل کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ اہل قبور سے تبرک حاصل کرنے اور ان سے شفاعت کرانے میں ایمان نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک وہی زیارت صحیح ہے جس میں اہل قبور کے بارے میں ویسا ہی عقیدہ رکھا جائے جیسا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکوں کا ہے۔

یہ تو ایسے ہی ہے کہ کوئی عیسائی کسی مسلمان سے سوال کرے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے

بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ مسلمان کہے: وہ روح اللہ بن باپ پیدا ہوئے۔ اللہ کے حکم سے انہوں نے ماں کی گود میں بات کی۔ اللہ نے ان کو معجزات سے نوازا۔ انہوں نے یہود کو دعوت حق دی۔ جو ٹھکرا دی گئی۔ ہم ان کو اللہ کا نبی مانتے اور سمجھتے ہیں۔ ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا۔ قیامت سے پہلے ان کا نزول ہوگا، دجال کو قتل کریں گے۔ مسلمان ان کے فضائل بیان کرتا رہے لیکن عیسائی کہے: نہیں تم عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتے۔ تمہارا ان پر ایمان اس وقت کامل ہوگا جب تم ان کو اسی طرح مانو کہ جس طرح ہم مانتے ہیں۔ یعنی وہ اللہ کے بیٹے اور اس کی مخلوق کے نجات دہندہ ہیں۔ سولی پر ان کی موت واقع ہوئی، تین دن قبر میں رہنے کے بعد آسمان پر چڑھ کر اللہ کے دائیں جانب بیٹھ گئے۔ قاضی صاحب نے بھی ایسا ہی رویہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بارے میں اپنایا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے زیارتِ شرعی میں وہ سب کچھ بیان کر دیا جس کا حکم سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا اور زیارتِ بدعیہ میں ان ممنوع کاموں کا ذکر کر دیا جن کی قرآن وسنت میں اجازت نہیں۔ ہر نبی نے اپنی اپنی امت سے ایک ہی بات کہی۔ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ۔ اللہ کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں اعلان فرمایا:

﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (١٨٦)﴾

جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

سورۃ مومن میں حکم دیا گیا ہے اور انکار کرنے والوں کو ان کے انجام سے آگاہ کر دیا گیا ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (٦٠)﴾

اور تمہارے رب نے فرمایا مجھے پکارو، میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا (یعنی جو مانگو

گے، عطا کروں گا) بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے انکار کرتے ہیں۔ عنقریب وہ ذلیل ورسوا ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

یہاں بہت ہی خوبصورت نکتہ یہ ہے کہ اللہ نے پکارنے والوں کی پکار کو اپنی عبادت قرار دیا اور جو اس کی بجائے کسی اور کو پکارتے ہیں ان کو جہنم کی وعید سنا دی۔ نعوذ باللہ من ذلك

تیسری قسم کی زیارت ہی قاضی السبکی صاحب کا مقصود و مطلوب تھا۔

زیارت کی اقسام

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے زیارت کی دو قسمیں بیان کی تھیں، قاضی صاحب نے تین کر کے پہلی قسم کو سلام و دعا کے لیے زیارت کے بارے میں کہا۔ زیارت کی اس قسم کو ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جائز قرار دیا اور اس کو شرعی زیارت کہا ہے۔ پس اس کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اس زیارت کے سفر کو بھی جائز قرار دیں اگر وہ لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ والی روایت سے دونوں میں فرق کریں تو ہم اس کا جواب ذکر کر چکے ہیں۔

جائزہ

قاضی صاحب کے اس کلام سے واضح ہو گیا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ شرعی زیارت کے منکر نہیں تھے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کے مطابق ہر بستی اور شہر والوں کے لیے ان کے اپنے قبرستان کی قبروں کی زیارت کو مستحب سمجھتے تھے۔ جہاں تک قاضی صاحب کا یہ فرمان ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ زیارت کے لیے سفر کو بھی جائز قرار دیں تو یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ شریعت کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا

تھا اور انہوں نے زیارت کے لیے سفر کرنے سے منع فرمایا۔ لہٰذا یہاں لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ والا قانون ہی نافذ ہوگا۔ اس میں نہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو کوئی اختیار ہے اور نہ ہی کسی اور عالم فاضل کو۔ کیونکہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُو الرَّسُوْلَ کے تحت سب نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنی ہے اور اسی میں ہماری نجات ہے۔

قاضی السبکی صاحب کی تقسیم کے مطابق دوسری قسم حصول برکت اور صاحبِ قبر کے لیے دعا کرنے کے لیے زیارت ہے۔ ان کا کہنا ہے: ابن تیمیہ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کو تیسری قسم یعنی بدعی زیارت میں داخل کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ دین اور سلف صالحین کے طرز عمل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بعض نیک مردوں سے برکت حاصل کی جاسکتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ انبیائے کرام اور مرسلین کرام علیہم السلام اور ان کی قبروں کی زیارت سے برکت بدرجہ اولیٰ حاصل کی جاسکتی ہے۔

مترجم نے اور ''ان کی قبروں کی زیارت سے برکت'' کے جملے کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا۔ قاضی صاحب نے فرمایا: اگر کوئی کہے کہ اس معاملے میں انبیاء علیہم السلام کا درجہ گھٹا کر عام مسلمانوں کے برابر کر دیا ہے جو یقینی طور پر کفر ہے۔ اس لیے کہ جو کسی بھی نبی کے رتبہ کو کم کرے۔ وہ یقیناً کافر ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ نبی کا رتبہ گھٹانا نہیں ہے بلکہ تعظیم میں مبالغے کو روکنا ہے۔ اس پر میں یہ کہوں گا کہ یہ جاہلانہ بات اور بے ادبی ہے۔ ہم پانچویں باب کے شروع میں اس پر کافی بحث کر چکے ہیں اور ہم یقینی طور پر کہتے ہیں کہ نبی ﷺ اپنی زندگی میں اور اپنی موت کے بعد بھی زیادہ تعظیم کے مستحق ہیں۔ جس کے دل میں ذرا سا بھی ایمان ہوگا وہ اس میں شک نہیں کرے گا۔

فتویٰ تکفیریہ کی حقیقت

ہمارے دین کی بنیاد یہی ہے کہ ہم نے ہمہ وقت اور ہر جگہ اللہ ہی کی طرف دیکھنا ہے اور برکتوں کے حصول کے لیے صرف اسی کو پکارنا ہے۔ سورۃ الفرقان میں سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم ملتا ہے:

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ (۵۷)﴾

اور آپ اس اللہ پر توکل کریں کہ جس نے مرنا نہیں۔

سورۃ التغابن میں یہی حکم اہل ایمان کو ملتا ہے:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۳)﴾

اور مومنوں کو چاہئے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسا کریں۔

رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کو یہ حکم اس لیے دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ عَلِيْمٌ وَّخَبِيْرٌ سَمِيْعٌ وَّبَصِيْرٌ اور عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہے۔ اس کو یہی بات پسند ہے کہ اس کی مخلوق ہر حال میں اسی کی طرف دیکھتی اور اسی کو پکارتی رہے۔

صحیح بخاری (ص 640,517,166) میں مروی روایت کے مطابق ابوبکر الصدیق ؓ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے موقع پر واضح کر دیا تھا:

مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهِ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ۔

جو محمد ﷺ کی عبادت کیا کرتا تھا وہ جان لے کہ محمد ﷺ فوت ہو گئے۔ اور جو اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا وہ بھی جان لے کہ بے شک اللہ زندہ ہے اور اس نے کبھی نہیں مرنا۔

جس نے کبھی نہیں مرنا، جو بڑا ہی جاننے والا اور ہمیشہ ہی باخبر رہنے والا اور بڑا ہی سننے والا اور بڑا ہی دیکھنے والا اور ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ قاضی السبکی صاحب نے اس کی بجائے فوت شدہ بزرگوں سے برکات کے حصول کو ثابت کرنے میں انتہائی مبالغہ آمیزی کی اور بلا ثبوت دین اور سلف صالحین کے طرز عمل کا ذکر بھی کر دیا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کن فوت شدہ بزرگوں سے برکات حاصل کیا کرتے تھے۔

آپ کے فوت ہونے کے بعد امت میں بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے وراثت کا مطالبہ کر دیا۔ خلافت کا مسئلہ ابھرا۔ عثمان رضی اللہ عنہ کو مدینہ طیبہ میں محصور کر کے شہید کر دیا گیا۔ امت محمدیہ میں دو گروہ بن گئے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں بے شمار صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین شہید ہوئے۔ کسی کو خیال نہ آیا کہ آپ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر برکتیں حاصل کر کے مسائل کو سلجھایا جاتا۔

قاضی صاحب نے تمام حدوں کو توڑتے ہوئے امت کے اس اکثر حصے کو کافر قرار دے دیا جو زیارت اور سفر زیارت کے بارے میں ان کی سوچ اور عقیدہ سے اتفاق نہ کرتے تھے۔ چونکہ نبی اور غیر نبی میں نبوت و رسالت کی وجہ سے بہت فرق ہوتا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہونے کے ناتے نبی کا رتبہ بلند ہوتا تھا۔

لیکن انسان ہوتے ہوئے وہ انسانوں جیسے ہی ہوتے تھے۔ انسانوں میں پیدا ہو کر انسانوں میں ہی پروان چڑھتے تھے۔ ان میں ہی ان کی شادی ہوتی تھی۔ اگر اللہ چاہتا تو انہی میں صاحب اولاد ہوتے تھے۔ نبوت و رسالت سے نوازے جانے کے بعد انسانوں میں تبلیغ کرتے ہوئے زندگی گزار دیتے تھے اور فوت ہو کر وہیں مدفون ہوتے تھے۔

سورۃ الکہف میں اس کی وضاحت یوں ہوتی ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا(۱۱۰)﴾

آپ کہہ دیں، بے شک میں تمہاری ہی مثل بشر ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ بلاشبہ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے پس جو کوئی اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہے وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

جتنے انبیاء ورسل علیہم السلام کا قرآن حکیم میں ذکر ہوا ہے سب انسان تھے اور اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ سبا میں فرمایا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (۲۸)﴾

ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۰۷)﴾

ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

لیکن آپ انسان ہی تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے اعلان کرایا۔

اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صحیح بخاری (کتاب الانبیاء، ص490) میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: میں نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو منبر پر کہتے ہوئے سنا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰى عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا عَبْدُهٗ وَلٰكِنْ

قُولُوا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُولُہٗ۔

میرے بارے میں اس طرح مبالغہ آمیزی نہ کرنا جس طرح نصاری نے عیسی بن مریم کے بارے میں کی۔ بے شک میں اس کا بندہ ہوں لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرنا۔

مسند احمد (ج3ص153-241) میں انس بن مالک سے مروی ہے:

ایک آدمی نے کہا: یا محمد یا سیدنا و خیرنا و ابن خیرنا فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یٰاَیُّھَا النَّاس عَلَیْکُمْ بِتَقْوٰکُمْ وَلَا یَسْتَھْوِیَنَّکُمُ الشَّیْطَانُ اَنَا مُحَمَّدُ بنُ عَبْدِ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ وَاللّٰہِ مَا اُحِبُّ اَنْ تَرْفَعُوْنِیْ فَوْقَ مَنْزِلَتِی الَّتِیْ اَنْزَلَنِیَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ۔

اے محمد، اے ہمارے سردار اور ہمارے بہترین اور بہترین کے بیٹے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! اپنے اوپر اپنے تقویٰ کو لازم رکھو اور شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔ میں محمد بن عبداللہ، اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ اللہ کی قسم! میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے میرے اس مقام سے بلند کرو کہ جس پر اللہ عزوجل نے مجھے نازل کیا یعنی میرے لیے وہ مقرر کیا۔

لیکن قاضی السبکی صاحب نے اپنی گمراہ کن سوچ کو باطل تاویلوں، ضعیف وموضوع روایات وحکایات اور خوابوں کے سہارے عروج پر یوں پہنچایا کہ جس نے کہا: انبیاء کی قبور عام مسلمانوں کی قبروں جیسا حکم رکھتی ہیں۔ اس نے ان کا درجہ گھٹا کر عام مسلمانوں جیسا کر دیا جو یقینی طور پر کفر ہے۔ اس لیے کہ جو کسی بھی نبی کا رتبہ کم کرے وہ یقیناً کافر ہے۔

چونکہ قاضی السبکی صاحب کے نزدیک نبی ﷺ کی قبر مبارک اس حکم سے مستثنیٰ ہے

کہ جس حکم کے ذریعے تین مساجد کے علاوہ حصول اجر وثواب کے لیے سفر کرنے کی ممانعت ہے۔ جمہور کے مطابق جن میں قاضی صاحب بھی شامل ہیں جب تین مساجد کے علاوہ سفر کرتے ہوئے کسی مسجد کی طرف جانے کی نذر مانی جائے تو وہ لازم نہیں ہوگی۔ اس پر تو علمائے امت کا اتفاق ہے جبکہ نیک لوگوں کی قبروں پر جانے اور فضیلت والی جگہوں کی زیارت کرنے میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ قاضی السبکی صاحب نے خود ہی امام نووی کے حوالے سے (عربی ص 122، اردو ص 159 میں) نقل کیا ہے۔ امام نووی نے یہ وضاحت بھی کردی کہ امام الحرمین کے والد ابو محمد الشافعی ایسے سفر کو حرام کہتے تھے اور قاضی عیاض نے بھی اسی کے مختار ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ مصر کے سلطان کو لکھے گئے خطوط میں بھی الشیخ ابو محمد الشافعی کے فتویٰ کے مطابق ہی فتاوی دیئے گئے اور امام مالک کے فتویٰ کا بھی ذکر کیا گیا۔

قاضی صاحب کے فتویٰ تکفیریہ کے مطابق وہ تمام علماء و ائمہ کرام نعوذباللہ کافر ہوگئے۔ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی محض زیارت کے لیے سفر کرنے کی نفی کی۔ کیونکہ انہوں نے ایسا کہنے سے آپ کا رتبہ گھٹا دیا۔ ان علماء اور ائمہ کرام میں سرفہرست امام مالک ہیں۔

قاضی السبکی کے نزدیک قرآن وسنت کے حوالوں سے مزین خطوط کو خرافات کا مجموعہ کہنا کوئی گناہ نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے واضح حکم کو ٹھکرانا کوئی جرم نہیں۔ لیکن امت کے امام کی قبر مبارک کو امتیوں کی قبروں میں شامل کرنے والا کافر بلکہ یقیناً کافر ہوگا۔ یہ ایمان کا کون سا شعبہ ہے قرآن وحدیث میں اس کا ذکر کہاں ہوا ہے۔ ایک اختلافی مسئلہ کو کفر وایمان کی صورت دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک بکھرے ہوئے گمراہ معاشرے کو اپنی خوبصورت گفتار اور اعلیٰ کردار سے دنیا کا مثالی معاشرہ

بنایا لیکن قاضی السبکی جیسے بزرگوں نے اپنے مفادات کی خاطر اسلامی معاشرے کو زبردست نقصان پہنچایا اور اسلام دشمن قوتوں کے شعوری یا غیر شعوری طور پر مدومعاون بن گئے۔

طاغوت نے اسلام دشمن تمام قوتوں کو جمع کر کے اسلام کو ختم کرنے یا مسخ کرنے کا عمل شروع کرر کھا ہے لیکن قاضی السبکی صاحب نے اہل قبور کی زیارت کو اہم ترین مسئلہ بنا کر امت کو اس کے اصل مقصد سے دور کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو نبوت ورسالت سے نوازنے کے بعد کیا اللہ نے اسی کا حکم دیا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی سورۃ الصف میں اصل ہدف کی وضاحت یوں فرمائی:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹)﴾

وہی ہے جس نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے اگرچہ مشرک لوگ پسند نہ کریں۔

آپ کی پہلی دعوت لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تھی اور اسی دعوت کے ذریعے امت محمدیہ وجود میں آئی اور اسی دعوت کی برکت سے دنیا پر چھا گئی۔ اسی مقدس دعوت کے نام پر پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرا لیکن مسلمانوں کے باہمی انتشار وافتراق کی وجہ سے اس کی حفاظت نہ ہوسکی۔ آدھا ملک الگ ہو گیا اور اب آدھے کے بارے میں ناپسندیدہ سوچیں جنم لے رہی ہیں جبکہ اہل اسلام کی بقا وسلامتی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی دعوت کو قبول کر کے اسی طرح عمل کرنا ہے کہ جس طرح صحابہ نے کیا۔ سورۃ محمد میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۷)﴾

اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی (یعنی اس کے دین کی) مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔

اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

﴿وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّھَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا(۶۹)﴾

اور جو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کئے وہ انبیاء وصدیق اور شہداء وصلحاء ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اطاعت کرنے والوں کو نہ صرف جنت میں اعلیٰ مقام پانے کی بشارت دی بلکہ نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور نیکوں کی رفاقت کی یقین دہانی کرا دی۔ جبکہ قاضی صاحب نے من گھڑت قبروں کے بارے میں مفروضہ قائم کر کے ائمہ امت کے یقینی طور پر کافر ہونے کا فتویٰ دے دیا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی قبریں

سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے دو عظیم ساتھی آپ کے پہلو میں ہی مدفون ہیں یعنی ان کی قبریں آپ کی قبر مبارک کے ساتھ ہی ہیں۔ آپ پر درود وسلام بھیجنے والا ان کو بھی سلام کرتا ہے۔ قاضی صاحب نے کئی بار ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ تینوں کو سلام کیا کرتے تھے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسا کرنے سے وہ کیا رسول اللہ ﷺ کے رتبہ میں کوئی کمی کیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کی سمجھ میں موٹی سی بات کیوں نہ آئی کہ جس عظمت وشان اور بلند مقامی پر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فائز فرمایا تھا اس میں کسی کی سوچ وعمل سے کوئی بلندی یا کمی واقع نہ ہوئی تھی اور نہ ہی ہوگی۔

مبالغہ آمیزی کی ممانعت

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بارے میں مبالغہ آمیزی سے اس لیے منع فرمایا تھا کہ کہیں امت محمدیہ بھی اہل کتاب والی گمراہی کا شکار نہ ہو جائے۔

سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے اعلان کرا دیا:

﴿يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ‌ؕ اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ‌ ۚ اَلۡقٰهَاۤ اِلٰى مَرۡيَمَ وَرُوۡحٌ مِّنۡهُ‌ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ‌ ‌ۚ وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ‌ ؕ اِنۡتَهُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ‌ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ‌ ؕ سُبۡحٰنَهٗۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗ وَلَدٌ‌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ‌ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا (۱۷۱)﴾

اے اہل کتاب! اپنے دین میں مبالغہ آمیزی نہ کرو اور اللہ کے بارے میں صرف حق کہو بے شک مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ یعنی کُنْ کہنے سے پیدا ہونے والے ہیں۔ اللہ نے اس کلمہ کو مریم میں ڈالا اور وہ اللہ کی طرف سے روح ہیں پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ وہ تین ہیں۔ باز آ جاؤ تمہارے لیے بہتر ہوگا، بلاشبہ اللہ صرف ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ اسی کے لیے ہے جو آسمانوں اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہی وکیل کافی ہے۔

سورۃ المائدہ میں مزید وضاحت یوں ہوتی ہے:

﴿قُلۡ يٰۤـاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ غَيۡرَ الۡحَـقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ (۷۷)﴾

آپ کہہ دیں: اے اہل کتاب! اپنے دین میں مبالغہ آمیزی نہ کرو، حق کے سوا کچھ نہ کہو اور نہ اس قوم کی اتباع کرو جو پہلے گمراہ ہوئی اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا اور خود سیدھی راہ سے ہٹ گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے بالکل واضح الفاظ میں فرمادیا کہ میرے بارے میں ویسی مبالغہ آمیزی نہ کرنا جیسی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں نے کی۔

آپ نے یہ بھی پسند نہ فرمایا کہ آپ کو سیدنا، خیرنا، ابن خیرنا کہا جائے۔ آپ نے یہ بھی فرمادیا: اللہ نے جو رتبہ مجھے عطا فرمایا ہے اس سے مجھے بلند نہ کرنا۔ لیکن قاضی السبکی صاحب نے آپ کی قبر مبارک کی زیارت اور اس کے لیے سفر کو اصل دین بنا کر ایسے پیش کیا کہ اس کو نہ ماننے والوں کو انہوں نے کافر بلکہ یقینی طور پر کافر کہہ دیا۔

یہی غلو و مبالغہ آمیزی ہے۔ اسی کو عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنایا۔ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنادیا۔ قاضی السبکی صاحب نے بھی اہل قبور کے بارے میں ایسا ہی تصور پیدا کردیا جس سے امت مسلمہ کی اکثریت اپنے حقیقی رب سے کٹ کر قبروں، مزاروں اور مشاہد کو ہی مَلجاء و ماوٰی ماننے لگے۔ بت پرست بتوں کے پاس جو کچھ کرتے ہیں وہی کچھ مزاروں اور مشاہد میں ہونے لگا ہے۔

مفتی منیب الرحمٰن کا دلچسپ فتویٰ

2008ء میں 23 مئی جمعتہ المبارک کے روزنامہ ایکسپریس کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے دین و دانش کے صفحہ میں مفتی صاحب سے سوال تھا: کیا قبر پر سیمنٹ اور سنگ مرمر لگانا جائز ہے۔ کن قبروں پر چادریں چڑھائی جاسکتی ہیں؟ کیا ایک عام قبر پر چادر چڑھائی جاسکتی ہے؟

چونکہ مفتی صاحب کا اس خاص مسلک سے تعلق ہے جس میں صلحائے کرام کی قبروں کو پختہ کرنا اور ان کو مزاروں کی شکل دینا اور عرسوں کا اہتمام کرنا اور ان قبروں پر چادریں چڑھانا جائز ہے لہٰذا انہوں نے سائل کے سوال کا یوں جواب دیا:

قبر کے اندر تو کسی ایسی چیز کا لگانا ناجائز ہے جسے آگ سے پکا کر تیار کیا گیا ہو لیکن اوپر سے قبر کو پختہ کرنا اور سنگ مرمر لگانا ایسے لوگوں کی قبروں پر جائز ہے جو دینی اعتبار سے عزت و مرتبہ رکھتے ہوں جیسے اولیائے کرام اور علمائے عظام۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں کہ جب میت مشائخ و علماء اور سادات کرام کی ہو تو ان کی قبروں کے اوپر قبہ یا چھت بنانا مکروہ نہیں ہے۔ عام لوگوں کی قبروں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''الامداد'' میں ''کبری'' سے منقول ہے کہ آج کل عموماً لوگ اینٹوں کی قبریں بناتے ہیں تاکہ قبر کھلنے سے محفوظ رہے اور عوام اسے اچھا خیال کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ کام جسے اکثر مسلمان اچھا سمجھتے ہوں، کثرت سے اس پر عمل بھی کرتے ہوں تو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔

اولیاء علماء اور صلحاء کے مزارات پر چادر چڑھائی جا سکتی ہے مگر عام قبروں پر چادر ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ سنگ مرمر زمین کی جنس سے ہے اعلیٰ قسم کا پتھر ہے، اس کے لگانے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ عام قبور کو پختہ بنانا شریعت میں کوئی مطلوب امر نہیں ہے۔ شریعت کا حکم بس یہ ہے کہ جب مومنوں کی قبور کے آثار قائم ہوں تو ان کا احترام کیا جائے۔

مذکورہ عبارت کا تجزیہ

سائل کے سوال و جواب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ آیا قبر پختہ بنانی جائز ہے اور دوسرا حصہ یہ ہے کہ چونکہ بزرگوں کی قبروں پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں کیا عام قبر

پر بھی چڑھائی جا سکتی ہے۔

سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۵۹)﴾

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اللہ ﷺ اور ان کی جو تم میں سے صاحب اختیار ہوں۔ اگر کسی شئے میں تمہارا تنازع ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹاؤ۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی بہتر اور خوبصورت تأویل ہے۔

سورۃ النساء ہی کے الفاظ ہیں:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۸۰)﴾

جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے بے شک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔

قرآن حکیم کے ان حوالوں کی روشنی میں سائل کے سوال کا جواب سیدھا سا یہ بنتا تھا کہ قرآن و حدیث میں پختہ قبر بنانے کی اجازت نہیں اور نہ ہی اس میں خاص و عام کی تقسیم کا کوئی تصور ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

صحیح مسلم (کتاب الجنائز ج1 ص312)، جامع الترمذی (کتاب الجنائز ج1 ص157)، سنن النسائی (کتاب الجنائز ج1 ص331)، ابن ماجہ (کتاب الجنائز ص112)، مسند احمد (ج3 ص295) میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو گچ کرنے، ان پر بیٹھنے، ان کو لتاڑنے، ان پر عمارت بنانے اور ان پر کچھ لکھنے سے منع فرمایا۔

مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے فتاویٰ الشامی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ نہیں دیکھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلے میں کیا فرمایا۔ باب صلاۃ الجنائز: قوله قيل لا بأس (ج1 ص839) میں ان کے بارے میں منقول ہے:

عن ابی حنیفۃؒ یکرہ ان یُبْنٰی علیه بناء من بیت او قبة او نحو ذلك لما روی جابر نهی رسول الله ﷺ عن تحصیص القبور و ان یکتب علیها وان یُبْنٰی علیها رواه مسلم وغیره۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ قبر پر بیت یا قبہ یا اس پر کچھ بنائے جانے کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے: رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو گچ کرنے اور ان پر کچھ لکھائی کرنے اور ان پر عمارتیں بنانے سے منع فرمایا۔ اس کو امام مسلم اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی روایت کیا۔

اہل ایمان کو قرآن میں حکم ملا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اصحاب اختیار کی اطاعت کی جائے۔ اگر کہیں کوئی اختلاف واقع ہوتا ہے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے۔ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ رسول ﷺ کو بھیجنے والا اللہ ہی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا واضح حکم ہے کہ قبروں کو پختہ نہ کیا جائے۔ یہ حکم خیر البریہ صحابہؓ کو تھا۔ اگر تمام دنیا کے اولیائے کرام کو جمع کر لیا جائے تو ان کا رتبہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ تو پھر صحابہؓ کے بعد والوں میں خاص و عام کی تقسیم کیسے ہو سکتی ہے۔

عام مسلمانوں کی قبریں کچی ہوں لیکن صلحائے امت کی قبروں کو مزاروں کی صورت دے دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں پہلے فوت ہونے والے مہاجر عثمان

بن مظعون کی قبر پر نشانی کے لیے ایک پتھر رکھا۔ اس پر کوئی عمارت نہ بنائی اور نہ ہی اس کو چونا گچ کیا۔ تب سے سلف صالحین میں یہی طریقہ چلا آ رہا تھا کہ غیر مسلموں کی پیروی کرتے ہوئے مسلمان حکمرانوں نے بھی مشاہد و مزارات کا سلسلہ قائم کر دیا۔

قبروں کو پختہ کرنے کے ضمن میں اینٹوں سے قبریں پختہ کرنے کا ذکر کرتے ہوئے فتاویٰ شامی ہی کا حوالہ دیا گیا کہ الکبری والے اونٹوں کے کوہانوں جیسی قبریں بنانے کی بجائے قبروں کی حفاظت کی خاطر اینٹیں استعمال کرنے لگ گئے ہیں اور وہ اس کو اچھا سمجھتے ہیں۔

مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَا رَآهُ الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللهِ حَسَنٌ۔ اس عبارت کا ترجمہ مفتی صاحب نے اپنی مرضی سے کیا ہے حالانکہ اس کا لغوی ترجمہ ہے: جو مسلمان دیکھیں کہ وہ اچھا ہے۔ اللہ کے نزدیک بھی وہ اچھا ہے۔

مفتی صاحب اگر تھوڑی سی محنت کرتے تو ان کو یہ حدیث مسند احمد (ج1 ص379) میں مل جاتی۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں، بلکہ عبداللہؓ بن مسعود کا قول ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ کا قول یوں درج ہے:

بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام بندوں کے دلوں کو دیکھا اور تمام میں سے محمد ﷺ کے دل کو بہترین پایا۔ لہٰذا ان کو اپنے لیے چن کر اپنی رسالت سے نواز کر مبعوث فرمایا۔ پھر محمد ﷺ کے دل کے بعد بندوں کے دلوں کو دیکھا تو ان میں صحابہؓ کے دلوں کو بہترین پایا۔ چنانچہ ان کو اپنے نبی ﷺ کے وزراء بنا دیا۔ جو اس کے دین کے لیے قتال کرتے ہیں پس مسلمان جو دیکھیں کہ وہ اچھا ہے۔ اللہ کے نزدیک بھی

وہ اچھا ہے اور جو وہ دیکھیں کہ برا ہے تو اللہ کے نزدیک بھی وہ برا ہے۔

یہ موقوف روایت صحابہؓ کے بارے میں تھی نہ کہ آج کل کے مسلمانوں کے بارے میں ہے۔ سیدالانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے جس کام سے منع فرما دیا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی اس کا حوالہ دے دیا، تو وہ کام آج یا صحابہ کے بعد کیسے جائز اور اچھا ہوسکتا ہے۔

الابانة (ج1ص92) میں ابن عمر کا قول ہے: كل بدعة ضلالة و ان راها الناس حسنة۔ ہر بدعت گمراہی ہے اگرچہ لوگ اس کو اچھا سمجھیں۔

سورۃ النساء ہی میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا(۱۱۵)﴾

ہدایت کے واضح ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی جو مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرے تو ہم اس کو اس کی اختیار کردہ راہ پر لگا دیتے ہیں اور اس کو جہنم میں ڈال دیتے ہیں اور جہنم لوٹنے کی بہت بری جگہ ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ناپسندیدگی والا قول المبسوط (ج2ص62) اور الفقیہ ابواللیث السمرقندی کے فتاویٰ النوازل (ص82) میں بھی مذکور ہے۔ الفتاویٰ الهندیه (ج1ص66) میں مطلق یوں منقول ہے: وَيُسَنَّمُ الْقَبْرُ قَدْرَ الشِّبْرِ وَلَا يُرَبَّعُ وَلَا يُجَصَّصُ وَلَا بَاسَ اَنْ يُّرَشَّ الْمَآءُ عَلَيْهِ وَيُكْرَهُ اَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ۔ قبر کو اونٹ کے کوہان جیسا زمین سے ایک بالشت اونچا بنایا جائے نہ اس کو چورس بنایا جائے اور نہ ہی چونا گچ کیا جائے اور اس پر پانی چھڑکنے میں کوئی حرج نہیں، اس پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔

سوال کے دوسرے حصے کا جواب دیتے ہوئے مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے قرآن، وسنت یا عمل صحابہ یا کسی فتاویٰ وغیرہ کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ عربوں میں زمانۂ جاہلیت میں

بھی قبروں پر چادریں چڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد بھی ایسا سلسلہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ ہندوؤں اور سکھوں کے ہاں ایسی روایت پائی جاتی ہے۔

ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے کفن کے لیے نیا کپڑا استعمال کرنے سے منع کر دیا جبکہ مزاروں پر مہنگی چادروں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ بخاری (ص1088) مسلم (ج2 ص339) میں ابوسعید الخدری سے مروی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں ہی فرما دیا تھا کہ تم سے پہلے جو لوگ تھے بالشت کے برابر بالشت اور ہاتھ کے برابر ہاتھ تم ان کی ضرور پیروی کرو گے۔ یہاں تک کہ کوئی ان میں اگر گوہ کے بل میں داخل ہوگا تو تم بھی ان کے پیچھے داخل ہو جاؤ گے۔ عرض کیا گیا: اللہ کے رسول! اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ آپ نے فرمایا: تو اور کون۔

مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے چادریں چڑھانے میں بھی خاص عام کی تقسیم تو کر دی لیکن یہ نہیں بتایا کہ اسلام میں اور خاص طور پر ہندوپاکستان میں یہ سلسلہ کب شروع ہوا اور اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ مشہور اسلامی فتاویٰ میں اس کا ذکر کیوں نہیں ہوا؟

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک

فتح القدیر (فصل فی الدفن ج2 ص101) میں (ثم یُهَالُ التُّراب ویُسَنَّمُ القبر ولا یسطح) کی تشریح میں منقول ہے: ای لا یُرَبَّعُ لِانّہ عَلَیْہِ السَّلام نهیٰ عَنْ تَرْبِیعِ الْقُبورِ وَمَنْ شَاهَدَ قَبرَ عَلَیْہِ السلام اَخْبرَ اَنَّهٗ مُسَنَّمٌ۔ یعنی قبروں کو چورس نہ بنایا جائے کیونکہ (آپ) علیہ السلام نے چورس قبریں بنانے سے منع فرمایا ہے اور جس نے

(آپ) علیہ السلام کی قبر دیکھی ہے اس نے بتایا کہ وہ اونٹ کے کوہان جیسی ہے۔

الکفایہ میں اس کی وضاحت یوں ہوئی کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: ہم سے ہمارے شیخ نے اس طرح بیان کیا کہ سند کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے تھے۔ بے شک آپ نے قبریں چورس بنانے اور ان کو گچ کرنے سے منع فرمایا۔

محمد بن الحسن نے روایت کی کہ ہمیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حماد سے، انہوں نے ابراہیم سے خبر دی کہ ان کو اس نے خبر دی جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کو اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی قبروں کو دیکھا کہ وہ زمین سے تھوڑی اونچی بنی ہوئی تھیں۔

صحیح بخاری (کتاب الجنائز ص 186) میں سفیان التمار سے مروی ہے۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک دیکھی وہ اونٹ کے کوہان جیسی تھی۔

ابن ابی شیبہ (ج 2 ص 334) کے مطابق سفیان التمار کا بیان ہے: میں اس گھر میں داخل ہوا کہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ہے۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی قبریں دیکھیں۔ وہ اونٹ کے کوہان جیسی بنی ہوئی تھیں۔ امام ابو داؤد (ص 459) نے قاسم بن محمد سے روایت کی کہ میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اماں جان! میرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دو ساتھیوں کی قبریں دیکھنے کی اجازت دے دیں۔ انہوں نے تینوں قبریں دیکھنے کی اجازت دے دی۔ وہ نہ زمین سے زیادہ بلند تھیں اور نہ ہی زمین کے برابر تھیں۔ ان پر بطحاء کی سرخ کنکریاں پڑی ہوئی تھیں۔ فتاویٰ الشامی (ج 1 ص 838) میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان التمار کے اقوال منقول ہیں۔

امام ابن الھمام (المتوفی 681ھ) اور مولانا جلال الدین الخوارزمی نے جو کچھ لکھا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں ساتھیوں کی قبریں ہمیشہ ہی

کچی رہی ہیں۔ کسی بھی زمانے میں ان کو پختہ نہیں کیا گیا لیکن 2004ء میں شائع ہونے والی شفاء السقام کے ٹائٹل پر بالکل بے اصل جعلی بہت بڑی پکی قبر کی تصویر لگا دی گئی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اتنے بڑے جھوٹ پر کسی نے آج تک کوئی احتجاج نہیں کیا اور عوام کو یہی تاثر دیا گیا ہے کہ آپ کی قبر مبارک ایسی ہی ہے یا تھی۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

جبکہ صحیح مسلم (ج1ص312)، ابو داؤد (ص459)، النسائی (ج1 ص231)، ترمذی (ج1ص157) اور مسند احمد (ج1ص96-129) میں ابوالہیاج الاسدی سے مروی ہے۔ مجھ سے علیؓ نے کہا: کیا میں تجھے اس کام کے لیے نہ بھیجوں جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا۔ جاؤ جو بھی بت یا تصویر بنی ہوئی دیکھو تو اس کو مٹا دو اور جو قبر زمین سے زیادہ بلند بنی ہوئی دیکھو تو ان کو شرعی قبروں کے برابر کر دو۔

الام (باب مایکون بعد الدفن: ج1ص277) میں امام الشافعی کا کہنا ہے: مجھے یہ پسند نہیں کہ قبر بناتے ہوئے اس میں سے نکالی گئی مٹی کے علاوہ بلاضرورت مٹی کا اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ اس سے قبر بہت زیادہ اونچی ہو جائے گی۔ میرے نزدیک محبوب یہ ہے کہ وہ زمین سے ایک بالشت یا اس کے قریب اونچی کی جائے۔ مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ اس پر کوئی عمارت بنائی جائے یا اس کو گچ کیا جائے۔ ایسا کرنے سے اس کی مشابہت زینت اور تکبر سے ہو جائے گی۔ جبکہ موت کا ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ میں نے مہاجرین اور انصار صحابہ کی قبروں کو دیکھا۔ ان کو گچ نہیں کیا گیا تھا۔

طاؤس سے مروی ہے۔ بے شک رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر کچھ بنانے اور ان کو گچ کرنے سے منع فرمایا۔

امام الشافعی کا یہ بھی کہنا تھا: انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ مکہ میں وہاں کے حکمران ان تمام اونچی قبروں کو گرا دیتے تھے جو عام قبروں کے درمیان ہوتی تھیں اور فقہاء اس کو

معیوب نہیں سمجھتے تھے۔

رہی بات ان مشاہد و مزاروں کی جو رسول اللہ ﷺ کی واضح ممانعت کے باوجود اور صحابہ کے عمل کے خلاف بن گئے۔ ان کے بنانے یا بنوانے میں ائمہ حق اور قرآن و سنت کے مطابق سوچ رکھنے والے علمائے کرام کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا تھا۔ سلاطین و امراء اور حکمران اپنے جاہ و جلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزار و مشاہد بنوایا کرتے تھے۔ ہندوستان کے ایک بادشاہ نے اپنی بیوی کی قبر پر تاج محل کی صورت میں ایسا مقبرہ بنا دیا جو دنیا کے عجائبات میں ایک عجوبہ بن گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ تم ضرور یہود و نصاریٰ کی پیروی کرو گے۔ ظاہر ہے کہ سید الانبیاء کا فرمان حق و سچ ثابت ہونا تھا۔ جنہوں نے آپ کے ارشاد مبارک کی پروانہ کی اور دنیا میں من مانی کر لی، آخرت میں ان کو اس کا حساب و جواب دینا ہوگا۔ معاملہ ان کے اور اللہ کے درمیان ہوگا۔

قاضی السبکی کے مطابق زیارت کی تیسری قسم

اس قسم کو قاضی صاحب نے شرک والی زیارت قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم قبر کی زیارت سے شرک باللہ سے پناہ مانگتے ہیں اور اس کو اختیار کرنے والے سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان قبر مبارک کی زیارت کرتا ہے وہ شرک والی قسم کو اختیار نہیں کرتا کیونکہ نبی ﷺ نے دعا فرمائی: اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا دینا کہ جس کی عبادت کی جائے۔ جو قبول ہوئی۔ آپ نے فرمایا: شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا کہ جزیرہ عرب میں اس کی پوجا کی جائے۔

ہمارا یقین ہے کہ قبر مبارک کی زیارت کرنے والا کوئی شخص شرک نہیں کرتا۔ رہا نبی

کی قبر کو چھونا اور بوسہ دینا اور سجدہ کرنا اور ایسے ہی دوسرے افعال جو جاہل کرتے ہیں تو ان کی مذمت کی جائے اور ان کو آداب زیارت سکھائے جائیں۔ لیکن اصل زیارت کو ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس کے سفر کو ناجائز کہا جاسکتا ہے۔

نبی ﷺ کی قبر کے پاس اپنی ضروریات طلب کرنا، اس کو ہم استعانت کے باب میں بیان کریں گے۔

جائزہ

قاضی السبکی صاحب نے جن ممنوعہ امور کا ذکر کیا ہے وہ تمام صلحاء کے مزاروں پر ہوتے ہیں اور ان کو عین عبادت سمجھا جاتا ہے اور اس کے لیے دور دراز سے سفر کرتے ہوئے لوگ مزاروں پر حاضری دیتے ہیں۔

مسئلہ وہی ہے کہ زیارت میں کوئی اختلاف نہیں، زیارت کے لیے سفر میں بھی اختلاف سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے حکم کی وجہ سے ہے۔

رہی بات شرک کی تو اللہ تعالیٰ کی ذات عالیہ کے ساتھ شرک کرنے سے امت محمدیہ محفوظ ہوگئی ہے لیکن شرک بالصفات میں امت کی اکثریت ویسے ہی مرتکب ہورہی ہے جیسے یہود و نصاریٰ اور مشرک ہوا کرتے تھے۔ توحید کا معنیٰ سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی مزید وضاحت قاضی صاحب کے باب استعانت میں جواباً ان شاء اللہ تعالیٰ ہوگی۔

زیارت کے بارے میں شبہ ثانیہ اور اس کا جواب

امام ابن تیمیہ کے فتویٰ کا ذکر کرنے سے پہلے ہی ان کی بیان کردہ غیر شرعی زیارت کو مختلف رنگ دے کر قاضی صاحب نے ان کے جواب دیئے ہیں۔ اس کا آغاز یوں کیا

ہے کہ ان کے نزدیک زیارت کا سفر غیر مشروع اور ایسی بدعت ہے کہ صحابہ، تابعین میں سے کسی نے پسند نہیں کیا اور نہ آج تک کسی عالم نے۔ قاضی صاحب نے اس کے جواب میں بلال رضی اللہ عنہ کا خواب دیکھ کر مدینہ آنا، عمر بن عبدالعزیز کا سلام کے لیے شام سے قاصد کا بھیجنا اور ابن عمرؓ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی قبروں پر آ کر سلام کہنا سے زیارت کے لیے سفر کرنے کو جواز بنایا ہے۔

قاضی صاحب نے اس کا تکراراً پہلے بھی ذکر کیا اور اس کا جواب بھی متعدد بار دیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا ہی عرض کرنا مناسب ہے کہ قاضی صاحب کو ماشاء اللہ اتنی بڑی امت محمدیہ میں سے یہ تین حوالے ملے۔ جو واضح سفر زیارت کا جواز مہیا نہیں کرتے۔ حالانکہ عمر فاروق کے عہد خلافت میں صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بہت سے کوفہ اور بصرہ میں آباد ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی کا واقعہ قاضی صاحب کو نہ مل سکا۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سفر زیارت کا کوئی تصور نہ تھا اور اپنے شہر اور اپنی بستی کی قبور کی زیارت میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

قاضی السبکی صاحب 739ھ میں شام کے عہدۂ قضاء پر فائز ہوئے۔ جبکہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی وفات 728ھ میں ہوگئی۔ لیکن اپنی تحریر میں ایسے ذکر کرتے ہیں جیسے کہ وہ زندہ تھے۔ حالانکہ ان کے شام آنے سے گیارہ سال پہلے ہی وہ رب حقیقی سے جا ملے تھے۔

چنانچہ لکھتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے لیے سفر بدعت ہے۔ اس کے لیے ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے دلیل مانگی جائے تو پیش نہیں کر سکیں گے۔ ایک صاحب علم کے لیے کیسے درست ہے کہ وہ محض اپنے چند گمانوں کی بنیاد پر اس کا انکار کر دے جس پر شرق و غرب اور ہر زمانے میں مسلمان متفق رہے ہوں اور آنے والے گزرے ہوئے لوگوں کا عمل دیکھتے آئے ہوں۔ اس کو بیک جنبش قلم بدعت کہہ ڈالے۔

قاضی صاحب یہ تحریر رقم کرتے ہوئے بھول گئے کہ امام نووی رحمہ اللہ کے حوالے سے انہوں نے خود لکھا ہے کہ ابو محمد الجوینی نے زیارت کے سفر کو حرام کہا ہے۔ دلیل تو قاضی صاحب کو ان کے ہم مسلک الشیخ ابو محمد الجوینی نے مہیا کردی تھی۔

اگر شرق وغرب والوں کا اس پر اتفاق ہوتا تو امام ابن تیمیہ اور ان سے پہلے ائمہ امت اختلاف کیوں کرتے اور قاضی صاحب کو کتاب لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

قاضی صاحب نے یہاں ایک عجیب بات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ سلف صالحین صرف زیارت کی قسم اول یعنی شرعی زیارت کے مطابق عمل کرتے ہوئے صلوٰۃ و سلام پر اکتفا کیا کرتے تھے اور خلف یعنی بعد میں آنے والے دوسری قسم جو بدعت ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ باطنی ارادوں کا علم تو اللہ ہی کو ہے کسی کو کیسے یہ حق مل گیا کہ وہ کہے کہ سلف میں سے کوئی قبر سے برکت حاصل نہیں کرتا تھا اور بعد میں آنے والے خلف بدعی زیارت کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔

باطنی ارادوں کا سہارا لے کر قاضی صاحب نے سلف صالحین کو بھی زیارت کی دوسری یعنی بدعی زیارت کرنے والوں میں شامل کر دیا۔

قاضی صاحب نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس قول کو بھی نشانہ بنایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے لیے جو سفر کرتا ہے وہ اس کو قربت ہی سمجھ کر کرتا ہے جو حرام ہے۔

قاضی صاحب نے پھر بلال رضی اللہ عنہ کے سفر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ اگر ابن تیمیہ کو ذرا سا احساس ہوتا کہ بلال رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر سلف نے یہ سفر کیا تو وہ کبھی فتویٰ نہ دیتے۔ ان کے خیال میں یہ جم گیا ہے کہ سفر زیارت پوشیدہ شرک ہے۔ اس بنیاد پر انہوں نے غلط باتیں کہہ ڈالیں۔

قاضی صاحب نے یہاں دیگر سلف کا ذکر تو کر دیا لیکن کسی کا نام نہ لکھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے حوالے میں کوئی وزن نہیں۔

قاضی صاحب نے یہ بھی لکھا کہ ابن تیمیہؒ کا یہ بھی دعویٰ ہے جو کوئی اس سفر کی نذر مانے تو بلا اختلاف اس پر نذر لازم نہیں ہوگی۔ یہ محض ان کا دعویٰ ہے اس پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں، اگر ہم ان سے مطالبہ کریں کہ اس طرح کا ائمہ کا اتفاق دکھائیں اور یہ تصریح دکھائیں کہ اس طرح کے سفر کی نذر خواہ نبی ﷺ کی قبر کے لیے ہو یا غیر نبی کی قبر کے لیے ہو تو وہ واجب نہیں ہوگی۔ جب وہ ایسا کر پائیں گے تو ان کا مقصد پورا ہوگا اور یہ کبھی نہیں ہوگا۔ ہم پہلے ہی نقل کر چکے ہیں کہ نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کی نذر لازم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے سفر کے لیے بھی نذر لازم ہوگی۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام وشان

قاضی القضاۃ علی بن عبدالکافی السبکی صاحب نے اپنی کتاب شفاء السقام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد لکھی جو امام الذہبی کے مطابق علم کے سمندر تھے۔ چند سرکاری قاضیوں کے علاوہ مصر و شام کے عوام و خواص جس قدر اور جیسے ان سے محبت کرتے تھے۔ اس کا اظہار 22-23 ذی القعدہ 728ھ میں ان کے جنازہ کے لیے جمع ہونے اور دعائیں مانگنے والوں کی صورت میں ہوا۔ البدایہ و النہایہ (ج 14 ص 135 تا 138) میں حافظ ابن کثیر الشافعی نے بڑی تفصیل سے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے کے مناظر اور ان کے فضائل بیان کیے ہیں۔ اور ان کا کہنا تھا کہ شام کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا جنازہ تھا۔ امام ابن تیمیہ کی سیرت کے بارے میں ہماری کتاب امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ایک عظیم مصلح دیکھی جا سکتی ہے۔

البدایہ والنہایہ (ج14ص197-198) میں منقول ہے کہ 743ھ میں امیر فخری نے شافعی قاضی کو حکم دیا کہ الشیخ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی جو کتابیں قاضی جلال الدین القزوینی الشافعی نے اپنے عہد قضاء میں ضبط کی تھیں اور اب قاضی السبکی کے قبضہ میں تھیں ان کو امیر کے پاس پہنچایا جائے۔ پہلے تو قاضی السبکی نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن امیر کے سخت رویہ کی بنا پر وہ کتابیں امیر کے پاس پہنچا دیں۔ امام البرزالی کے مطابق وہ ساٹھ کتابیں اور چودہ تحریروں کے بستے تھے۔ ان میں سے کتنی خورد برد ہوئیں، اس کا علم اللہ کو ہی ہے۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے کہ قاضی السبکی نے تین سال ان کتابوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔

امام الذہبی کا بیان ہے کہ امام ابن تیمیہ کی کتابوں کی تعداد پانچ سو تھی۔ امام صاحب کے بھائی کا کہنا ہے، امام صاحب کو خود بھی علم نہیں تھا کہ انہوں نے کتنی کتابیں لکھیں جبکہ یہ بھی منقول ہے: ان کی کتابوں کی تعداد پانچ سو سے ایک ہزار کے درمیان تھی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنۃ (ج1ص95، رقم 409) میں امام الذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے ہی سے نقل کیا ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی تعداد چار ہزار یا اس سے زیادہ تھی۔ شافعی ہونے کے باوجود سب سے زیادہ تفصیل سے حالات انہوں نے ہی امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے لکھے ہیں جن میں ان کے علمی مقام کی تعریف کا حق ادا کیا ہے۔

قاضی صاحب کے مطالبے کا جواب

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں ان کے ہمعصر ائمہ ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ امام الذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور امام المزی تو قاضی علی بن عبدالکافی کے بیٹے کے استاد تھے جنہوں نے اپنی کتابوں میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفضیلت کا الشافعی ہونے کے

باوجود اعتراف کیا ہے۔

قاضی صاحب کو ان کی زندگی میں تو جرأت نہ ہوئی کہ کوئی کتاب لکھتے یا ان سے مناظرہ کرتے لیکن ان کی وفات کے بعد اپنی لکھی گئی کتاب میں ان سے ائمہ کے اتفاق پر ثبوت طلب کرلیا۔

حافظ ابن عبد الہادی (التوفی 744ھ) نے ثبوت بھی ایسا دیا کہ اس کا کسی نے جواب نہ دیا۔ حالانکہ قاضی تقی الدین السبکی ان کی وفات کے بعد بارہ سال زندہ رہے۔ اصل فتویٰ کا جواب لکھنے سے پہلے قاضی صاحب نے ساڑھے چھ ابواب اپنی سوچ وفکر کو ثابت کرنے میں لگا دیئے۔ قرآن وسنت کا جو بھی حوالہ ان کے خلاف جاتا تھا اس کو رد کردیا یا اس میں تاویل کرنے کی کوشش کی۔

امام ابن تیمیہ کے جس فتویٰ کا ذکر قاضی صاحب نے فرمایا اس میں انہوں نے "لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدَ" ہی کے حوالے سے ائمہ کے اتفاق کا ذکر کیا تھا جو اب مجموع فتاویٰ (ج27ص8) میں موجود ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تلخیص الحبیر (ج2ص475، حدیث رقم 949) کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت سے بھی وارد ہوئی ہے جن کے نام یہ ہیں:

ابو بصرہ الغفاری، ابوھریرہ، ابوسعید الخذری، ابن عمر، عبداللہ بن عمرو، عمر بن الخطاب، ابوالجبد الضمری، علی بن ابی طالب، المقدام اور ابوامامہ رضی اللہ عنہم۔

پھر حافظ ابن حجر نے ان تمام روایات کو جمع کردیا جو جلیل القدر صحابہ سے مروی تھیں۔ جن میں ایک بھی ایسی روایت نہیں جس سے ثابت ہوسکے کہ ممنوع سفر سے رسول اللہ ﷺ یا انبیاء وصلحاء کی قبریں مستثنیٰ ہیں۔ تمام صحابہ، تابعین اور ائمہ حدیث کی سمجھ میں وہ

بات نہ آئی جو قاضی صاحب نے سمجھ کر اس کو فرضیت کا درجہ دے دیا۔ اس کے منکر کو یقینی طور پر کافر بنا دیا۔ ائمہ حدیث نے کوئی صحیح حدیث نقل کی ہوتی تو امت پر اس کی قبولیت فرض ہو جاتی۔

امام مالک رحمہ اللہ کا قبر مبارک کی محض زیارت کے بارے میں فتویٰ خود قاضی صاحب نے نقل کیا کہ قبر مبارک کے لیے مانی گئی نذر لازم نہیں ہوگی۔ اگرچہ قاضی صاحب نے بہت کوشش کی کہ اس میں کوئی تاویل ہو سکے۔ لیکن حق مسخ نہ ہوا۔ لِلّٰہِ الْحَمدُ۔

امام رافعی کی الکبیر کی تلخیص الحبیر کا مذکورہ حوالہ کتاب الاعتکاف سے دیا گیا لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مساجد ثلاثہ کے علاوہ اجر وثواب کے حصول کے لیے سفر کرنے سے منع کرنے والی حدیث کو کتاب النذور (ج 4 ص 432، حدیث رقم 2064) میں بھی نقل کر کے ہر قسم کے شک وشبہ کو دور کر دیا ہے کہ تین مساجد کی نذر کے علاوہ کوئی نذر لازم نہیں ہوگی۔

مختلف سفروں میں تأویل

قاضی صاحب نے فرمایا: ابن تیمیہ کا کہنا ہے: صحابہ کرام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی قبروں کی زیارت کے لیے بھی سفر نہ کیا۔

قاضی صاحب نے اس کا جواب یہ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس لیے ہوا کہ کسی نبی کی قبر یقینی طور پر متعین نہیں ہے۔ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک متعین ہے۔

قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں انبیاء علیہم السلام کی قبور کی طرف سفر کرنے اور وہاں سے تبرک حاصل کرنے کو عین عبادت اور کار خیر فرمایا ہے۔

کیسا عجیب استدلال ہے کہ جن نبیوں علیہم السلام کی قبریں متعین ہی نہیں، کسی کو کوئی پتا

نہیں کہ کون سی قبر کس نبی یا کسی اور کی ہے۔ ان کی طرف سفر کرنا اور نا معلوم قبروں سے تبرک حاصل کرنا، اس سے بڑھ کر جاہلانہ بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

ابن تیمیہ ﷫ کا یہ بھی کہنا ہے کہ شب معراج نبی ﷺ نے کسی نبی کی قبر کی زیارت نہیں کی۔

قاضی صاحب نے اس کا جواب یوں دیا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نبی ﷺ اس سفر میں دیگر اہم امور میں مشغول رہے ہوں جبکہ یہ ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ طیبہ میں قبور کی زیارت کی ہے تو محض معراج کی رات میں زیارت نہ کرنے سے کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ سنت نہیں۔

قاضی صاحب نے ''ہو سکتا'' کے ساتھ جواب دے کر بات کو قبروں کی زیارت کی طرف موڑ دیا جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ بات تو امام ابن تیمیہ ﷫ کے سوال کا صحیح جواب دینا تھا جو قاضی صاحب دے نہ سکے۔

امام ابن تیمیہ کی تحقیق کی تائید

قاضی صاحب نے فرمایا کہ ابن تیمیہ کا یہ کہنا کہ معراج والی وہ حدیث جس میں مذکور ہے۔ اتریں، یہ تمہارے باپ ابراہیم ؑ کی قبر ہے۔ یہاں نماز پڑھیں، اور یہ بیت اللحم آپ کے بھائی عیسیٰ ؑ کی جائے پیدائش ہے۔ اتریں اور یہاں نماز پڑھیں۔ یہ روایت جھوٹی ہے۔

قاضی صاحب نے فرمایا: ابن تیمیہ نے یہ بالکل صحیح کہا ہے کیونکہ اس حدیث کا راوی بکر بن زیاد باہلی ہے جس کو ابن حبان نے شیخ دجال کہا ہے۔

حدیث کی عبارت کو نقل کرنے کے بعد قاضی صاحب نے فرمایا: اس حدیث کے

موضوع ہونے سے ہمارے مقصود پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ کسی خاص وقت میں زیارت نہ کرنے سے اس کے استحباب کی نفی نہیں ہوتی۔

جب اس روایت کے من گھڑت ہونے میں قاضی صاحب کو بھی کوئی شک نہ تھا تو اس کا حوالہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بارے میں قاضی صاحب نے یہ بھی فرمایا: ان کا کہنا ہے صحابہ رضی اللہ عنہم مقامات وآثار کی زیارت نہیں کرتے تھے۔

قاضی صاحب کا جواب ہے: اگر یہ بات صحیح بھی ہوتو بھی ہمارے خلاف نہیں ہے کیونکہ ہمارا مقصود مقامات میں مدفون شخصیتوں کی زیارت ہے نہ کہ مقامات کی زیارت کو ثابت کرنا ہے اور ہم پہلے ہی دونوں میں فرق کر چکے ہیں۔

چونکہ قاضی صاحب کے پاس امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتابیں اور فتاویٰ تین سال رہے تھے اور ان کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا تھا لہٰذا انہوں نے اصل فتویٰ سے پہلے ان فتوؤں کا ذکر کر دیا جس سے پڑھنے والے کو ذہنی طور پر ان کے خلاف ابھارا جائے۔ حالانکہ ان کے اپنے جوابات انتہائی غیر مؤثر اور ذہنوں کو الجھانے والے ہیں۔

اسی مذکورہ جواب کو دیکھا جائے تو قاضی صاحب کی علمی سوچ وفکر کا اندازہ ہو جائے گا۔ بڑی سیدھی سی بات ہے کہ مقامات وآثارات کی اہمیت کسی نہ کسی شخصیت یا کسی خاص واقعہ سے ہوتی ہے۔ دنیا کے تمام پہاڑوں میں سے طور پہاڑ کو اس لیے اہمیت ملی کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ وہاں ہمکلام ہوا۔

غار حراء اس لیے مشہور ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت ورسالت سے سرفراز ہونے سے پہلے وہاں جا کر عبادت کیا کرتے اور وہیں قرآن حکیم کے نزول کی ابتداء ہوئی۔

غار ثور کی ناموری کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہجرت کے دوران قیام

کرنا تھا۔

اسی طرح بہت سے دوسرے مقامات و آثار ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے مشہور ہوئے۔ان سے مراد قبریں نہیں بلکہ جگہیں ہیں اور کوئی ایسی چیز ہے کہ جس کا تعلق کسی نہ کسی بڑی شخصیت سے رہا ہے جیسے وہ درخت جس میں موسیٰ علیہ السلام کو روشن آگ دکھائی دی۔طور پہاڑ سے پہلے وہاں گرجے میں ایک ایسا درخت ہے کہ جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ وہی درخت ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام کو آگ کی روشنی نظر آئی تھی اور لوگ دور دراز سے سفر کرتے ہوئے اس کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔

طبقات ابن سعد (ج2ص100) (غزوہ حدیبیہ) میں نافع سے مروی ہے:
لوگ ایک درخت کے پاس آتے جس کو شجرۃ الرضوان کہا جاتا تھا اور اس کے پاس نماز پڑھتے۔عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے لوگوں کو ڈانٹا اور درخت کو قطع کرنے کا حکم دیا جو کاٹ دیا گیا۔

یہ روایت فتح الباری (ج7ص448) اور عمدۃ القاری (ج17 ص220) میں بھی منقول ہے۔امام ابن تیمیہ نے تو مقامات اور مقابر میں فرق کیا۔جبکہ قاضی صاحب نے مقامات کو مقابر سے تعبیر کر کے اپنا مقصود بیان کر دیا کہ وہ مدفون شخصیتوں کی زیارت ہے۔ظاہر ہے کہ مدفون شخصیت قبر میں دفن ہوگی اور قبر زمین میں کسی جگہ ہوگی اور شخصیت کی زیارت کرنے والے کو اس جگہ جانا ہوگا اگر اس زیارت کے لیے سواریاں استعمال نہ کرنی پڑیں تو زیارت مستحب ہوگی۔اگر سواریاں استعمال ہوئیں تو وہ سفر ممنوع ہوگا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مطابق صحابہؓ وہاں بھی نہیں جایا کرتے تھے جہاں کوئی آثار ہوتے یا ان جگہوں کی کوئی فضیلت ہوتی۔

زبردست علمی خیانت

قاضی صاحب نے فرمایا: ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ نبی ﷺ سے لفظ زیارت کا ثبوت نہیں۔ اس دعوے کا باطل ہونا ہم ثابت کر چکے ہیں اور ایسی احادیث کا ذکر کر دیا ہے جن میں زیارت کا ذکر موجود ہے۔

قاضی صاحب کو ذرا سا بھی اپنے منصب کا خیال نہ آیا اور نہ ہی غلط بات کہتے اور بہتان لگاتے ہوئے قیامت کے روز جوابدہی کا خوف ان کے دل میں سمایا۔ امام ابن تیمیہؒ کے فتویٰ کا رد کرنے کی کوشش میں ایسی کتاب لکھ دی جس میں امام ابن تیمیہؒ کی مخالفت میں ہر حربہ استعمال کیا۔ اس میں غلط بیانی اور علمی خیانت بھی شامل ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے قطعاً یہ نہیں لکھا یا کہا کہ لفظ زیارت نبی ﷺ سے ثابت نہیں۔ بلکہ وہ صحیح مسلم (ج 1، کتاب الجنائز) اور مسند احمد (ج 3 ص 28) میں مروی حدیث سے خوب واقف تھے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُوْرُوْهَا "میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا۔ اب ان کی زیارت کیا کرو۔

جس لفظ کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ نے کہا کہ وہ نبی ﷺ سے ماثور نہیں۔ وہ "زُرْتُ" ہے۔ جو امام مالکؒ کے اس جملہ کی وضاحت تھی:

كَرِهَ اَنْ يَّقُوْلَ زُرْتُ قَبْرَ النَّبِی صلی اللہ علیہ وسلم وَ لَوْ كَانَ هٰذَا اللَّفْظُ هُوَ مَعْرُوْفًا عِنْدَهُمْ اَوْ مَشْرُوْعًا اَوْ مَاْثُوراً عَلَى النَّبِی صلی اللہ علیہ وسلم لَمْ يَكْرَهْهُ عَالِمُ الْمَدِيْنَة۔

امام مالک ایسا کہنا مکروہ سمجھتے تھے کہ میں نے نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کی۔ اگر یہ

لفظ یعنی زُرْتُ (فعل بفاعل، واحد متکلم) ان کے نزدیک معروف ومشروع ہوتا یا نبی ﷺ سے مأثور ہوتا تو مدینہ کے عالم اس کو مکروہ نہ کہتے۔

"زُرْتُ" اور زیارت میں فرق ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ سے یہ مروی نہیں کہ میں نے کسی قبر کی زیارت کی یا میں نے کسی کی قبر کی زیارت کی۔

قاضی السبکی نے امام مالکؒ کا یہ قول خود بھی اپنی کتاب کے باب چہارم میں نقل کر کے اس کی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا ماخذ قاضی عیاض کی کتاب الشفاء (ج 2 ص 84) ہے اور اس کا ذکر امام ابن تیمیہؒ کے فتویٰ پر ہونے والی بحث میں بھی ان شاء اللہ آئے گا۔

مشہد ومقبرہ اور مکروہ افعال

قاضی السبکی نے امام ابن تیمیہ کے فتویٰ میں مذکور تمام دلائل کا اپنے انداز میں رَد کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ عربی کتاب کے ایک سو اڑتیس صفحات لکھ ڈالے۔ جبکہ امام ابن تیمیہ کے فتویٰ کو عربی کے صرف چھ صفحات ہیں مگر اس مختصر فتویٰ کے جواب میں لکھی گئی عربی کی کتاب کے کل 250 اور اُردو کے کل 301 صفحات ہیں۔ اگر خالصتاً علمی انداز اختیار کیا جاتا تو پچیس تیس صفحات میں بات پوری ہو سکتی تھی، لیکن بار بار کے تکرار اور فضول مبحث سے کتاب کا حجم بڑھایا گیا اور پڑھنے والوں کو خواہ مخواہ کے الجھاؤ میں الجھایا گیا۔ امام ابن تیمیہؒ سے بڑھ کر صاحب علم ہونے کی کوشش کی اور اہل علم پر فیصلہ چھوڑنے کے بجائے خود ہی اپنے حق میں فیصلہ سنایا۔ اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے قاضی صاحب نے فرمایا: ابن تیمیہؒ کا کہنا ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمانہ میں نبی یا غیر نبی کی قبر پر کوئی مشہد ومقبرہ نہ تھا کہ اس کی زیارت کی جاتی چہ جائیکہ اس کے لیے سفر ہوتا۔

اس کے جواب میں قاضی صاحب نے فرمایا: اگر اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ مشہد کے نام کے ساتھ کسی نبی یا غیر نبی کی قبر موسوم نہ تھی تو یہ درست ہے، مگر نبی ﷺ کی قبر مبارک کو مشہد نہیں کہا جا سکتا۔

عربی کی عبارت ہے: وَ اِنْ اَرَادَ اَنَّهٗ لَمْ یَكُنْ فِی ذٰلِكَ الزَّمَانِ زِیَارَةٌ لِقَبْرِ نَبِیٍّ مِّنَ الْاَنْبِیَآءِ فَهٰذَا بَاطِلٌ لِمَا قَدَّمْنَاهُ۔ اگر ان کا ارادہ ہے کہ اس زمانے میں انبیاءؑ میں سے کسی نبی کی قبر کی زیارت نہیں ہوتی تھی تو یہ باطل ہے۔ اس کا ذکر ہم نے پہلے کر دیا ہے۔

لیکن مترجم نے اس عبارت کا ترجمہ یوں کیا ہے: "اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی قبر کی زیارت نہ ہوتی تھی تو یہ باطل ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کی قبر انور کی زیارت کی جاتی تھی۔

بات مشہد و مقبرہ کی ہوئی، لیکن مترجم نے اس کو نبی ﷺ کی قبر مبارک کی طرف لوٹا دیا اور مترجم بھول گیا کہ (ص 169) میں قاضی صاحب نے یہ قول نقل کیا ہے: ابن تیمیہ کا کہنا ہے: صحابہ کرامؓ نے جب شام فتح کیا تو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی قبور کی زیارت کے لیے کبھی سفر نہ کیا۔

اس کے جواب میں قاضی صاحب نے فرمایا: یہ اس لیے ہوا کہ کسی کی قبر یقینی طور پر متعین نہ تھی۔ صرف نبی اکرم ﷺ کی قبر متعین ہے۔

کتاب کا حجم اسی طرح بڑھایا گیا ہے کہ بات کچھ ہوتی ہے اور اس کو کوئی دوسرا رنگ دے کر الجھاؤ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے مشہد و مقبرہ کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ کی واضح بات کو تسلیم کر لیا، لیکن پھر بھی بحث جاری رکھی۔

مکروہ افعال کا حوالہ دیتے ہوئے قاضی صاحب کی دلیل تھی کہ بعض جاہلوں کی جہالت سے ممنوعہ افعال کے صدور کی بنا پر زیارت کی ممانعت نہیں ہے۔

یہی بات امام ابن تیمیہؒ نے شرعی زیارت اور غیر شرعی زیارت میں واضح کی ہے۔ شرعی زیارت میں رسول اللہ ﷺ کا نمونہ امت کے لیے موجود ہے۔ اس کے مطابق زیارت یقینی طور پر مستحب ہے۔ آپ نے قبروں کی زیارت کا حکم تو دیا، لیکن ان کی زیارت کے لیے سفر کرنے سے منع فرمایا۔ صحابہؓ اور تابعینؒ نے اسی کے مطابق عمل کیا۔

شبہ ثالثہ

سورۃ نوح میں مذکور ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کا بعض بزرگوں کے حوالے سے قاضی صاحب نے فرمایا کہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ قومِ نوح کے نیک لوگ تھے۔ جب یہ فوت ہو گئے تو لوگوں نے ان کی قبروں کو معتکف بنا لیا اور وہاں ان کی تصویریں بنائیں پھر جب وقت گزرتا گیا تو لوگوں نے ان کی پوجا شروع کر دی۔ (تصویریں نہیں بلکہ ان کے بت بنا لیے اور انہی سے بت پرستی کی ابتداء ہوئی)

ابن تیمیہؒ کا خیال ہے کہ زیارت اور اس کے لیے سفر کو روکنا توحید کی محافظت ہے اور ان کے لیے سفر کرنا شرک تک پہنچا دیتا ہے۔

یہاں بھی قاضی صاحب نے زبردستی امام ابن تیمیہؒ سے زیارت کے لیے سفر کرنے کے ساتھ شرعی زیارت کا اضافہ کر دیا۔ حالانکہ خود ہی نقل کیا کہ ان کے نزدیک زیارت کے لیے سفر کرنا شرک تک پہنچا دیتا ہے اور یہ اقرار بھی کیا کہ شرک تک پہنچانے والی چیز تو قبور کو مساجد بنانا، ان پر مرنے والوں کی تصویریں بنانا اور ان کو معتکف بنا لینا ہے۔ یہ چیزیں ممنوع ہیں۔ اس حدیث کا حوالہ بھی دے دیا جس میں رسول اللہ ﷺ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ محض سلام و دعا نہ شرک ہے نہ شرک تک پہنچانے والے ہیں۔

سواریوں کو استعمال کیے بغیر امام ابن تیمیہ بھی نہ صرف اس کو مشروع بلکہ مستحب کہتے تھے۔ اسی نکتہ کو اجاگر کرنے اور لوگوں کو سمجھانے میں انہوں نے اپنی عمر عزیز گزار دی۔ قاضی صاحب بھی سمجھتے تھے کہ شرعی زیارت کا مقصد سلام و دعا ہی ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کہ مقصد زیارت کو آگے بڑھانے اور پھیلانے میں ان کو کونسی مجبوری تھی یا محض امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی مخالفت سے کسی کو راضی کرنا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب!

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بارے میں ضروری علم

قاضی صاحب نے فرمایا: دو باتیں بڑی اہم ہیں، ایک تو نبی ﷺ کی تعظیم کا واجب ہونا اور ان کے مرتبہ کو تمام مخلوق سے بڑا سمجھنا۔

دوسرا اس بات کا عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات اور اپنے افعال میں اپنی تمام مخلوق میں منفرد اور یکتا ہے۔ اگر کوئی کسی کو باری تعالیٰ کا شریک کرے تو وہ مشرک ہے اور ربوبیت کے معاملے میں جو تعلیمات نبی اکرم ﷺ نے دی ہیں، ان میں مجرم ہے اور جو شخص نبی ﷺ کے مرتبہ کو کسی معاملے میں گھٹائے گا تو آپ ﷺ کا مجرم ہوگا۔ اللہ نے جو رتبہ رسول اللہ ﷺ کے لیے واجب کیا ہے، اس پر وہ ظلم کرنے والا ہوگا۔

جو شخص مختلف قسم کی تعظیموں سے نبی ﷺ کی تعظیم میں مبالغہ کرتا ہے، لیکن جو امور اللہ کے ساتھ خاص ہیں، وہ آپ ﷺ کے لیے ثابت نہیں کرتا تو وہ درست عقیدہ پر ہے اور اس نے ربوبیت اور رسالت کی جانب سے ان کی مخالفت کی ہے اور یہی عدل ہے۔ جس میں زیادتی یا کمی نہیں۔

قاضی صاحب نے یہ بھی واضح کر دیا کہ تبرک و تعظیم کی نیت سے نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت آپ کو درجہ ربوبیت میں نہیں پہنچاتی اور نہ اس سے تجاوز جس کی تعلیم

قرآن وسنت میں ہمیں دی گئی ہے اور نہ ہی اس تعظیم سے بڑھ کر جو صحابہؓ نے قولاً و فعلاً آپ ﷺ کی زندگی مبارک میں اور آپ ﷺ کے وفات پا جانے کے بعد کی۔ اس کو کیسے ممنوع خیال کیا جائے گا۔

ابن تیمیہ نے نامعلوم کیوں اس کو بدعت قرار دیا ہے اور یہاں تک کہہ دیا کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کرنا شرک باللہ ہے۔ انا للّٰہ و انّا الیہ راجعون!

مترجم نے یہاں بھی کمال دکھایا۔ عربی عبارت ہے: وھذا الرجل قد تخیل ان الناس بزیارتھم متعرضون للاشراك باللّٰه۔ اور یہ آدمی خیال کرتا ہے کہ بے شک لوگ اپنی زیارت کے ذریعے اللہ سے شرک کرنے کے قریب ہو جاتے ہیں، لیکن مترجم نے اپنی مرضی سے اضافہ کر دیا۔

قاضی صاحب نے امام ابن تیمیہؒ کے فتویٰ کے رد میں لکھی گئی لمبی تمہید کو یوں سمیٹا، کہ جو دلیل ان کے یعنی امام ابن تیمیہ کے خلاف ہوتی ہے، اس کی تاویل کرتے ہیں اور شبہات سے اپنی تائید کرتے ہیں۔ یہ ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ ان کو حق نصیب فرمائے۔ ان سے کوئی پوچھے کہ جب انہوں نے زیارت کا قصد کیا تھا تو اللہ کے ساتھ شرک کیا تھا۔

مذکورہ عبارت کا جائزہ

قاضی صاحب کے غلو کا اسی عبارت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کل کائنات کے خالق و مالک سے پہلے نبی ﷺ کا ذکر فرمایا۔ اگرچہ ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کی مخلوق میں سب سے اونچا مرتبہ رکھنے والے ہیں اور آپ ﷺ کی تعظیم بھی ہر مسلمان پر واجب ہے، لیکن آپ کا بھی خالق اللہ ہی تھا، اسی نے آپ کو نبوت و

رسالت سے نواز کر اپنی مخلوق کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا۔ لہٰذا مناسب یہی تھا کہ پہلے اللہ کا ذکر ہوتا۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جو مرتبہ و شان اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دیا، اس میں کمی کرنے والا آپ ﷺ کا نہیں بلکہ اللہ کا ہی مجرم ہوگا۔ کیونکہ آپ ﷺ کی اطاعت اللہ کی ہی اطاعت اور آپ ﷺ کی نافرمانی اللہ ہی کی نافرمانی تھی۔

قاضی صاحب نے آپ ﷺ کی تعظیم میں اس حد تک مبالغہ آمیزی جائز رکھی کہ جس سے اللہ کی ربوبیت میں فرق نہ آئے۔ یہی وہ غلو تھا جس سے اہل کتاب کو منع کیا گیا اور رسول اللہ ﷺ نے حکماً منع فرمایا اور آپ ﷺ کی حقیقی تعظیم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جو فرمایا، اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ صحیح مرفوع احادیث کو ٹھکرانا اور ضعیف و موضوع روایات کو اپنانا یہ تعظیم نہیں بلکہ نافرمانی ہے۔ تعظیم کا اپنا معیار بنا کر دوسروں کو اس کا پابند کرنے کی کوشش کرنا اور ساتھ نہ دینے والوں کو یقینی کافر بنا دینا، کیا رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی حکم فرمایا تھا؟

امت کے علماء کی اکثریت جس حدیث مبارک کی روشنی میں محض زیارت کے سفر کو جائز نہیں سمجھتی، اس کا سارا بوجھ امام ابن تیمیہؒ پر ڈال کر ان پر طعن کرنا اور جھوٹے مفروضے قائم کر کے ان کو امام ابن تیمیہ کی طرف منسوب کرنا، یہ ایمان کا کونسا پہلو ہے؟ انتہائی طویل تمہید کے آخری حصے میں وہ سب کچھ امام ابن تیمیہؒ کے کھاتے میں ڈال دیا جس کا عملاً مظاہرہ خود قاضی السبکی نے اپنی کتاب میں فرمایا، جو تاویلات و شبہات، ضعیف و موضوع روایات اور خوابوں اور حکایات کا مجموعہ ہے، جبکہ امام ابن تیمیہؒ کے دلائل خالصتاً قرآن و سنت اور فقہائے امت کے حوالوں سے مزین ہوتے ہیں۔ آخر میں یہ وضاحت بھی ہوگئی کہ قاضی صاحب نے یہ کتاب کسی کی تائید اور امام ابن تیمیہؒ کی

مخالفت میں لکھی، حالانکہ امام صاحب کی زندگی میں قاضی صاحب سے کسی زبانی یا تحریری مناظرہ ومجادلہ کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا، چونکہ قاضی صاحب کے قبضہ میں امام صاحب کی کتابیں اور کرّا سے تین سال رہے۔ جس میں سے ان کے بے شمار فتووں کو اپنی مرضی کا رنگ دے کر اپنی مبالغہ آمیزی کو پُرکشش بنانے کی قاضی صاحب نے بہت کوشش کی۔ امام ابن تیمیہؒ کا وہ فتویٰ جس کو بنیاد بنا کر ان کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ جہاں دو سال تین ماہ قید رہنے کے بعد قلعہ ہی میں ان کی وفات ہوئی۔ اب قاضی صاحب اس کے ذکر تک پہنچ گئے ہیں۔

ابن تیمیہ کے فتاویٰ کی تلاش

قاضی السبکی صاحب کا کہنا ہے: پہلے میں نے ابن تیمیہ کا وہ فتویٰ نقل کیا ہے جس میں ان سے براہِ راست زیارت کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا، بلکہ مزارات سے متعلق فتویٰ میں انہوں نے ضمناً اس موضوع پر گفتگو کی تھی۔ اب ہم ان کا وہ فتویٰ نقل کرتے ہیں جو حکومت کے پاس ہے اور جو ان کے قلمی فتویٰ کی بعینہٖ نقل ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے ضمناً گفتگو کی جبکہ قاضی صاحب نے تفصیلاً جواب دینے کی کوشش کی، حالانکہ مقصد اصل فتویٰ تھا۔

حق کا واضح ہونا

قاضی صاحب کی عبارت سے بالکل واضح ہو گیا کہ امام ابن تیمیہؒ کی زندگی میں ان کو امام ابن تیمیہؒ کا فتویٰ نہیں ملا تھا، جو حکومت کے پاس تھا اور ان کو تلاش کے بعد ملا اور حکومت والے فتویٰ سے پہلے انہوں نے اس فتویٰ کا رد کیا ہے جو مزارات کے بارے

میں تھا۔

امام ابن تیمیہؒ کے بارے میں حافظ ابن کثیر شافعی اور حافظ ابن حجر شافعی نے لکھا ہے کہ انہوں نے بیس سال کی عمر میں فتویٰ جاری کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جو 728ھ کے مہینہ ذوالقعدہ میں اختتام پذیر ہوا۔ یوں انہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً 47 سالوں میں بے شمار فتوے دیے۔ جن کو صاحب الجلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز کے حکم و خرچ پر 37 جلدوں میں جمع کر دیا گیا ہے۔

حیران کن تو بات یہ ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی کتاب کی تحریر میں ایسا انداز اپنایا ہے، جیسے امام ابن تیمیہؒ کا رد انہوں نے امام صاحب کی زندگی میں ایسا کیا تھا جو ان کے نزدیک بے مثال تھا اور امام ابن تیمیہؒ کو انہوں نے لاجواب کر دیا تھا۔ حالانکہ جس فتویٰ کو انہوں نے تلاش کے بعد پایا۔ اسی کی وجہ سے امام صاحب کو 16 شعبان 726ھ کے دن دمشق کے قلعہ میں قید کر دیا گیا تھا۔ (البدایۃ و النہایۃ ج 14 ص 123) جبکہ قاضی السبکی کا دمشق میں ورود مسعود قاضی القضاۃ کی صورت میں (البدایۃ و النہایۃ ج 14 ص 184 کی روایت کے مطابق) 739ھ میں ہوا۔ دمشق میں آتے ہی ان کو امام ابن تیمیہؒ کی وہ کتابیں مل گئیں جو شافعی قاضی جلال الدین نے ضبط کی تھیں۔

امام ابن تیمیہ کو قید کرانے اور کرنے میں شافعی قاضی نے زبردست کردار ادا کیا تھا۔ امام صاحب کے فتویٰ پر فیصلہ کن یہ رائے دی کہ ابن تیمیہؒ نے نبی ﷺ کی قبر مبارک اور انبیاء علیہم السلام کی قبروں کی زیارت کو قطعی طور پر بالاجماع معصیت قرار دیا ہے۔

شافعی قاضی کے انتہائی متعصبانہ رویہ کے بارے میں العقود الدریۃ (ص 212)، الکواکب الدریۃ (ص 376) اور البدایۃ و النہایۃ (ج 14 ص 124) میں منقول ہے:

فانظر الآن هذا التحريف على شيخ الاسلام، فان جوابه على هذه المسألة

فيه منع زيارة قبور الانبياء و الصالحين۔ و انما فيه ذكر قولين فى شدالرحل والسفر مجرد زيارة القبور۔ و زيارة القبور من غير شد رحل اليها مسألة و شد الرحل لمجرد الزيارة مسألة اخرى۔ والشيخ لم يمنع الزيارة الخالية عن شد رحل، بل يَسْتَحِبُّهَا و يندب اليها، و كتبه و مناسكه تشهد بذلك۔ و لم يتعرض الى هذه الزيارة فى هذه الوجه فى الفتيا ولا قال انها معصية۔ ولا حكى الاجماع على المنع منها ولا هو جاهل قول الرسول "زوروا القبور فانها تذكركم الاخرة" و الله سبحانه لا يخفى عليه شيء ولا يخفى عليه خافية وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنقَلَبٍ یَّنقَلِبُوْن (الشعراء:۲۲۷)

اب دیکھو یہ شیخ الاسلام پر کھلی تحریف ہے۔ یعنی جو انہوں نے نہ کہا اور نہ لکھا، ان کی طرف اس کو منسوب کر دیا گیا حالانکہ انہوں نے اس مسئلے میں جو جواب دیا تھا، اس میں انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کی قبور کی زیارت سے منع نہیں کیا تھا، بلکہ انہوں نے اس میں محض قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنے کے متعلق دو قول بیان کیے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ محض زیارت کے لیے سفر کرنا ایک مسئلہ ہے اور قبروں کی زیارت بغیر کجاوے باندھے کرنا دوسرا مسئلہ ہے۔ شیخ الاسلام نے سفر کے بغیر زیارت سے منع نہیں کیا تھا، بلکہ اس کو مستحب اور مندوب قرار دیا تھا۔ ان کی کتابیں اور ان کا حج اس پر گواہ ہیں کہ انہوں نے زیارت کی اس قسم سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا اور اپنے فتویٰ میں نہ ہی انہوں نے اس کو معصیت اور ممنوع کہا تھا اور نہ ہی وہ رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے نا آشنا تھے: ''قبروں کی زیارت کیا کرو، بے شک وہ تمہیں آخرت یاد دلاتی ہیں۔''

اللہ ہی پاک ہے، اس پر کوئی چیز مخفی نہیں اور نہ ہی چھپنے والی کوئی چیز اس پر مخفی ہے۔ عنقریب اللہ جان لے گا کہ کونسی لوٹنے والی جگہ میں وہ لوٹتے ہیں۔

اس عبارت کو نقل کرنے والوں میں سے حافظ محمد بن احمد بن عبدالھادی (المتوفی 744ھ) اور حافظ ابن کثیر (المتوفی 774ھ) دونوں امام ابن تیمیہ ؒ پر ہونے والے ظلم پر عینی شاہد تھے اور انہوں نے جو کچھ دیکھا اس کو تاریخ کا حصہ بنا دیا۔

حافظ ابن کثیر الشافعی نے البدایۃ و النھایہ (ج 14 ص 123) میں یہ بھی لکھا ہے کہ پیر کے دن امام ابن تیمیہ ؒ کو قید کیا گیا اور بدھ کے دن شافعی قاضی کے حکم سے امام ابن تیمیہ ؒ کے ساتھیوں کی ایک جماعت کو پکڑ کر ان کو تعزیر میں کوڑے مار کر چھوڑ دیا گیا، لیکن شاگردِ خاص محمد بن قیم الجوزیہ کو قلعہ میں بند کر دیا گیا۔

صحیح بخاری کے ابواب المظالم (ص 330-331) میں سے ایک باب ہے۔ اَعِنْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا اپنے ظالم یا مظلوم بھائی کی مدد کر۔ پھر اس کے تحت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے ظالم یا مظلوم بھائی کی مدد کر۔ انس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! مظلوم بھائی کی مدد والی بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن ظالم کی مدد ہم کیسے کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس کو ظلم کرنے سے روک۔

امام ابن تیمیہ ؒ کی وفات کے گیارہ سال بعد السبکی صاحب دمشق کے قاضی القضاۃ (الشافعی) بنتے ہیں۔ امام صاحب کی کتابیں ان کے قبضہ میں آتی ہیں، چاہیے تو یہ تھا کہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے امام صاحب پر ہونے والے ظلم کی اصلاح کے لیے کچھ کرتے، لیکن انہوں نے دمشق پہنچتے ہی امام بن تیمیہ ؒ کی مخالفت کا بیڑا اٹھالیا۔

امام صاحب کے ہم عصر ائمہ حدیث و رجال نے تو ان پر ہونے والے ظلم کی سخت مذمت کی، لیکن قاضی صاحب نے ظلم کرنے والوں کی بھرپور حمایت کی۔ جس کا علمی ثبوت

انہوں نے شفاء السقام کی صورت میں پیش کر دیا۔

امام ابن تیمیہؒ سے کیا گیا سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام (اللہ ان سے مسلمانوں کو نفع پہنچائے) اس شخص کے بارے میں جس نے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی مثلاً نبی اکرم ﷺ کی قبر کی زیارت کی نذر مانی۔ کیا اس کے لیے جائز ہے کہ سفر میں نماز قصر کرے۔ کیا یہ زیارت شرعی یا غیر شرعی ہوگی؟

نبی ﷺ سے روایت ہے: جس نے حج کیا اور اس نے میری زیارت نہ کی تو اس نے مجھ سے جفا کی اور جس نے میرے فوت ہونے کے بعد میری زیارت کی، وہ اس شخص کی طرح ہوگا کہ جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

نبی اکرم کا یہ بھی ارشادِ مبارک ہے: رخت سفر نہ باندھا جائے مگر مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ اور میری اس مسجد کی طرف، فتویٰ دیجیے! اللہ آپ کو اجر دے گا۔

سوال کا جائزہ

سوال کرنے والوں نے سوال کو ایسے مرتب کیا کہ جس کے کئی زاویے تھے۔ حالانکہ سیدھی سی بات قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کرنا تھی۔ آیا محض زیارت کے لیے سفر جائز ہے کہ نہیں، لیکن اس کو پیچیدہ بنانے کے لیے زیارت کے لیے نذر ماننا اور اس کو پورا کرنے کے لیے سفر میں نماز کا قصر کرنا یا نہ کرنا، کیونکہ معصیت کے سفر میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ بھی ہیں جو معصیت کے سفر میں قصر جائز سمجھتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو جائز نہیں سمجھتے۔ ایسے امور کا ذکر کر کے سوال کرنے والوں کا اصل مقصد زیارت

کے لیے محض سفر کو معصیت ہونے کا فتویٰ حاصل کرنا تھا۔ اس لیے انہوں نے دو ان ضعیف حدیثوں اور ایک صحیح مرفوع کا حوالہ دے دیا۔ جن کی بنا پر زیارت کے لیے محض سفر کو جائز سمجھنے والے دلیل بناتے ہیں، جبکہ محض زیارت کے لیے سفر کو جائز نہ سمجھنے والے تین مساجد کے علاوہ اجر و ثواب کے لیے سفر نہ کیا جائے، والی حدیث پر عمل کرتے ہیں۔

سوال کا جواب

چونکہ سوال تحریری تھا، لہٰذا امام ابن تیمیہؒ نے تحریراً اس کا جواب دیا۔ انہوں نے اپنے جواب کی ابتداء الحمدللہ سے کی۔ جس کا ترجمہ مترجم نے گول کر دیا۔

امام صاحب کا کہنا تھا: جس شخص نے صرف انبیاء علیہم السلام اور صالحین کی قبور کے لیے سفر کیا، اس کے لیے نماز قصر کرنے کے بارے میں دو قول ہیں:

ایک قول متقدمین علمائے کرام کا ہے جو ناجائز سفر کے دوران میں نماز قصر کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ جیسے عبداللہ ابن بطہ اور ابوالوفاء بن عقیل وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ گناہ کا سفر ہے۔ اس میں قصر نماز کی اجازت نہ ہوگی۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بھی گناہ کے سفر میں قصر نماز جائز نہیں۔

دوسرا قول امام ابوحنیفہؒ اور بعض متاخرین اصحاب امام شافعیؒ اور اصحاب امام احمدؒ کا ہے۔ ابو حامد الغزالی، ابوالحسین ابن عبدوس اور ابومحمد ابن قدامہ اس سفر کو گناہ قرار نہیں دیتے ہیں اور نبی ﷺ کے ارشاد ''قبروں کی زیارت کیا کرو'' کے عموم سے جواز پر استدلال کرتے ہیں۔

بعض لوگ جن کو فن حدیث میں مہارت نہیں ہے، اس سفر کے جواز پر الدار قطنی (ج2 ص268) اور ابن ماجہ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں ''جس نے میری

موت کے بعد میری زیارت کی، اس نے گویا کہ میری زندگی میں میری زیارت کی۔ (ابن ماجہ کا اضافہ امام صاحب پر بہتان ہے۔ اس کی وضاحت آگے جا کر ہو گی) بعض لوگ زیارت کے سلسلہ میں ''جس شخص نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی، اس نے مجھ سے جفا کی'' سے استدلال کرتے ہیں۔ جس کو کسی عالم نے روایت نہیں کیا اور یہ استدلال ایسا ہے جیسا کہ ''جس شخص نے میری اور میرے باپ ابراہیم کی ایک سال میں زیارت کی، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں'' سے استدلال ہے۔

یہ دونوں روایتیں بالاتفاق باطل ہیں۔ کسی بھی عالم نے ان سے اس مسئلہ پر استدلال نہیں کیا۔ الدارقطنی والی روایت سے تو بعض علمائے کرام نے استدلال کیا بھی ہے۔ ابو محمد مقدسی نے نبی ﷺ کی قبر کی زیارت اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی قبور کی زیارت کے لیے سفر کے جواز پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ نبی ﷺ مسجد قباء کی زیارت کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے اور ''لاتشد الرحال'' والی روایت کو استحباب کی نفی پر محمول کیا ہے۔ یعنی مساجد ثلاثہ کے علاوہ دیگر مساجد کا سفر مستحب نہیں۔

جو لوگ زیارت کے سفر کے قائل نہیں وہ صحیحین کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رخت سفر نہ باندھا جائے مگر تین مساجد کی طرف۔ وہ مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد ہے۔'' اس حدیث کی صحت پر تمام ائمہ متفق اور عمل پیرا ہیں۔

اب اگر کوئی شخص نذر مانے کہ وہ تینوں مساجد کے علاوہ کسی مسجد یا مشہد میں جا کر نماز پڑھے گا یا اعتکاف کرے گا یا اس کے لیے سفر کرے گا تو اس پر وہ نذر لازم نہ ہو گی۔ اس پر ائمہ کا اتفاق ہے۔

اگر کسی نے نذر مانی کہ مسجد حرام میں حج یا عمرہ کے لیے پہنچے گا تو اس پر تمام علماء کے

نزدیک یہ نذر لازم ہوگی اور اگر اس نے نذر مانی کہ مسجد نبوی میں جا کر نماز پڑھے گا تو امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک یہ نذر لازم ہوگی۔ جبکہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ نذر لازم نہ ہوگی۔ اس لیے کہ ان کے ہاں نذر کے لزوم کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کی جنس کی کوئی چیز شرعاً واجب ہو۔

جمہور ہر طاعت کی نذر کو لازم قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جس کسی نے نذر مانی کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو وہ ضرور اطاعت کرے اور جس نے نذر مانی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا تو وہ نافرمانی نہ کرے۔ (بخاری: کتاب النذور ص 990)

مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی جگہ اور کسی مقام کی نذر کسی عالم کے نزدیک لازم نہیں ہے۔ علمائے کرام نے یہاں تک تصریح کی ہے کہ مسجد قباء کی نذر بھی لازم نہیں ہے، کیونکہ وہ مساجد ثلاثہ میں داخل نہیں ہے۔ حالانکہ اس کی زیارت مدنی کے لیے مستحب ہے، کیونکہ اس کی زیارت کے لیے رخت سفر باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

جس نے گھر میں وضو کیا، پھر مسجد قباء پہنچا اور اس کا مقصد محض نماز تھا تو اس کو ایک عمرہ کا ثواب ملے گا۔ (السنن الکبری (ج 5 ص 248)، ابن ماجہ (ص 102-101)، ترمذی (ج1 ص 27)

علمائے کرام نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کی قبور کے لیے سفر کرنا بدعت ہے۔ کسی صحابیؓ یا تابعیؒ نے یہ نہیں کیا، نہ نبی ﷺ نے اس کا حکم دیا، نہ مسلمانوں کے کسی امام نے اس کو مستحب بتایا۔ لہٰذا اب کوئی اس کو عبادت سمجھے اور کرے تو وہ سنت اور اجماع کا مخالف ہے۔

ابوعبداللہ ابن بطہ نے اپنی کتاب الابانۃ الصغری میں اس کو بدعت اور سنت و اجماع کی مخالفت قرار دیا ہے۔ اسی سے ابو محمد کی دلیل کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ نبی ﷺ جب قباء کی زیارت کرنے جاتے تو رخت سفر باندھا نہیں جاتا تھا۔ یہ ان کی دلیل ہے کہ نذر سے اس کا لزوم نہیں ہوگا۔

ان کا یہ کہنا کہ "لا تشد الرحال" صرف استحباب کی نفی پر محمول ہے تو اس میں دو باتوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ انہوں نے تسلیم کرلیا کہ یہ سفر نہ نیک کام ہے نہ ہی قربت و طاعت اور نہ ہی حسنات میں سے ہے۔ اب اگر کوئی یہ اعتقاد رکھے کہ انبیاء علیہم السلام اور صلحائے کرام کی قبور کی زیارت قربت و طاعت اور عبادت ہے تو اس نے اجماع کے خلاف کیا اور اگر اس نے اس اعتقاد کے ساتھ سفر کیا تو وہ بالاجماع حرام ہوگا اور اس کی تحریم یقینی ہے اور یہ واضح بات ہے کہ جو نبی ﷺ وغیرہ کی زیارت کے لیے سفر کرتا ہے، وہ عبادت وطاعت ہی سمجھ کر کرتا ہے۔ ہاں اگر وہ کسی اور مقصد سے سفر کرتا ہے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں، وہ جائز ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں نفی نہی کی متقاضی ہے اور نہی تحریم کا تقاضا کرتی ہے۔ جو احادیث زیارت کے سلسلہ میں بیان کی ہیں وہ سب بالاتفاق ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ اصحاب سنن میں سے کسی نے ان کو روایت نہیں کیا اور نہ ہی کسی امام نے ان کو دلیل سمجھا۔ بلکہ امام مالک جو اہل مدینہ کے سب سے بڑے عالم اور اس مسئلہ سے خوب واقف تھے، "زُرتُ قبرَ النبی ﷺ" (میں نے نبی ﷺ کی قبر کی زیارت) کہنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ اگر ان کے زمانہ میں یہ لفظ مستعمل ہوتا تو وہ زیارت کو مشروع سمجھتے یا نبی ﷺ سے منقول ہوتا تو مدینہ کے عالم کبھی اس کو مکروہ نہ کہتے۔

امام احمد بن حنبلؒ اپنے زمانے میں سنت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ جب ان

سے زیارت کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے صرف اس حدیث پر اعتماد کیا تھا:

جو شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ میری روح کو میری طرف لوٹا دیتا ہے تا کہ میں اس کا جواب دے سکوں۔

زیارت کے سلسلے میں انہوں نے کوئی اور حدیث بیان نہ کی تھی۔

امام مالک نے مؤطا میں صرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب وہ مسجد نبوی میں داخل ہوتے تو السلام علیك یا رسول اللہ ، السلام علیك یا ابابکر، السلام علیك یا عمر کہتے اور پھر واپس ہو جاتے تھے۔ (ایضاً مصنف عبدالرزاق ج 3 ص 577، ابن ابی شیبہ ج 3 ص 341)

سعید ابن منصور کی سنن میں ہے کہ عبداللہ بن حسنؓ بن حسنؓ بن علیؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نبی ﷺ کی قبر کے پاس آ جا رہا ہے اور دعا کرتا ہے۔ انہوں نے اس سے کہا، آپؐ نے فرمایا: میری قبر کو عید نہ بنانا اور جہاں کہیں بھی ہوا کرو، وہاں سے درود بھیج دیا کرنا، تمہارا درود مجھ تک پہنچ جایا کرے گا۔ درود بھیجنے میں تم اور وہ شخص جو اندلس شہر میں ہے، دونوں برابر ہو۔

صحیحین کی روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا: یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے نبیوں علیہم السلام کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔ صحیح بخاری (ص 177)، صحیح مسلم (ج 2، ص 201)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اگر یہ ڈر نہ ہوتا تو آپ ﷺ کی قبر مبارک پر آنے کی عام لوگوں کو اجازت دے دیتی، لیکن آپ نے پسند نہ فرمایا کہ آپ ﷺ کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیا جائے۔ اسی لیے صحابہؓ نے آپ ﷺ کو صحرا میں دفن کرنے کے بجائے عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں دفن کیا، تا کہ نہ کوئی آپ ﷺ کی قبر کے پاس نماز پڑھے، نہ اس کو سجدہ گاہ

بنائے اور نہ ہی آپ ﷺ کی قبر کو بت بنا لے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ جس میں آپ ﷺ کی قبر مبارک تھی، وہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ تک مسجد سے جدا تھا۔ صحابہؓ اور تابعینؒ میں سے کوئی حجرہ میں نماز پڑھنے، قبر کو چھونے اور وہاں دعا کرنے کے لیے نہ جایا کرتا تھا۔ یہ سب کچھ لوگ مسجد میں کیا کرتے تھے۔ صحابہؓ اور تابعینؒ جب نبی ﷺ پر درود و سلام بھیجتے اور دعا کرتے تو قبلہ رخ ہوا کرتے تھے۔ قبر مبارک کی طرف منہ نہیں کرتے تھے۔

سلام کہنے کے وقت میں امام ابو حنیفہ بھی یہی کہتے تھے کہ قبلہ کی طرف رہے۔ قبر کی طرف منہ نہ کرے۔ اکثر ائمہ کا کہنا ہے: سلام کرتے ہوئے خصوصاً قبر مبارک کی طرف رخ کیا جائے اور دعا کے لیے قبر مبارک کی طرف رخ کرنے کا کوئی امام قائل نہیں۔ ایک جھوٹی حکایت امام مالکؒ کی طرف منسوب کر دی گئی ہے جو ان کے مذہب کے خلاف ہے۔

تمام ائمہ کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ قبر مبارک کا مسح نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کو بوسہ دیا جائے۔ یہ سب کچھ توحید کی محافظت ہے۔

شرک کی جڑ یہ ہے کہ قبروں کو مساجد بنایا جائے۔

﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا (۲۳)﴾

انہوں نے کہا ہم نے اپنے معبودوں کو ہرگز نہیں چھوڑنا اور نہ ہی ہم نے ود اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو چھوڑنا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں سلف کی ایک جماعت نے کہا: وہ نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگ تھے۔ جب وہ فوت ہو گئے تو لوگ ان کی قبروں کے پاس بیٹھ گئے اور ان کی صورتوں پر ان کے بت بنا لیے۔ جب ان پر کچھ عرصہ گزر گیا تو لوگوں نے ان کی عبادت کرنی شروع کر دی۔ یہی بات امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ابن

عباسؓ سے نقل کی ہے۔اسی طرح ابن جریر طبری اور سلف میں سے کئی ایک نے ایسی ہی تفسیر بیان کی ہے۔ان مسائل کے اصول پر اس مقام کے علاوہ اور بہت کلام ہو چکا ہے۔

سب سے پہلے جنہوں نے مزارات کی زیارت کے لیے سفر کرنے کی احادیث وضع کیں، وہ رافضی بدعتی اور ان جیسے لوگ ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو مساجد کو ویران کرتے اور مشاہد کی تعظیم کرتے ہیں۔اللہ کے ان گھروں کو چھوڑ دیتے ہیں جن کے بارے میں حکم ہے کہ ان کو آباد کیا جائے۔ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے اور جن مشاہد (مزاروں اور مقبروں) میں شرک ہوتا ہے، جھوٹ بولا جاتا ہے، بدعت کے کام ہوتے ہیں، ان کی تعظیم کرتے ہیں۔حالانکہ اللہ نے ایسے دین پر کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔جبکہ کتاب وسنت دونوں میں مساجد کا ذکر ہوا۔مشاہد کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔

* سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (۲۹)﴾

آپ کہہ دیں، میرے رب نے انصاف کرنے کا حکم دیا ہے اور تم اپنے چہروں کو ہر مسجد میں سیدھا رکھا کرو۔یعنی نماز میں قبلہ کی طرف چہروں کو کیا کرو اور اس کے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کو پکارا کرو۔

* سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ (۱۸)﴾

بے شک اللہ کی مساجد وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی۔

❁ سورہ البقرہ میں ارشاد ہوا:

﴿وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ (۱۸۷)﴾

اور تم ان سے مباشرت نہ کرنا کہ جب تم مساجد میں اعتکاف کر رہے ہو۔

❁ سورۃ الجن میں اللہ نے فرمایا:

﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (۱۷)﴾

اور بے شک مساجد اللہ ہی کے لیے ہیں، پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔ (یعنی مدد کے لیے صرف اسی کو پکارنا ہے۔)

❁ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِیْ خَرَابِهَا (۱۱۴)﴾

اور اس شخص سے ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مساجد سے منع کرے کہ ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور ان کو خراب کرنے کی کوشش کرے۔

صحیح مسلم (باب النهی عن بناء المسجد علی القبور، ج1 ص 201) میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوا یَتَّخِذُوْنَ الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ فَاِنِّی اَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ.

بے شک جو لوگ تم سے پہلے تھے، وہ قبروں پر مساجد بنا لیا کرتے تھے۔ آگاہ ہو جاؤ، تم قبروں کو مساجد یعنی سجدہ گاہیں نہ بنا لینا۔ بلاشبہ میں تمہیں اس سے منع کر رہا ہوں۔

اللہ سبحانہٗ زیادہ جانتا ہے۔ (اس کو احمد بن تیمیہ نے لکھا)

مذکورہ فتویٰ پر قاضی السبکی کے اعتراضات

حیران کن بات یہ ہے کہ امام ابن تیمیہؒ کا فتویٰ نقل کرنے سے پہلے اس کے جتنے بھی پہلو ہیں، اپنے انداز میں قاضی صاحب ان پر خوب بحث کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود بات کو الجھانے اور پھیلانے کے لیے بحث کے سلسلہ کو انہوں نے جاری رکھا۔ کیونکہ ان کی عادت تھی کہ اپنی رائے کو غالب کرنے اور اپنی مرضی کے اقوال وروایات کو ترجیح دینے میں کوشاں رہتے تھے۔

ان کے بیٹے ابونصر عبدالوہاب کی مولفۃ طبقات الشافعیہ الکبری کے مقدمۃ التحقیق (ص 11) میں منقول ہے: جمع لوالده فتاويه و كثيرا من المسائل التى تفرد فيها برأى او رجح فيها قولا على قول۔ ”ابونصر عبدالوہاب نے اپنے باپ کے فتوؤں کو جمع کیا اور بہت سے وہ مسائل بھی کہ جن میں اپنی رائے استعمال کرنے میں وہ منفرد تھے یا قول کو قول پر ترجیح دیتے تھے۔“

حافظ ابن عبدالہادی اور حافظ ابن کثیر کے حوالے سے پہلے ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ کا فتوی درحقیقت ائمہ کرام کے دو گروہوں کے اقوال تھے۔ انہوں نے فتویٰ میں اپنی رائے کو قطعاً استعمال نہیں کیا، لیکن شافعی قاضی نے فتویٰ میں منقول الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ امام ابن تیمیہؒ نے نبی ﷺ کی قبر مبارک اور انبیاء علیہم السلام کی قبور کی زیارت کو قطعی طور پر حرام کہا ہے۔ جو سراسر بہتان تھا اور اسی بہتان بازی کو قاضی علی بن عبدالکافی السبکی نے شام کا قاضی بنتے ہی شدت سے آگے بڑھایا۔

سوچنے اور سمجھنے والی بات یہاں یہ ہے کہ جب اسی فتویٰ کی بنا پر امام صاحب کو 726ھ میں قید کر دیا گیا اور قید ہی میں انہوں نے 728ھ میں وفات پائی تو ان کی وفات

کے گیارہ سال بعد امام صاحب کے فتویٰ کا رد کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

درحقیقت امام ابن تیمیہ کو اللہ نے جو عزت وشہرت عطا فرمائی وہ ان کے کسی ہم عصر کو نصیب نہ ہوئی۔ پانچ سو سے اوپر ان کی لکھی ہوئی کتابیں اسلامی سلطنت کے اطراف میں پھیل چکی تھیں اور ان کے عقیدت مندوں کے دلوں میں یہ بات نقش ہو چکی تھی کہ امام صاحب کے ساتھ شافعی قاضی نے ظلم کیا جس کا اثر زائل کرنے کی قاضی السبکی نے بھرپور کوشش کی۔ اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ امام صاحب نے قرآن وسنت کے غلبے کے لیے جو کہا اور جو لکھا وہ تحریک کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ لہٰذا اس تحریک کو دبانے کا سلسلہ قاضی السبکی نے دمشق میں وارد ہوتے ہی شروع کر دیا۔

امام ابن تیمیہ کے فتویٰ کے پہلے حصے یعنی نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کے لیے اگر نذر مان کر سفر کیا جائے تو اس میں نماز کو قصر کرنا جائز ہوگا۔ قاضی صاحب کے نزدیک بھی جائز ہے اور اس میں قصر بھی جائز ہے۔ امام صاحب نے جس گروہ کے حوالے سے اس کے ناجائز ہونے کا ذکر کیا تھا، قاضی صاحب نے ان کی دلیل کو ٹھکرا دیا اور ایک غیر متعلقہ فضول سی بحث میں متقدمین اور متاخرین کے بارے میں فرمایا: ابن بطہ اور ابن عقیل کو ابن تیمیہؒ نے متقدمین میں شمار کیا اور امام غزالی کو متاخرین میں شامل کر دیا۔ حالانکہ ابن عقیل اور امام غزالی کا زمانہ ایک ہی تھا۔ امام ابن تیمیہؒ نے امام غزالی کو ان میں شمار نہیں کیا۔ انہوں نے بعض شوافع اور حنابلہ کا ذکر الگ کیا تھا۔ جیسا کہ ان کے فتاویٰ ج 27 میں ان کا یہ انداز دیکھا جا سکتا ہے۔

زبردست دھوکہ

قاضی صاحب نے سوال میں مذکور حدیث کہ ''جس نے میری وفات کے بعد میری

زیارت کی، گویا کہ اس نے میری زندگی میں زیارت کی'' کے بارے میں فرمایا کہ ابن تیمیہ نے کہا کہ یہ ابن ماجہ میں ہے۔ حالانکہ یہ ابن ماجہ میں کہیں موجود نہیں۔

قدرت کا عجیب قانون ہے کہ جب انسان دوسرے کو دھوکہ دینا یا مغالطے میں ڈالنا چاہتا ہے تو خود ہی دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے خود ہی امام ابن تیمیہؒ کے نقل کردہ جواب میں حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اصحاب سنن میں سے کسی نے اس کو روایت نہیں کیا۔ (اُردو ص 178 سطر 18، عربی ص 141 سطر 19)۔ جب امام صاحب نے کہہ دیا تھا کہ اصحاب سنن میں سے کسی نے اس کو روایت نہیں کیا تو وہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ ابن ماجہ نے اس کو روایت کیا۔

العقود الدریہ (ص 207) اور الکواکب الدربہ (ص 373) میں صرف الدار قطنی کا ذکر ہے۔ قاضی صاحب کو جو فتویٰ بہت مشکل کے بعد ملا، اس میں ابن ماجہ کا اضافہ صریحاً دھوکہ ہے۔

دوسری حدیث کے بارے میں قاضی صاحب کا فرمان ہے جو ان کی علمی دیانت کی مزید وضاحت ہے کہ ابن تیمیہ کا یہ کہنا کہ حدیث ''جس نے حج کیا اور اس نے میری زیارت نہ کی، بے شک اس نے مجھ سے جفا کی'' کو کسی عالم نے روایت نہیں کیا۔ ان کا یہ کہنا سراسر غلط ہے۔ اگرچہ اس حدیث میں ضعف ہے، لیکن ہم پہلے ابواب میں اس کے راویوں کا تذکرہ کر چکے ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی سیدھی سی علمی بات تھی کہ ائمہ حدیث میں سے کسی نے نہ اس روایت کو اپنی کتاب میں جگہ دی اور نہ ہی اس سے استدلال کیا اور امام ابن تیمیہ نے ساتھ ہی اس روایت کا ذکر کر کے ثابت کیا کہ یہ من گھڑت موضوع ہے، لیکن قاضی صاحب نے اپنے منصب کا بھی خیال نہ رکھا اور حق کو مسخ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

سورۃ المائدہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ (۸)﴾

کسی قوم کی دشمنی تمہیں ہرگز اس پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو۔ بلکہ عدل کرتے رہو کیونکہ وہی تقویٰ کے قریب ترین ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ اس سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

قاضی صاحب نے جس روایت کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ پر الزام لگایا کہ وہ سراسر غلط ہیں، اس روایت کے ایک راوی نعمان بن شبل کے بارے میں حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر بن احمد المقدسی (المتوفی 507ھ) نے اپنی کتاب تذکرۃ الموضوعات (رقم 790ج 116) میں لکھا ہے: یأتی من الثقات بما لیس من حدیثھم۔ وہ ثقہ راویوں کے نام پر وہ احادیث بیان کرتا جو ان سے مروی نہیں ہوتیں۔

قاضی صاحب کے بیٹے ابونصر عبدالوہاب السبکی کے استادِ محترم جلیل القدر امام الذہبیؒ نے سند کے ساتھ روایت کو نقل کر کے فیصلہ دیا۔ ھذا موضوع یہ من گھڑت ہے۔ انہوں نے میزان الاعتدال (ج4 ص265) میں وہی کچھ فرمایا جو امام ابن تیمیہؒ نے کہا تھا۔

امام الذہبیؒ نے اس روایت کے موضوع ہونے کا ذکر کیا تو کیا اس سے ثابت ہو جائے گا کہ وہ روایت صحیح ہے، کیونکہ امام الذہبیؒ نے اس کا ذکر میزان الاعتدال میں کر دیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کا یہی مقصد تھا کہ اس کو صحیح سمجھ کر کسی نے روایت نہیں کیا۔

ابن عقیل کا قول

شذرات الذھب (ج 4 ص 35 کے مطابق) ابو الوفاء علی بن عقیل البغدادی

(المتوفی 513ھ) اپنے وقت کے بہت بڑے امام اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، ان کی سب سے بڑی تصنیف کتاب الفنون تھی، جو دو سو جلدوں کو محیط تھی۔ امام الذہبی کے مطابق اس کی چار سو جلدیں تھیں۔

امام ابن تیمیہؒ نے ابن عقیلؒ کا حوالہ دیا کہ ان کے نزدیک زیارت کا سفر معصیت ہے۔ لہٰذا اس میں قصر جائز نہیں۔

اس کے جواب میں قاضی صاحب کا کہنا تھا: ہاں! صرف ابن عقیل کے قول کے اعتبار سے اس کی حرمت کا شبہ ہوتا ہے۔ اگر اس نسبت کو صحیح مان لیا جائے تو اس میں نبی ﷺ کی قبر کے سفر کی تصریح نہیں ہے۔

قاضی صاحب کا یہ جواب درست نہیں، کیونکہ امام ابن تیمیہؒ سے سوال ہی یہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی مثلاً نبی اکرم ﷺ کی قبر کی زیارت کی نذر مانی جائے تو کیا اس سفر میں قصر کرنا جائز ہوگا؟...... لہٰذا ابن عقیل کے قول سے حرمت کا شبہ ہوتا ہے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

ابن بطہ کے بارے میں

ابو عبداللہ عبید اللہ بن محمد حمدان المعروف ابن بطہ (المتوفی 387ھ) نے ابن عقیل سے تقریباً سوا سو سال پہلے ہی نبی ﷺ کی قبر مبارک کی محض زیارت کے لیے سفر کرنے کو آپ کی صحیح حدیث کی روشنی میں معصیت کہا تھا اور ابن عقیل نے بھی اس کو نقل کر دیا تھا، جس کا حوالہ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتویٰ میں دیا۔ اس کو غلط ثابت کرنے اور ابن بطہ کے ضعیف راوی ہونے کے ثبوت میں خطیب بغدادی (المتوفی 463ھ) کی تاریخ بغداد کے حوالے سے یہ نقل کر دیا گیا کہ وہ اَن سنی حدیث کے بارے میں سماع کا دعویٰ کر دیتے

ہیں اور ابو القاسم الازہری نے ان کو ضعیف، ضعیف، ضعیف کہا تھا۔ قاضی صاحب نے ایک ضعیف اپنی طرف سے بڑھا دیا۔

ابن بطہ کی ایک سند کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بغوی سے، انہوں نے مصعب سے، انہوں نے مالک سے، مالک نے زہری سے اور انہوں نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

خطیب کا کہنا ہے کہ اس سند سے یہ روایت باطل ہے۔

قاضی صاحب نے شاید امام ابن جوزی کی کتاب العلل المتناھیۃ نہیں دیکھی تھی۔ اس کے "باب فرض طلب العلم" میں امام ابن جوزی (المتوفی 597ھ) نے علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، جابرؓ، انسؓ اور ابو سعیدؓ الخدری کے حوالے سے اسی متن کی 25 روایات نقل کر کے فیصلہ دیا ہے۔ هٰذِهِ الْاَحَادِيْثُ كُلُّهَا لَا يَثْبُتُ یہ تمام احادیث ثابت نہیں ہوتیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سب سے زیادہ یعنی 14 روایات انس رضی اللہ عنہ کے حوالے ہی سے بیان ہوئی ہیں۔

اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ قاضی صاحب نے خطیب بغدادی کے حوالے سے ابن بطہ کے بارے میں یہ بھی نقل کر دیا کہ وہ نیک صالح بزرگ مستجابة الدعوة تھے۔

امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج 3 ص 15، رقم 5394) میں ان کے بارے میں لکھا ہے: مع قلة اتقان ابن بطة فی الروایة فکان اماما فی السنة، اماما فی الفقه، صاحب احوال واجابة دعوة رضی الله عنه۔ "روایت میں اتقان کی قلت کے باوجود وہ سنت وفقہ میں امام اور صاحب احوال اور مستجابة الدعوة تھے۔"

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ فن رجال ایسا مشکل فن ہے کہ جس میں بڑے

بڑے امام الجھ گئے اور بے شمار ضعیف وموضوع روایات ہمارے دین کا حصہ بن گئیں۔

ابن بطہ مستجابة الدعوة اس لیے تھے کہ احادیث نقل اور روایت کرنے میں جہاں ان سے غلطی ہوتی تو فوراً اس کی اصلاح کر لیتے تھے۔ جس روایت کے ضعیف یا موضوع ہونے کا ان کو علم ہو جاتا تو اس کو ترک کر دیتے تھے۔ حضرت قاضی القضاۃ کی طرح ان کو صحیح ثابت کرنے میں ڈٹ نہیں جایا کرتے تھے۔

رہی بات خطیب بغدادی کی تو اس کا جواب حافظ ابن کثیر الشافعی نے البداية و النهاية (ج 11 ص 322-321) میں یوں دیا ہے: خطیب بغدادی ابن بطہ کے پیچھے اس لیے پڑ گئے اور ان پر طعن کی کیونکہ انہوں نے خطیب کے الشیخ ابن برہان پر جرح کی تھی جس کا مذہب تھا کہ کفار جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

ابن جوزی نے اس پر خطیب کا تعاقب کیا اور اپنی سند سے ثابت کیا کہ انہوں نے بغوی سے ان کی معجم سنی تھی۔ "علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔" اس بارے میں بھی ابن بطہ کا دفاع کیا۔

حافظ ابن کثیر الشافعی نے ان کے بارے میں ایک خواب کا بھی ذکر کیا کہ ان کی تعریف کرنے والوں میں سے کسی نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔ شذرات الذهب (ج 3 ص 123) اور طبقات الحنابلة (ج 2 ص 125، رقم 662) کے مطابق وہ ابو محمد الجوہری کے بھائی ابو عبداللہ تھے۔ انہوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! مذاہب میں اختلاف ہو گیا۔ کونسا مذہب بہتر ہے تاکہ میں اس کو اختیار کروں؟ آپ نے فرمایا: عليك بابي عبدالله ابن بطة۔ یہ بھی مروی ہے: آپ نے تین مرتبہ فرمایا: ابن بطہ کے ساتھ ہو جاؤ۔ خواب دیکھنے والے جب ابن بطہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا: صدق رسول اللہ ﷺ! تین مرتبہ اس جملے کو دوہرایا۔

قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں متعدد خوابوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کو قابل حجت بنایا ہے۔ اگر ان کے اصول کو اپنایا جائے تو پھر امت کتنے خوابوں پر عمل کرے گی۔

قاضی صاحب نے ابن بطہ کی کتاب الابانة عن شريعة الفرقة الناجية و مجانبة الفرق المذمومة کے باب دفن ابی بکر و عمر رضی اللہ عنہما مع النبی ﷺ ایضاً۔ اور ابوبکر محمد حسین الآجری کی کتاب الشریعة کے ایسے ہی باب کے حوالہ سے اپنی کتاب کے تیسرے باب (عربی ص 60 اور اُردو ص 85) میں خود ہی وضاحت کر دی کہ ان کا مقصود بعض ملحدین کا رد کرنا تھا جو نبی ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تدفین کا انکار کرتے تھے۔

ان کا کہنا تھا: رہا مسئلہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کا تو اس کو کسی نے غلط خیال نہیں کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ بعض متقدین نے زیارت کو مناسک حج کے تابع قرار دیا تھا، ان کو یہ خیال نہ تھا کہ آٹھویں صدی میں زیارت کے معاملہ میں یا زیارت کے لیے سفر کے معاملے میں کوئی اختلاف ہوگا۔

ابوبکر محمد بن الحسین الآجری کے حوالے سے تحریر کیا کہ علمائے حجاز و عراق، شام و خراسان اور اہل یمن میں سے جس نے مناسک پر کتاب لکھی خواہ وہ متقدمین یا متاخرین میں سے تھے، انہوں نے یہی لکھا کہ جو شخص مدینہ آتا ہے، خواہ اس کا ارادہ حج و عمرہ کا ہو یا نہ ہو یا صرف مدینہ کا ارادہ ہو۔ اس کو کس طرح نبی ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سلام کہنا چاہیے۔ یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی رسول اللہ ﷺ کے بعد سلام کرنا ہوتا ہے۔ (اُردو ص 84، عربی ص 59)

اس واضح عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی آپ کے دونوں رفیق بھی مدفون ہیں، لیکن قاضی صاحب نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نبی ﷺ

کی قبر مبارک کی زیارت بھی عبادت ہے۔

ابوبکر محمد بن الحسین کی تحریر کی تائید میں قاضی صاحب نے ابن بطہ کی تحریر بھی نقل کر دی کہ ان کا کہنا ہے: متقدمین اور متاخرین میں سے جس عالم نے بھی مناسک پر کتاب لکھی، اس نے اس میں احرام وطواف وغیرہ کے وہ احکام بیان کر دیے جس کے بارے میں حاجیوں کا باخبر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے آداب سے بھی آگاہ کر دیا کہ تُو قبر کے پاس آ۔ قبلہ کی طرف پشت کر کے منہ قبر کی طرف کر اور کہہ السلام علیك ایها النبی و رحمة اللّٰه و بركاته۔ یہاں تک کہ سلام و دعا کی صفت بھی کتاب لکھنے والے عالم نے بیان کر دی۔ پھر وہ کہتا ہے کہ تُو ذرا دائیں جانب ہو کر کہہ السلام علیك یا ابابکرؓ و عمرؓ۔

ابن بطہ کا کہنا ہے: ہم نے دیکھا ہے اور ہمارے ہاں ہمیشہ سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے کہ جب کوئی حج کے لیے جاتا ہے اور اس کے اہل وعیال اس کو رخصت کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہمارا سلام بھی نبی ﷺ، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کو عرض کر دینا۔ نہ کوئی اس کا انکار کرتا ہے اور نہ ہی مخالفت، یہ ابن بطہ کا کلام ہے۔

نوٹ: لیکن مترجم نے اپنی طرف سے یہ اضافہ بھی کر دیا۔ جو ابن بطہ کا کسی عبارت کا ترجمہ نہیں۔ ”بہر حال زیارت قبر نبی ﷺ پر کسی نے ناپسندیدگی نہیں کی ہے۔“

قاضی صاحب نے الآجری اور ابن بطہ کے کلام سے یہ نتیجہ نکالا کہ زیارت کے لیے ہمیشہ حجاج سفر کرتے رہے ہیں جو مناسک حج کے تابع ہوتا ہے۔

ابوبکر آجری متقدمین میں سے ہیں اور انہوں نے سن 360ھ میں وفات پائی۔ ثقہ و صدوق تھے اور ان کی بہت سی تصانیف ہیں، لیکن اُن کی الشریعہ میں بھی ضعیف و موضوع روایات موجود ہیں۔

ابن بطہ کی وفات 387ھ میں ہوئی۔ حنابلہ کے نامور فقہاء میں سے تھے۔ اپنے وقت کے حدیث وفقہ میں امام اور فاضل جلیل تھے۔

جہاں اپنے نقطۂ نظر سے ابن بطہ کی موافقت کا پہلو نکلا تو ان کو امام جلیل بنا دیا اور جہاں امام ابن تیمیہؒ نے ابن بطہ کے حوالے سے قاضی صاحب کو غلط ثابت کیا تو فوراً بطہ میں نقائص کا حوالہ دے دیا۔

امام ابن تیمیہؒ نے ابن بطہ کی اَلْاِبَانَة الصُغریٰ کا حوالہ دیا تو قاضی صاحب نے اَلْاِبَانَة الکُبریٰ کے باب دفن ابی بکر و عمر رضی اللہ عنہما مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایضاً کا حوالہ دیا، جبکہ اَلْاِبَانَة الکُبریٰ میں ایسا کوئی باب ہی موجود نہیں اور نہ مذکورہ روایت کا کوئی ذکر ہے۔ اَلْاِبَانَة الکُبریٰ دو جلدوں میں ایمان وعقائد کی کتاب ہے۔ لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ کا حوالہ ہی صحیح اور درست ہے۔

اس کی مزید وضاحت یوں ہوتی ہے۔ قاضی صاحب کا کہنا ہے:

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کے بارے میں ابن بطہ کا قول اَلْاِبَانَة میں اس کے خلاف دیکھا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی دو کتابوں کا نام الابانة ہے۔ ابن تیمیہؒ نے جو قول نقل کیا ہے وہ الابانة الصغری کا ہے اور جو ہم نقل کر رہے ہیں۔ وہ الابانة الکبری کا ہے۔

اب اگر یہ صحیح ہے تو الابانة الصغری کا قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے علاوہ دیگر قبور پر محمول کیا جائے تاکہ دونوں میں تضاد نہ ہو۔ اگر ان کا وہی قول ہے جو ابن تیمیہؒ نے نقل کیا ہے تو پھر یہ قول ناقابل التفات ہے اور قاضی صاحب نے ابن بطہ کے بارے میں خطیب بغدادی کی تحریر نقل کر دی ہے۔

اَلْاِبَانَۃ کے بارے میں قاضی صاحب کی معلومات

قاضی صاحب نے اَلْاِبَانَۃ کے بارے میں جو کچھ لکھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے الا بانۃ الکبری اور الابانۃ الصغری دونوں کو ہی نہ دیکھا تھا۔ کسی کی لکھی لکھائی عبارت نقل کر دی اور یہ بھی کیسا عجیب فیصلہ ہے کہ اگر ابن بطہ کا وہی قول ہے جو ابن تیمیہؒ نے نقل کیا ہے تو پھر اس کی طرف دیکھا بھی نہ جائے گا۔ یعنی ان کے نزدیک وہی بات وحجت قابل قبول ہوگی جو ان کی مرضی وخواہش کے مطابق ہوگی۔

امام ابن حزم (المتوفی 456ھ) کا فتویٰ

قاضی صاحب نے امام ابن تیمیہؒ پر یہ اعتراض بھی وارد کیا کہ ان کے مطابق مساجد ثلاثہ (مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ) کے علاوہ کوئی شخص کسی اور مسجد میں نماز پڑھنے کی نذر مانے گا تو وہ لازم نہیں ہوگی، جو صحیح نہیں۔ کیونکہ امام شافعی کے اس پر دو قول ہیں۔ ایک قول کے اعتبار سے یہ نذر لازم ہو جائے گی۔

قاضی صاحب نے امام شافعی کے دو قول کا ذکر کر دیا، لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ امام نوویؒ کی شرح مسلم میں مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے بارے میں جو خود نقل کر چکے وہ بھی بھول گئے۔

عربی ص 122 اور اُردو ص 158 میں ان کا کہنا ہے کہ مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے سفر کی نذر کے بارے میں تین مذہب ہیں:

1- یہ درست نہیں۔ یہ ہمارا اور جمہور کا مذہب ہے۔

2- مطلق جائز ہے۔ یہ مذہب لیث بن سعد کا ہے۔

3- یہ نذر اس وقت لازم ہوگی جب رخت سفر باندھنا نہ ہو، جیسے کہ مسجد قباء۔ یہ مذہب محمد بن مسلمہ مالکی کا ہے۔

قاضی صاحب اور جمہور کے نزدیک مساجد ثلاثہ کے علاوہ اور مسجد کے لیے سفر کی نذر درست نہیں۔ اس کی تائید عبدالملک سے یوں نقل کی کہ جو مساجد دور ہوں ان میں جانے کی نذر لازم نہ ہوگی۔ نہ پیدل جانے کی اور نہ ہی سوار ہو کر جانے کی۔

یہی بات امام ابن تیمیہؒ نے کہی۔ جس کا قاضی صاحب نے بغیر دلیل انکار کر دیا۔ المحلی لابن حزم (ج 8 ص 19، کتاب النذور) میں بھی امام ابن حزم نے ایسا ہی فرمایا، ان کی تحریر ہے:

فَاِنْ نَذَرَ مَشْیًا اَوْ نُھُوضًا اَوْ رُکُوبًا اِلٰی مَسْجِدٍ مِّنْ مَسَاجِدِ الْاَرْضِ غَیْرَ ھٰذِہٖ لَمْ یَلْزَمْهُ شَیْءٌ اَصْلًا۔ بُرْھَانُ ذٰلِكَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَھٰی شَدِّ الرِّحَالِ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِد فَقَطُ۔ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَسْجِدِ الْمَدِیْنَةِ وَ الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی۔

اگر ناذر نے چل کر یا کھڑے ہو کر یا سوار ہو کر مساجد ثلاثہ کے علاوہ زمین کی مساجد میں سے کسی مسجد کی طرف جانے کی نذر مانی تو اس پر اصلاً کچھ بھی لازم نہ ہوگا...... اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے صرف تین مساجد کے علاوہ کجاوے باندھ کر سفر کرنے سے منع فرمایا ہے۔ وہ مسجد حرام، مسجد مدینہ اور مسجد اقصیٰ ہیں۔

جلیل القدر امام نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے حوالہ سے یہ وضاحت بھی کردی:

اِنَّمَا الرِّحْلَةُ اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَسْجِدِ الْمَدِیْنَةِ وَ مَسْجِدِ اِیْلِیَآءَ فَصَارَ الْقَصْدُ اِلٰی مَا سِوَاھَا مَعْصِیَةٌ وَ الْمَعْصِیَةُ لَا

يَجُوزُ الْوَفَآءُ۔

بے شک تین مساجد کی طرف ہی سفر کرنا جائز ہے۔وہ مسجد حرام، مسجد مدینہ اور مسجد ایلیاء (مسجد اقصیٰ) ہیں۔ان کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے سفر کا مقصد معصیت ہوگا اور معصیت کو پورا کرنا جائز نہیں۔

قاضی صاحب کا یہی کمال تھا کہ جو چاہتے اور جب چاہتے ٹھکرا دیتے۔اگرچہ ان کی اپنی ہی کہی ہوئی یا اپنی ہی نقل کردہ بات ہوتی۔انہوں نے جب جمہور کا مذہب نقل کر دیا تو پھر اس کے بعد لیث بن سعد اور محمد بن مسلمہ کے مذہب کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ ایک دو کے اختلاف سے اتفاق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت متحقق نہ ہوگی۔

لہٰذا امام ابن تیمیہؒ نے مسجد قباء کے بارے میں جو کہا، وہی حق ہے اور قاضی صاحب کے اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں۔ایک عالم کی رائے سے علمائے اسلام کی اکثریت کے فیصلہ کو ٹھکرایا نہیں جاسکتا۔

زیارت قبور کے لیے سفر کا بدعت ہونا

امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتویٰ میں جو کچھ لکھا، اس پر جلیل القدر ائمہ اسلام کے حوالے دیے۔انہوں نے اپنی رائے کو استعمال نہ کیا، لیکن ائمہ کے اقوال کی تمام ترذمہ داری قاضی السبکی نے امام ابن تیمیہؒ پر ڈال دی۔

امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتویٰ میں جو قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں خود نقل کیا ہے، لکھا: ابوعبداللہ ابن بطہ نے اپنی کتاب الابانۃ الصغری میں اس کو بدعت اور سنت و اجماع کا مخالف قرار دیا ہے۔اسی طرح انہوں نے علمائے کرام کے حوالے سے لکھا کہ

انہوں نے کہا ہے انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کی قبور کی زیارت کے لیے سفر بدعت ہے۔ کسی صحابی یا تابعی نے یہ سفر نہیں کیا۔ نہ ہی نبی ﷺ نے اس کا حکم دیا۔ نہ مسلمانوں کے کسی امام نے اس کو مستحب کہا۔ اب کوئی اس کو عبادت سمجھ کر کرے تو وہ سنت واجماع کا مخالف ہوگا۔

قاضی السبکی کا کہنا تھا: ابن تیمیہ کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ زیارت قبور کے لیے سفر بدعت ہے۔ کسی صحابیؓ اور کسی تابعیؒ نے ایسا سفر نہیں کیا۔ نہ ہی نبی ﷺ نے ایسے سفر کا حکم دیا۔ نہ ہی اس کو مسلمانوں کے امام نے مستحب قرار دیا۔ اب اگر کوئی زیارت قبور کے لیے سفر کرے گا تو وہ سنت اور اجماع کے خلاف عمل کرے گا۔

ابن تیمیہ کا یہ صریح جھوٹ ہے، کیونکہ ہم ان صحابہؓ اور تابعینؒ کے بارے میں بتا چکے ہیں جنہوں نے یہ سفر کیا ہے اور علمائے کرام نے اس کو مستحب گردانا ہے۔

قاضی صاحب نے یہ بھی فرمایا: ایک اور غلط بات یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے ہر قول اپنی طرف سے نہیں بلکہ دوسروں کا مقولہ کر کے بیان کیا ہے اور یہ بیان نہیں کیا کہ اس کا قائل کون ہے۔

شاید ان کا مقصد یہ ہو کہ اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں سے اتار کر دوسرے پر ڈال دیں، لیکن وہ اس طرح سے اس نقل کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتے تھے۔ بہر حال اس قول کی برائی ان کی طرف ہی نسبت ہوگی۔

امام ابن تیمیہؒ پر بہتان

قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنے کے بارے میں مذکورہ بالا عبارت میں قاضی صاحب کے نقل کردہ امام ابن تیمیہؒ سے کیے گئے سوال کے جواب کا ایک حصہ ہے اور دوسرا حصہ خود قاضی صاحب کا اپنا جواب ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے واضح طور پر ابن بطہ کی کتاب الابانة الصغری کا حوالہ دیا اور علمائے کرام کا بھی ذکر کر دیا۔ جس سے مراد وہ علمائے کرام تھے، جنہوں نے صحیحین میں مروی مشہور حدیث سے استدلال کیا کہ تین مساجد کے علاوہ کجاوے نہ باندھے جائیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق ایسے سفر کو ممنوع قرار دیا۔

ان میں سے وہ بھی تھے جنہوں نے اس کو حرام و معصیت کہا۔ قاضی صاحب نے امام الحرمین کے باپ شافعی الشیخ ابو محمد الجوینی کے بارے میں خود (ص 122 عربی اور ص 159 اُردو میں) لکھا کہ انہوں نے فرمایا: یہ سفر حرام ہے اور قاضی عیاض نے اس کے مختار ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ﴾ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو......اور جو اس حکم کے مطابق عمل نہیں کرتے، ان کو سورۃ الجن میں وعید سنا دی گئی ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (۲۳)﴾

اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہوگی۔ ایسے لوگ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تلخیص الحبیر (ج 2 ص 475) کے کتاب النذور میں مساجد ثلاثہ کے علاوہ سفر کرنے سے منع کرنے والی روایت اور اس کو روایت کرنے والے صحابہؓ کے حسب ذیل نام لکھے ہیں:

ابو ہریرہ، ابو سعید الخدری، ابو بصرہ الغفاری، ابن عمر، عبداللہ بن عمرو، عمر بن خطاب، ابو الجعد الضمری، علی بن ابی طالب، المقدام اور ابوامامۃ (رضی اللہ عنہم)۔

صحابہؓ اور تابعینؒ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم مبارک کو سمجھا اور اس کے مطابق عمل

کیا۔ ائمہ حدیث نے بھی اسی کو حق سمجھا اور کسی نے سفر زیارت کو مستحب نہ کہا۔

ائمہ حدیث کا معمول رہا ہے کہ جو بھی وہ بیان کرتے تھے، صحیح سند کے ذریعے اس کو رسول اللہ ﷺ تک پہنچاتے تھے۔ اگر کسی سند میں مشکوک راوی ہوتا تو اس کی نشاندہی کرتے ہوئے حق کو واضح کر دیتے تھے۔

امام ابن تیمیہؒ نے بھی ائمہ حدیث کے طریقہ کار کو اپناتے ہوئے اپنے سے پہلے ائمہ و علماء کے حوالے سے اپنے فتویٰ میں سوال کے جواب دیے۔ جو قاضی صاحب کو پسند نہ آئے، قاضی صاحب نے بھی اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے بہت سے حوالے دیے۔ اگرچہ ان کے حوالوں کی صحت ائمہ حدیث کے قائم کردہ معیار کے مطابق نہ تھی، لیکن انداز ان کا بھی امام ابن تیمیہؒ والا ہی تھا۔

انہوں نے امام ابن تیمیہ پر ہی نہیں بلکہ ائمہ امت پر بہتان لگاتے ہوئے اس حوالے کو صریح جھوٹ قرار دے دیا جس کا جو حوالہ امام ابن تیمیہؒ نے دیا تھا۔

قاضی صاحب کے دعویٰ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے خواب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سلام بھیجنے کو اپنی دلیل بنایا ہے۔

قاضی صاحب نے شفاء السقام (ص53 عربی، ص79) میں بلال رضی اللہ عنہ کے خواب کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: کما ذکره ابن عساکر فی ترجمة بلال رضی اللّٰہ و ذکره ایضا فی ترجمة ابراهیم بسند اخر الی محمد بن الفیض۔

مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ابن عساکر نے اس روایت کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے حالات میں ذکر کیا ہے۔ (شفاء السقام کے تیسرے باب میں اس روایت کا ذکر ہو چکا ہے)

یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ ابن عساکر میں بلال رضی اللہ عنہ کے حالات میں

مذکورہ روایت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ ابراہیم بن محمد سلیمان کے ترجمہ میں یہ روایت موجود ہے۔ ابن الاثیر نے بھی بغیر سند کے اس کو نقل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بات بے سند ہوگی، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

جس سند کو قاضی صاحب نے سند جید فرمایا ہے، اس کے اصل راوی اور سند کے بارے میں قاضی صاحب کے بیٹے طبقاتِ شافعیه کے مصنف کے جلیل القدر استاد امام الذہبی کا کہنا ہے: سیر اعلام النبلاء (ج1 ص358) کے الفاظ ہیں: في اسناده ليّن و هو منكر اس کی سند میں ایک کمزور راوی ہے اور وہ منکر ہے۔ یعنی اس کی روایت قبول نہیں کی جاتی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابراہیم بن محمد بن سلیمان کے بارے میں لکھا: فيه جهالة اس میں جہالت ہے۔ اور بلال رضی اللہ عنہ کا اختصاراً واقعہ نقل کرنے کے بعد فیصلہ دیا: هي قصة بينة الوضع۔ یہ قصہ من گھڑت ہونے کی واضح دلیل ہے۔

مترجم نے یہ کمال کر دکھایا کہ سند میں جو حصہ منکر تھا، اس کو حذف کر دیا۔

قاضی صاحب نے ایک اور راوی ایوب بن مدرک الحنفی کا ذکر فرمایا۔ جس کے بارے میں امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج1 ص293 رقم1100) اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان (ج1 ص610 رقم 1521) میں نقل کیا ہے کہ اس کے بارے میں ابن معین نے کہا: وہ کچھ بھی نہیں یعنی قابل اعتبار نہیں اور کبھی کہتے کہ وہ کذاب ہے۔ ابو حاتم اور نسائی کہتے کہ وہ متروک ہے۔ عقیلی نے کہا: وہ منکر روایات بیان کرتا ہے۔ جن کی اتباع نہیں کی جاسکتی۔ ابن حبان کا کہنا ہے: مکحول کے حوالے سے ایک من گھڑت نسخہ سے روایات بیان کرتا ہے۔ حالانکہ اس نے اس کو دیکھا نہیں۔

تهذيب تاريخ ابن عساكر (ج3 ص111) میں بھی ایوب بن مدرک الحنفی کے

بارے میں ائمہ رجال کے ویسے ہی اقوال منقول ہیں۔

بلال رضی اللہ عنہ کے حالات بیان کرتے ہوئے ابن عساکر نے ایسی بھی روایات نقل کی ہیں کہ صاحب تهذیب نے ان کو ضعیف اور موضوع ثابت کیا ہے۔ لہٰذا تاریخ ابن عساکر کی ان روایات کو قابل حجت مانا جائے گا کہ جو ائمہ رجال کے نزدیک صحیح ہوں گی۔ قاضی صاحب کی کتاب شفاء السقام کی زیادہ تر روایات مجروح، متروک، منکر ضعیف اور موضوع ہیں۔

قاضی صاحب کی دوسری شاہکار دلیل تابعین میں سے عمر بن عبدالعزیز کا شام سے قاصد کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام بھیجنا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنی کتاب کے تیسرے باب میں اس کو بے سند نقل کیا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک راوی عبداللہ بن جعفر، امام علی بن المدینی کے باپ اور امام بخاری کے استاد تھے۔ بیٹے نے باپ کو ضعیف اور امام نے اپنے استاد کو متروک الحدیث کہا۔ اس کی تفصیل پانچویں باب میں بیان ہو چکی ہے۔

قاضی صاحب نے چند مزید حوالے بھی دیے، جن میں سے ہر ایک کا ضعیف یا بے اصل ہونا راقم نے ثابت کر دیا ہے۔ تکرار سے بچنے کے لیے پڑھنے والوں کو پانچویں باب کو دیکھنا ہوگا۔ قاضی صاحب نے جھوٹ کی نسبت امام ابن تیمیہؒ سے کرتے ہوئے ذرا سا بھی خیال نہ کیا کہ خود انہوں نے اپنی کتاب میں بہت سی بے اصل جھوٹی روایات کو جمع کر دیا ہے۔ ظلم تو یہ ہے کہ ان کے جھوٹ ہونے سے وہ آگاہ تھے۔ امام ابن تیمیہؒ کی مخالفت میں انہوں نے وہ کچھ لکھ دیا جو ہرگز ان کے منصب کو زیب نہ دیتا تھا۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

مسجد قباء کی زیارت سے استدلال

امام ابن تیمیہؒ نے ابو محمد المقدسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور

دیگر انبیاء ﷩ کی قبور کی زیارت کے لیے سفر کا جواز نبی ﷺ کے مسجد قباء کی زیارت کے لیے تشریف لانے سے پیدا کیا۔ دیگر مساجد کے لیے سفر لا تشد الرحال کے تحت وہ مستحب نہیں سمجھتے تھے، بڑی سیدھی سی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف مسجد قباء کی زیارت کے لیے نہیں بلکہ اس میں نفل پڑھنے کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے، لیکن یَزُوْرُہٗ سے ابو محمد نے وہاں جانے کا مقصد زیارت سمجھ لیا، جبکہ بخاری (ص 159 اور مسلم ج 1 ص 448) میں ساتھ ہی مروی ہے: فَیُصَلِّیَ فِیْہِ رَکْعَتَانِ تاکہ آپ اس میں دو رکعتیں پڑھیں۔

اس کی تائید جامع الترمذی (باب ما جاء فی الصلوۃ فی مسجد قباء، ج 1 ص 68-67) میں اسید بن ظہیر سے مروی اس روایت سے ہوتی ہے کہ مسجد قباء میں پڑھی گئی نماز عمرہ کی طرح ہوتی ہے۔

سنن النسائی: فضل مسجد قباء و الصلوۃ فیہ (ج 1 ص 80) میں سہیل بن حنیف سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو گھر سے نکلا اور مسجد قباء میں آیا اور اس میں نماز پڑھی، وہ عمرہ کے برابر ہوگی۔

مسند احمد (ج 3 ص 487) میں وضاحت ہوتی ہے: نبی نے فرمایا: جس نے پورا اچھی طرح وضو کیا اور مسجد قباء آیا پھر اس میں دو رکعتیں پڑھیں تو اس کو ایک عمرہ کے برابر اجر ملے گا۔

قاضی السبکی نے امام ابن تیمیہؒ کے اس قول کو مبہم اور فاسد قرار دیتے ہوئے حسب عادت طویل بحث سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ لیث بن سعد اور بعض مالکیوں کے کلام کا تقاضا ہے کہ مساجد ثلاثہ کے علاوہ سفر بھی قربت ہے اور اجماع کا دعویٰ باطل ہے۔

قاضی تقی الدین السبکی کا حافظہ کمزور تھا یا وہ جدلیہ بحث میں ایمان رکھتے تھے۔ اللہ ہی ان کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف ان کی لکھی ہوئی تحریر کے

غلط تاثر کو زائل کرنا ہے تا کہ قرآن وسنت کی حقیقی تعلیم سے اہل ایمان آگاہ ہوں۔ امام ابن تیمیہؒ کا یہی مشن تھا۔ انہوں نے دنیا سمیٹنے کے بجائے اللہ کے حقیقی دین کی سربلندی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ متعدد بار قید ہوئے اور قید ہی میں وفات پائی۔

قاضی صاحب کی کتاب (عربی 123-122 اور اُردو ص 159-158) میں منقول ہے کہ صحیح مسلم کی شرح میں امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ مساجد ثلاثہ کے علاوہ رخت سفر باندھنے اور سفر کرنے کے بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ مثلاً نیک لوگوں کی قبروں پر جانے اور فضیلت والی جگہوں کے بارے میں ہمارے اصحاب میں سے شیخ ابو محمد نے فرمایا ہے کہ یہ سفر حرام ہے اور قاضی عیاض نے بھی اسی کے مختار ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

اس مذکورہ عبارت کے قائل نہ امام ابن تیمیہؒ ہیں اور نہ انہوں نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ یہ عبارت صحیح مسلم (ج 1 ص 433) کے حاشیہ سے قاضی تقی الدین السبکی نے خود نقل کی اور خود ہی امام نوویؒ کا جواب بھی نقل کردیا کہ ہمارے اصحاب یعنی شافعی علماء کے نزدیک صحیح وہ ہے جس کو امام الحرمین اور محققین نے اختیار کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایسا سفر نہ حرام ہے اور نہ ہی مکروہ ہے، بلکہ حدیث میں نفی سے مراد یہ ہے کہ پوری فضیلت تین مساجد کے سفر میں ہے۔

شافعی علماء میں اختلاف کی نشاندہی کرنے کے بعد امام الحرمین کے اختیار کردہ مذہب کو اپنا کر ان کے والد ابو محمد کی تحقیق کو ٹھکرا دیا گیا۔ جن محقق حضرات نے امام الحرمین کا ساتھ دیا، ان کے ناموں کا ذکر نہ کیا۔

امام نوویؒ نے اختلاف کا ذکر کرنے سے پہلے مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے قصد کرنے کی نذر کے بارے میں لکھا کہ ان کے لیے قصد کرنے کی نذر واجب نہیں اور نہ ہی اس قصد کی نذر لازم ہوگی۔ یہ ہمارا اور تمام علماء کا مذہب ہے۔ سوائے محمد بن مسلمہ

مالکی کے۔ان کا کہنا ہے کہ جس نے مسجد قباء کے قصد کی نذر مانی تو وہ اس پر لازم ہو جائے گی۔ کیونکہ نبی ﷺ ہفتہ کے دن پیدل یا سوار ہو کر اس میں جایا کرتے تھے۔

لیث بن سعد نے کہا: جس مسجد کا بھی قصد ہوگا، اس کی نذر لازم ہو جائے گی، لیکن جمہور کا مذہب ہے نہ وہ لازم ہوگی اور نہ ہی اس پر کوئی کفارہ ہوگا۔ جبکہ امام احمد کا کہنا ہے کہ اس پر قسم توڑنے والا کفارہ ہوگا۔

محمد بن مسلمہ کے مذہب کا تجزیہ کیا جائے تو وہ بھی درست نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نذر مان کر مسجد قباء نہیں جایا کرتے تھے اور نہ ہی صحابہ کو آپ ﷺ نے اس کا حکم دیا۔ جب آپ ﷺ بغیر نذر کے جاتے تو آپ ﷺ کے بعد نذر کا مسئلہ بنانے یا اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔

لیث بن سعد کے بارے میں امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج3 ص 423) میں لکھا ہے کہ وہ ثقہ اور ائمہ میں سے ایک امام تھے، لیکن یحییٰ بن معین نے کہا کہ وہ شیوخ سے روایت کرنے اور سننے میں تساہل کے مرتکب ہوا کرتے تھے۔

جمہور کا ذکر کر کے امام نوویؒ نے ان کی سوچ وفکر اور مذہب کی نفی کر دی۔

امام نوویؒ نے جو لکھا وہ قاضی صاحب کی سوچ کے مطابق نہ تھا، لہٰذا امام رافعی اور امام نووی کے بارے میں قاضی صاحب نے فرمایا: شرح مسلم کے علاوہ دوسری جگہ جو نقل کیا ہے، اس میں نیک لوگوں کی قبروں کا ذکر نہیں ہے۔ ان کا اس میں وہی مطلب ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔

امام نے فرمایا ہے: اگر کوئی شخص مسجد حرام کے علاوہ کسی اور مسجد میں جانے کی نذر مانے تو علمائے کرام کا کہنا ہے وہ لازم نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی مسجد کا قصد کوئی قربت نہیں اور جو قربت وعبادت مقصود نہ ہو اس کی نذر لازم نہیں ہوتی۔

میرے شیخ ان مساجد کے علاوہ کی طرف رخت سفر باندھنے سے منع کرتے تھے۔ اسی طرح رافعی نے کہا ہے کہ جس کسی نے ان تین مساجد کے علاوہ کسی مسجد کی طرف جانے کی نذر مانی تو وہ لازم نہیں ہوگی اور اسی طرح کی بات امام نوویؒ نے شرح مهذب میں کہی ہے۔ (عربی ص 123، اُردو ص 189)

قاضی صاحب نے امام رافعی اور امام نووی کی دوسری جگہ کا ذکر تو کر دیا، لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا کہ وہ کونسی کتاب میں مذکور ہے۔ اس کے بعد جو کچھ لکھا یا نقل کیا اس میں اپنے ہی موقف کی نفی کر دی۔ شفاء السقام میں اکثر حوالوں میں حق کو تسلیم کرتے ہوئے تاویلوں کا سہارا لیتے ہیں اور اس طرح تضادات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حقیقی محبت وعقیدت

سید الانبیاء محمد ﷺ سے حقیقی عقیدت ومحبت کا تقاضا ہے کہ آپ ﷺ نے جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا، ان کو کیا جائے اور جن سے منع فرمایا، ان سے بچا جائے۔ یہود و نصاریٰ نے اپنے نبیوں کی قبور کو مساجد بنا لیا۔ یعنی جو درجہ مساجد کا تھا، وہ قبروں کو دے دیا۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اپنی امت کو حکم دیا کہ تم میری قبر کو نہ مسجد بنانا ہے اور نہ ہی بت اور عید جیسا وہاں معاملہ کرنا ہے۔ مسجد کو اللہ کا گھر اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں اللہ کی بندگی وعبادت کی جاتی ہے...... اور زمین میں اس مقصد کے لیے سب سے پہلا گھر مکہ میں مسجد حرام کی صورت میں بنایا گیا، جس کو اہل اسلام کے لیے قبلہ بنا دیا گیا۔ تمام نبیوں نے ایک ہی بات کہی کہ تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، کسی نے کہا: میری زندگی میں یا میری موت کے بعد مجھے میرے اس مقام سے آگے کر دیا کہ جو مجھے اللہ نے عطا فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی حکم ارشاد فرمایا، لیکن قاضی السبکی نے اپنی کتاب

میں اہل اسلام کو وہی راہ دکھائی جو یہود و نصاریٰ نے اپنائی۔ جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان پر لعنت فرمائی۔

قبروں کی زیارت کے لیے سفر کی حرمت کی وضاحت

امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتویٰ میں وضاحت کی کہ جس نے یہ اعتقاد رکھا کہ انبیاء علیہم السلام اور صلحائے کرام کی قبروں کی زیارت قربت و عبادت ہے تو اس نے اجماع کی مخالفت کی اور جس نے اس اعتقاد سے ان کی طرف سفر کیا تو وہ حرام ہوگا۔ پھر اس کے حرام ہونے کی یوں مزید وضاحت کی کہ لا تشد الرحال کے ذریعے اس سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس ممانعت کا تقاضا ہے کہ اس کی خلاف ورزی حرام ہو اور زیارت کے سلسلے میں جو احادیث بیان کی گئی ہیں وہ بالاتفاق ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ اصحاب سنن میں سے کسی نے ان کو روایت نہیں کیا۔ نہ ہی کسی امام نے ان کو دلیل کے طور پر تسلیم کیا۔

امام ابن تیمیہؒ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ جو نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کے لیے سفر کرتا ہے تو وہ عبادت و طاعت ہی سمجھ کر کرتا ہے۔ ہاں اگر کسی اور مقصد سے کرتا ہے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں، وہ جائز ہوگا۔

امام ابن تیمیہؒ نے دو قولوں میں سے ایک قول کے حوالے سے حرمت کے بارے میں جو نقل کیا اس کی تائید شافعی ائمہ میں سے امام ابو محمد الجوینی، امام رافعی اور امام نووی سے خود قاضی صاحب نے بھی کر دی۔ قاضی عیاض نے اس کے مختار ہونے کا جو اشارہ دیا، اس کا بھی ذکر کر دیا۔

قاضی السبکی کا جواب

قاضی صاحب نے امام ابن تیمیہؒ کے اس قول کو بھی مبہم و فاسد قرار دیا اور طاعت و

قربت سمجھ کر سفر کرنے والے کی نادانی اور ناسمجھی سے تعبیر کرتے ہوئے حرمت کی نفی کر دی کہ وہ گناہگار نہ ہوگا۔

حالانکہ کسی بھی حکومت کے بنائے ہوئے قانون کی جب کوئی خلاف ورزی کرتا ہے تو قاضی اس کو سزا دیتا ہے۔ اگر مجرم سو بار کہے کہ وہ جرم اس کی نادانی یا ناسمجھی کی وجہ سے ہوا تو اس کی بات کو تسلیم نہیں کیا جاتا، لیکن قاضی صاحب سید الانبیاء ﷺ کے بنائے ہوئے قانون میں تاویل کے ذریعے گنجائش نکال دیتے ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی عبارت کو جذباتی رنگ دیتے ہوئے یہ لکھ دیا کہ ابن تیمیہؒ کے اس کلام سے واضح ہوا کہ وہ فرضی نہیں بلکہ مسلمانوں کا جو عمل ہے، اس کے متعلق بات کر رہے ہیں، لہٰذا ان کے خیال کے اعتبار سے سب کا یہ سفر باجماع المسلمین حرام ہے۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔ پھر ان کے نزدیک تمام زمانوں میں تمام مسلمان جو اطراف عالم سے زیارت کے لیے آتے ہیں، امر حرام کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ابن تیمیہ کا یہ کلام ظاہر کرتا ہے کہ وہ نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کرنے والوں کو گمرا اور معصیت کار سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی ایسی لغزش ہے کہ جس کا کوئی مداوا نہیں۔ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم)

شافعی قاضی کا شافعی قاضی کی تائید کرنا

امام ابن تیمیہؒ کی یہی وہ عبارت ہے جس کو قاضی تقی الدین علی بن عبد الکافی السبکی نے جذباتی رنگ دیا اور اسی کی وجہ سے شافعی قاضی نے امام ابن تیمیہؒ سے فتویٰ حاصل کر کے اس پر یہ نوٹ لکھا کہ ابن تیمیہؒ نے قطعی طور پر نبی ﷺ کی قبر کی زیارت اور انبیاء علیہم السلام کی قبور کی زیارت کو معصیت بالاجماع کہا ہے۔ حالانکہ یہ دو قولوں میں سے ایک قول تھا۔

قاضی السبکی نے اپنے ہم مسلک قاضی کی تائید میں پوری کتاب لکھ دی۔

قاضی صاحب نے امام ابن تیمیہ ؒ کے فتویٰ کا ذکر کرنے اور اس کا جواب لکھنے سے پہلے ہی ساڑھے چھ ابواب میں اپنے طور پر ثابت کر دیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر عین عبادت ہے، لہٰذا اسی بنیاد پر اس سفر کی نفی کرنے والوں کا سارا بوجھ امام ابن تیمیہ ؒ پر ڈال کر ان کے خلاف اہل علم کے جذبات کو غلط طور پر ابھارنے کی کوشش کی اور سید الانبیاء ﷺ کے ارشاد میں مرضی کی تاویل کر لی۔

اصل مسئلہ نیت کا ہے

معاملہ تو صرف نیت کا تھا اور اب بھی ہے۔ امام ابن تیمیہ ؒ تو ان کے ساتھ تھے کہ جن کا کہنا تھا کہ مدینہ طیبہ کی طرف جاتے ہوئے نیت مسجد نبوی کی ہونی چاہیے اور وہاں جا کر مسجد میں تحیۃ المسجد پڑھنے کے بعد قبر مبارک پر حاضر ہو کر درود و سلام کہنا چاہیے اور ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو بھی سلام کہنا چاہیے۔ بات تو بڑی معمولی سی تھی، لیکن امام ابن تیمیہ ؒ کے حاسدوں اور ان کے دشمنوں نے ان سے جو کیا، قاضی السبکی صاحب نے بھی اللہ کے خوف سے بے پروا ہوتے ہوئے مظلوم کی بجائے ظالموں کی تائید کر دی۔

امام ابن تیمیہ ؒ نے مباح سفر کی جو بات کہی، اس کو ناقابل بحث کہہ کر فیصلہ امام ابن تیمیہ ؒ کے خلاف دے دیا۔ حالانکہ یہی بحث کا بہترین نکتہ تھا کہ تین مساجد کے علاوہ سفر کی ممانعت میں دنیاوی لین دین، عزیز و اقارب سے ملاقات، حصولِ علم اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے ہونے والے سفر شامل ہیں۔ ایسے ہی کسی سفر کے لیے کوئی مدینہ آتا ہے تو اس کے لیے نبی ﷺ اور شہدائے احد کی قبور کی زیارت مستحب ہے۔ زیارت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ بلکہ طریقہ زیارت باعث اختلاف تھا۔

امام ابن تیمیہؒ کی یہ بات کہ زیارت قبر نبی ﷺ کے سلسلہ میں تمام احادیث ضعیف وموضوع ہیں۔ اس کے جواب میں قاضی صاحب نے لکھا کہ کتاب کے شروع میں ہم اس کا بطلان کر آئے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں راقم نے بھی ان کی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔

اصحاب سنن میں سے کسی نے ان کو روایت نہیں کیا اور نہ ہی کسی امام نے ان سے دلیل لی ہے۔ قاضی صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

امام مالکؒ کا قول

امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتویٰ میں لکھا۔ امام مالکؒ مدینہ کے سب سے بڑے عالم اور اس مسئلہ کو خوب سمجھنے والے تھے۔ وہ ''زُرْتُ قَبرَ النّبی (میں نے نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کی) کہنے کو مکروہ سمجھا کرتے تھے۔ اگر یہ لفظ ان کے زمانے میں مشروع و مستعمل ہوتا یا نبی ﷺ سے منقول ہوتا تو مدینہ کے عالم اس کو مکروہ نہ کہتے۔

امام احمدؒ اپنے زمانے میں سنت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ان سے جب زیارت کا مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے صرف اس حدیث کا حوالہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مجھ پر سلام بھیجتا ہے، اللہ مجھ پر میری روح لوٹا دیتا ہے تا کہ اس کے سلام کا جواب دوں۔ انہوں نے زیارت کے سلسلے میں کوئی اور حدیث بیان نہ کی۔

مؤطا امام مالک میں منقول ہے: عبداللہ بن عمر جب مسجد میں داخل ہوتے تو رسول اللہ ﷺ، ابوبکرؓ اور عمرؓ کو سلام کہتے تھے۔

قاضی صاحب کا جواب تھا: زُرْتُ سے کیا مراد ہے۔ ہم نے اس کی مراد باب چہارم میں سمجھا دی ہے۔ کیسا عجیب جواب ہے۔ قول امام مالک کا تھا، لیکن اس سے کیا

مرادتھی۔ وہ قاضی صاحب نے سمجھا دی۔ جبکہ امام مالک اوران کے درمیان صدیوں کا فرق تھا۔

''مشروع و مستعمل'' کے بارے میں ان کا کہنا تھا:

یہ بات تو بہت بے موقع ہے۔اس لیے کہ بحث لفظ میں نہیں بلکہ اس کے معنی میں ہے۔موطا امام مالك، مسند احمد اور سنن ابو داؤد میں جو کچھ اس سلسلے میں ہے، وہ ابن تیمیہؒ کے خلاف ہے۔ لَا تَتَّخِذُوا قَبْرِی عِیْدًا ''میری قبر کوعید نہ بنانا'' پر ہم پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں۔ یہود و نصاریٰ پر لعنت ہو، جنہوں نے نبیوں کی قبروں کو مساجد بنالیا۔ یہ حدیث بھی ابن تیمیہؒ کی دلیل نہیں کیونکہ ہم نے نبی ﷺ کی قبر کو مسجد نہیں بنایا۔ اگر زیارت کو مسجد بنانے پر قیاس کیا تو بالکل غلط ہے۔

قاضی صاحب کے جواب کی روشنی میں اولیاء اور مشاہیر کے مزاروں پر سالانہ عرسوں اوران کے علاوہ بھی جو کچھ ہوتا ہے، کیا وہ عید اور سجدہ گاہ بنانے سے کم ہے تو یہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کا نتیجہ ہے کہ سعودی حکومت آپ ﷺ کی قبر مبارک پر سختی سے ہر غیر شرعی عمل کو روکتی ہے۔ اگر یہ سختی ہٹ جائے تو قاضی صاحب کی تجویز کردہ راہ پر گامزن ہونے والے وہ میلہ لگائیں کہ دنیا میں اس کی مثال نہ مل سکے۔ جہاں قاضی صاحب نے گفتگو کی ہے وہاں اس کا جواب بھی اللہ کے فضل سے موجود ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول

امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتویٰ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول نقل کیا کہ اگر اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ کوئی آپ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس نماز پڑھے گا اور اس کو سجدہ گاہ بنالے گا۔ جس سے آپ کی قبر مبارک بت بن جائے گی۔ تو صحابہؓ آپ ﷺ کو حجرہ میں

دفن کرنے کے بجائے باہر میدان میں دفن کردیتے۔

قاضی صاحب نے فرمایا: یہ بات صحیح نہیں۔ کیونکہ صحابہؓ میں آپ ﷺ کو دفنانے کے بارے میں جب اختلاف ہوا تو ان کو حدیث سنائی گئی کہ انبیاء ﷺ جہاں فوت ہوتے ہیں وہیں دفن کردیے جاتے ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کو حجرہ میں دفن کردیا گیا اور یہ بات مشہور و معروف ہے۔

قاضی صاحب نے حضرت عائشہ ؓ کے قول کو ٹھکراتے ہوئے خیال نہ کیا کہ اس کی اصل بخاری (کتاب الجنائز باب مایکرہ من اتخاذ المسجد ص177) اور مسلم (کتاب المساجد: باب النهی عن بناء المسجد علی القبور ج1 ص 201) میں یوں موجود ہے:

نبی ﷺ نے اپنی اس بیماری میں فرمایا کہ جس میں آپ ﷺ فوت ہو گئے۔ یہود ونصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو کہ جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔
اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں آپ ﷺ کی قبر کو عام لوگوں کے لیے کھول دیتی یعنی اس کے پاس آنے کی اجازت دے دیتی۔ مجھے اس کا خطرہ ہے کہ کہیں اس کو سجدہ گاہ نہ بنالیا جائے۔

صحیح مسلم کے اسی باب میں یہ بھی مروی ہے:

آگاہ ہو جاؤ، تم سے جو لوگ پہلے تھے وہ اپنے نبیوں اور صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا کرتے تھے۔ تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔ بے شک میں تمہیں اس سے منع کر رہا ہوں۔

دفنانے کے وقت صحابہ کا فیصلہ اپنی جگہ، لیکن قبر مبارک کو حجرے میں بند رکھنا اس کی حکمت عائشہ ؓ نے خود بیان کر دی۔ صحیح مسلم کی روایت سے اس حکمت کی

مزید وضاحت ہو گئی کہ پہلے لوگوں نے قبروں کو مساجد کا درجہ دے رکھا تھا بلکہ ان کے نزدیک مساجد سے زیادہ اہمیت انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کی قبروں کی تھی۔ امت محمدیہ بھی ان کی راہ پر گامزن ہو چکی ہے۔ اس کے ذمہ دار قاضی السبکی جیسے حضرات ہیں۔

قبر کو عقیدت سے چھونا اور بوسہ دینا

قاضی صاحب نے فرمایا: ابن تیمیہؒ کا کہنا ہے کہ جب تک نبی ﷺ کی قبر مبارک مسجد سے جدا تھی تو کوئی صحابیؓ یا تابعی قبر کے پاس نماز پڑھنے یا اس کو چھونے یا دعا کرنے نہیں جایا کرتا تھا۔

قاضی صاحب نے اس کا کمال جواب دیا: ان کا فرمان تھا۔ اس پر ہم یہ کہتے ہیں کہ اس سے ابن تیمیہؒ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ زیارت کے یہی آداب ہیں۔ ہم بھی وہاں نماز پڑھنے اور قبر کو مسح کرنے سے منع کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بھی بالاجماع ممنوع نہیں ہے۔

ساری کتاب میں قاضی صاحب نے زیادہ تر یہی انداز اپنایا ہے۔ حق کی تائید بھی کرتے ہیں اور پھر اس کی تکذیب بھی کر دیتے ہیں۔ جس سے ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک قبر کے پاس نماز پڑھنا جائز ہے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔

جبکہ صحیح مسلم (کتاب الجنائز: باب فی النھی عن الجلوس علی القبور والصلوۃ الیھا ج1ص 312)، جامع الترمذی (کتاب الجنائز ج 1 ص 157) میں ابو مرثد الغنوی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نہ قبروں پر بیٹھو اور نہ ہی ان کی طرف نماز پڑھو۔

سبحان اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی طرف نماز نہ پڑھنے کا حکم فرمایا

مگر قاضی صاحب نے ان کے پاس اس کو بالاجماع جائز قرار دے دیا اور ایک عجیب قصہ بھی نقل کر دیا۔

ایک عجیب قصہ

قاضی السبکی کا کہنا ہے ابوالحسین یحییٰ بن حسن نے اپنی کتاب اخبار المدینہ میں لکھا ہے کہ مروان بن حکم آیا اور اس نے دیکھا۔ ایک شخص نبی ﷺ کی قبر سے چمٹا ہوا ہے۔ مروان نے اس کو گردن سے پکڑ کر قبر سے جدا کیا اور کہا تُو جانتا ہے کہ تُو کیا کر رہا ہے۔ وہ شخص مروان کی طرف متوجہ ہوا اور بولا:

میں جانتا ہوں کہ میں نہ پتھر کے پاس آیا ہوں اور نہ ہی اینٹ کے۔ میں تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ پھر وہ شخص بولا: دین پر اس وقت ماتم نہ کرو جب اس کے متولی اہل لوگ ہوں بلکہ اس وقت ماتم کرو جب نااہل متولی بنے ہوں۔

اس روایت کے جو راوی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

تجزیہ

قاضی صاحب نے یہ عجیب قصہ نقل کرتے ہوئے بالکل خیال نہ کیا کہ اسماء الرجال کی تمام کتابوں کے مطابق حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ ﷺ کے مدینہ میں میزبانِ اول تھے۔ ان کی وفات 51 یا 52ھ میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوئی جب وہ یزید بن معاویہ کی قیادت میں رومیوں سے جہاد کرنے قسطنطنیہ گئے ہوئے تھے۔

اسی طرح اسماء الرجال کی تمام کتابوں میں منقول ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی

وفات 58ھ میں ہوئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک حضرت عائشہ کے حجرہ میں تھی۔ جیسا کہ قاضی صاحب نے خود بھی تسلیم کیا ہے، لیکن اس عجیب قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حجرہ کے باہر کھلی جگہ میں تھی۔ جہاں ایک شخص اس سے چمٹا ہوا تھا اور مروان نے وہاں آکر اس کو گردن سے پکڑ کر قبر سے جدا کیا۔ راوی کا بیان ہے: وہ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں کوئی بھی ان کی اجازت کے بغیر قبر کی زیارت نہیں کر سکتا تھا اور ایسے عجیب واقعہ کے وقوع کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

ابو داؤد: (کتاب الجنائز: باب تسویة القبر ص 459) میں القاسم بن محمد بن ابی بکرؒ سے مروی ہے۔ میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے ماں! میرے لیے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے دونوں ساتھیوں کی قبریں کھول دیں۔ تو انہوں نے تینوں قبریں کھول دیں۔ وہ نہ زمین سے زیادہ اونچی تھیں اور نہ ہی زمین سے بالکل ملی ہوئی تھیں۔

قبر مبارک کو دیکھنے کے لیے بھتیجا اپنی پھوپھی سے اجازت لیتا ہے، لیکن قاضی صاحب کے نقل کردہ واقعہ میں ابوایوب انصاری قبر سے چمٹے ہوئے تھے اور مروان نے وہاں پہنچ کر ان کو گردن سے پکڑ لیا۔ قاضی صاحب نے خود بھی اقرار کیا کہ صحابہؓ اور تابعینؒ کا حجرہ میں نہ جانا انتہائی ادب و احترام کی وجہ سے تھا تو پھر عجیب و غریب واقعہ میں وہ احترام کہاں گیا۔

سند کے اعتبار سے بھی واقعہ کے راوی داؤد بن ابی صالح کے بارے میں ابن حبان نے کتاب المجروحین (ج 1 ص 355) میں لکھا ہے۔ وہ ثقہ راویوں سے موضوع روایات نقل کیا کرتے تھے۔ ہیثمی کا مجمع الزوائد (ج 5 ص 245) میں کہنا ہے: اس

میں کثیر بن زید ہے جس کو امام احمد وغیرہ نے ثقہ کہا ہے جبکہ امام نسائی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا۔

تاہم اس واقعہ میں بات سند کی نہیں بلکہ متن کی ہے جو حقیقت کے خلاف ہے۔

دعا کے لیے قبلہ رُخ ہونا

قاضی صاحب نے فرمایا: ابن تیمیہؒ کا کہنا ہے: صحابہؓ اور تابعینؒ جب نبی ﷺ کو سلام کرتے اور دعا کرتے تو قبلہ رو ہو کر کرتے تھے۔ قبر کی طرف منہ نہیں کرتے تھے۔

اس قول سے معلوم ہوا کہ ابن تیمیہؒ کو بھی اعتراف ہے کہ سلف صالحین سلام کے وقت دعا بھی کرتے تھے۔ رہی بات ان کا حجرہ میں داخل نہ ہونا تو یہ ادب کی وجہ سے تھا۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ وہ دعا کے وقت قبلہ رو ہوتے تھے تو اس سے زیارت یا سفر زیارت کا انکار ثابت نہیں ہوتا۔

تجزیہ

قاضی صاحب نے امام ابن تیمیہؒ کا قول نقل کرتے ہوئے ان کا یہ جملہ چھوڑ دیا کہ صحابہؓ اور تابعینؒ یہ سب کچھ مسجد میں کرتے تھے۔ قاضی صاحب امام ابن تیمیہؒ پر طنز کرتے ہوئے یہ بھی بھول گئے کہ ہر مسلمان جب فرض اور نفل نماز پڑھتا ہے تو آخر تشہد میں سلام کے ساتھ درود کی صورت میں نبی ﷺ کے لیے دعا بھی کرتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ قبلہ رو ہی ہوتا ہے۔ مساجد اور گھروں میں اہل اسلام کا یہی معمول ہوتا ہے۔ اسی طرح شرعی زیارت کرنے والا آپ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس سلام کہنے کے بعد جب آپ ﷺ پر درود بھیجتا ہے تو وہ آپ ﷺ کے لیے دعا ہی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا امت محمدیہ پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ نبی ﷺ پر درود وسلام بھیجنے والوں کو دس مرتبہ اللہ رحمت سے نوازتا ہے اور فرشتے اس کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ اس میں قبر مبارک کے قرب یا بُعد کی کوئی قید نہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ امام ابن تیمیہؒ کی مخالفت کرنے والے چند قاضی ہی تھے، جو امام ابن تیمیہؒ کی عوام میں مقبولیت اور ان کی علمی شہرت سے جلتے تھے۔ چنانچہ جب ان کو موقع ملا تو انہوں نے جھوٹے مقدمے میں ان کو الجھا کر قید کروا دیا اور ظلم کی انتہا یہ تھی کہ قید خانے میں ان کو ان کے اصل سرمایہ کا سبب بننے والے قلم و دوات اور کاغذات کے ساتھ ان کی کتابوں سے سرکاری حکم کے تحت محروم کر دیا گیا اور ان کا علمی سرمایہ شافعی قاضیوں کے قبضہ میں رہا۔

کیسی عبث بحث ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ انتہائی ادب کی بنا پر حضرت عائشہ ؓ کے حجرہ میں داخل نہ ہوتے اور قبر مبارک کے بجائے قبلہ رو ہو جاتے اور اگر ثابت بھی ہو جائے کہ وہ دعا کے وقت قبلہ رو ہوتے تھے تو اس سے زیارت کا انکار یا زیارت کے سفر کا انکار ثابت نہیں ہوتا۔

بات دعا میں قبلہ رو ہونے کی تھی، لیکن اس میں زیارت یا سفر زیارت کو شامل کر کے بحث کو الجھا دیا گیا۔ قاضی صاحب کو اس میں کمال حاصل تھا۔

کیسا جملہ ہے کہ اگر ثابت بھی ہو جائے۔ یعنی جو بات قطعی طور پر ثابت تھی۔ اس میں بھی اگر کی شرط ڈال دی۔ قاضی صاحب نے اسی انداز کو اپنی کتاب میں اپنایا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا سلام کے وقت بھی قبلہ رو ہونا

امام ابن تیمیہؒ کی یہ دلیل کہ امام ابو حنیفہؒ تو سلام کہتے ہوئے بھی قبر مبارک کے

بجائے قبلہ رو ہوا کرتے تھے...... اور یہ ایسی حقیقت تھی کہ اس کا انکار تو ممکن نہ تھا، لیکن قاضی صاحب نے اپنی عادت کے مطابق اس کو بھی الجھانے کی کوشش یوں فرمائی:

ابو اللیث سمرقندی نے فتاوی میں ایک حکایت میں جو حسن ابن زیاد کی حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ہے۔ یہی کہا ہے۔ سروجی حنفی کا کہنا ہے ہمارے نزدیک قبلہ رو کھڑے ہونا ہے۔

کرمانی نے کہا، شوافع وغیرہ نے کہا: دعا کے وقت پشت قبلہ کی طرف اور منہ قبر کی طرف ہونا چاہیے اور یہی امام احمدؒ کا قول ہے اور بعض حنفیہ نے کہا قبلہ رخ ہونے میں دو عبادتیں ادا ہوں گی۔ قبلہ رخ ہونا یہ بھی عبادت ہے اور دوسری دعا بھی۔

اکثر علماء کا قول ہے۔ دعا قبر کی طرف رخ کر کے مانگے۔ یہ بہتر ہے اور اس میں ادب بھی ہے۔ نبی ﷺ کے ساتھ زندوں کا سا معاملہ کرنا چاہیے اور بلاشک و شبہ زندہ کو سلام اس کی طرف رخ کر کے کیا جاتا ہے۔

تجزیہ

بات صرف امام ابوحنیفہؒ کی تھی کہ ان کا عمل کیا تھا، لیکن امام ابن تیمیہؒ کی تردید کرتے ہوئے قاضی صاحب نے الجھاؤ پیدا کر دیا اور اکثر علماء والے دعویٰ پر کوئی حوالہ بھی نہ دیا۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک میں صحابہؓ سلام تو آپ کی طرف رخ کر کے کہا کرتے تھے، لیکن دعا کے لیے اللہ کی طرف متوجہ ہوا کرتے تھے اور یہی آپ کا بھی اپنا معمول تھا۔ سنن الدارمی: کتاب الرقاق (ص375) اور مسند احمد (ج1 ص22، 47، 55) میں عمر فاروق سے مروی ہے:

لَا تُطْرُونِی كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارىٰ عيسىٰ بن مريم۔ میرے بارے

میں اس طرح کی مبالغہ آمیزی نہ کرنا کہ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کے بارے میں کی۔

یہ کیسی دلیل ہے کہ دعا اللہ سے کی جائے اور منہ قبر مبارک کی طرف ہو، حالانکہ طریقے اور سلیقے کی بات یہ ہے کہ جس سے مانگا جاتا ہے منہ اسی کی طرف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کی آسانی کے لیے وہ جہت بھی خود ہی مقرر کر دی۔ وہ بیت اللہ ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ﴿وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۱۴۴)﴾ جہاں بھی تم ہوا کرو اپنے چہروں کو اس کی یعنی بیت اللہ کی طرف کر لیا کرو۔ جبکہ قاضی صاحب نے اپنی ساری کتاب میں وہی راہ دکھائی ہے جو یہود و نصاریٰ نے اپنائی ہے۔ جس کو اختیار کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے سختی سے منع فرمایا۔

لفظ خاص کا ذکر

قاضی صاحب نے اعتراض برائے اعتراض کی روش کو اپناتے ہوئے یہ بھی فرما دیا۔

ابن تیمیہؒ کا یہ کہنا کہ: اکثر علماء نے کہا ہے کہ سلام کے وقت خاص طور پر قبر کی طرف منہ کر لے۔

اس پر قاضی صاحب نے یہ نکتہ نکالا کہ ''خاص'' کی قید کہاں مذکور ہے۔ اس کا حوالہ مطلوب ہے۔ حالانکہ یہ اعتراض وارد کرنے سے پہلے قاضی صاحب نے خود ہی لکھا ہے:

فَاِنَّ الْمَيِّتَ يُعَامَلُ مُعَامَلَةَ الْحَيِّ وَ الْحَيُّ يُسَلَّمُ عَلَيْهِ مُسْتَقْبِلًا فَكَذٰلِكَ الْمَيِّتُ۔ بے شک میت کے ساتھ معاملہ زندوں جیسا کیا جاتا ہے اور زندہ کو سلام اس کی طرف منہ کر کے کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی میت کا معاملہ ہے۔

قاضی صاحب بھول گئے کہ رسول اللہ ﷺ جنت البقیع میں مدفون صحابہ اور شہدائے

احد کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو جو دعا سکھائی اس میں بھی ایسا ہی منقول ہے کہ اہل قبور کو اسی طرح سلام کہا جائے۔ سلام بھی دعا ہے۔

قاضی صاحب کی کتاب (عربی ص126) میں صحیح مسلم کے حوالے سے مروی ہے:

قُوْلِی السَّلَامُ عَلٰی اَهْلِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُسْلِمِیْنَ یَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنَّا وَ الْمُسْتَاخِرِیْنَ وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَكُمْ لَاحِقُوْنَ۔

اردو ترجمہ ص162۔ یوں کہا کرو، اے اس آبادی کے ساکنو، مومنو، مسلمانو! تم پر سلام ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پہلے جانے والوں اور بعد میں جانے والوں پر رحم فرمائے اور ہم بھی ان شاء اللہ تعالیٰ تمہارے پاس پہنچنے والے ہیں۔

قاضی صاحب نے اعتراض وارد کرنے کے بعد وضاحت یوں فرمائی:

ہم کہتے ہیں کہ شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کے اکثر علمائے کرام سلام و دعا دونوں حالتوں میں قبر کی طرف رخ کے قائل ہیں جبکہ احناف کی مشہور کتابوں میں اس مسئلہ کا ذکر ہی نہیں ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ سے یہ روایت منقول ہے کہ ایوب سختیانی آئے اور قبر نبی ﷺ کے قریب پہنچے۔ قبر کی جانب منہ کیا اور قبلہ کی جانب ان کی پشت تھی۔ ابراہیم حربی نے اپنی مناسک میں لکھا ہے۔ قبلہ کی جانب پشت کرو اور قبر کے وسط کی طرف رخ کرو اور دعا پڑھو۔ اس کو آجری نے کتاب الشریعہ میں ذکر کیا ہے۔

جائزہ

قاضی صاحب نے یہاں بھی مغالطہ دیا ہے۔ حالانکہ سیدھی سی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر جب بھی کوئی آپ کو سلام کہتے ہوئے درود پڑھے گا اور قیامت کے روز مقامِ محمود اور وسیلہ وفضیلہ سے فائز ہونے کی آپ کے لیے دعا کرے گا تو اس کا

رخ قبر مبارک ہی کی طرف ہوگا۔ اکثر ائمہ کرام کا یہی قول ہے۔

اختلاف تو اپنے لیے دعا کرتے ہوئے رخ قبلہ کی طرف کرنے میں ہے۔ یعنی جب قبر مبارک کے پاس جانے والا اپنے اور اپنے عزیز و اقارب کے لیے دعا کرنے لگے تو پھر رخ اس کی طرف کرلے کہ جس سے مانگ رہا ہے جبکہ قاضی صاحب قبر مبارک ہی کی طرف رخ کرنے کو ترجیح دیتے تھے اور سلام و دعا کے سلسلہ میں جو حوالے انہوں نے دیے ہیں، ان میں مراد رسول اللہ ﷺ پر رحمتوں کے نزول کے لیے ہی دعا ہے۔ جیسے اہل قبور کے لیے دعا کی جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی چاہت پر جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ اور آپ کی امت کے لیے بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا تو مناسب اور حق یہی ہے کہ اس کی بندگی عبادت کرتے اور حاجات اس کی بارگاہ میں پیش کرتے ہوئے رخ اس کے مقرر کردہ قبلہ ہی کی طرف ہونا چاہیے۔

کتاب الشریعۃ

قاضی صاحب نے جس کتاب الشریعۃ کا حوالہ دیا ہے، اس کے مصنف الامام المحدث ابوبکر محمد بن حسین الاجری ہیں۔ جو بغداد کے محلّہ "الاُجُر" میں پیدا ہوئے۔ وہیں پروان چڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ 330ھ میں مکہ مکرمہ منتقل ہو گئے۔ وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ ان کی ولادت کے بارے میں بہت اختلاف ہے، لیکن وفات پر ائمہ کا اتفاق ہے کہ 80 سال کی عمر میں 360ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

اتفاق سے ان کی کتاب الشریعہ کے تین حسب ذیل ایڈیشن میرے پاس موجود ہیں۔ ایک دار ابن حزم، بیروت کا مطبوعہ 726 صفحات پر مشتمل ہے جو تخریج اور اسناد کی تحقیق کے بغیر ہے۔ اگرچہ بعض احادیث کے حوالے منقول ہیں۔

دوسرا دار الدلیل الاثریۃ، السعودیۃ کا شائع کردہ ہے۔ جس کے 847 صفحات ہیں اور اس میں روایات کی تخریج بھی کی گئی ہے۔

تیسرا دار الوطن، ریاض، سعودی عرب کا مطبوعہ چار جلدوں میں ہے۔ اس میں تخریج کے ساتھ اسناد کی تحقیق بھی موجود ہے اور اس کے محقق ڈاکٹر عبداللہ بن عمر بن سلیمان الدمیجی ہیں۔ جنہوں نے کتاب الشریعہ کی خوبیوں کے ساتھ اس میں پائی جانے والی کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ امام موصوف کے زمانے کے پُرفتن حالات پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے۔

کتاب الشریعہ کے 261 ابواب میں 2075 روایات منقول ہیں، لیکن امام بخاری سے صرف ایک حدیث (رقم، 917) لی گئی ہے۔ جو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہنم خواہشات سے اور جنت تکالیف سے چھپا لی گئی ہے، یعنی ان کی ظاہری صورت وہ نہیں جو دکھائی دیتی ہیں۔

امام مسلم، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ سے ایک بھی روایت کتاب الشریعہ میں موجود نہیں۔ صحیح اور مرفوع احادیث کے ساتھ بہت سی ضعیف و موضوع روایات کو امام محمد بن حسین الآجُرّی نے نقل کر دیا ہے حالانکہ وہ ثقہ و صدوق تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ محدثین کی کتابوں میں بھی ضعیف و موضوع روایات منقول ہیں کیونکہ وہ زمانہ ایسا تھا کہ فن حدیث کا حق ادا کرنا بہت مشکل تھا اور کتابوں کی وہ بہتات نہ تھی جو موجودہ زمانہ میں اللہ نے کر دی ہے۔ لہٰذا اب کسی محدث و امام کو دوش دیے بغیر ضعیف و موضوع روایات کو ترک کر کے صحیح و مرفوع کے مطابق عمل کرنا چاہیے کیونکہ ضعیف احادیث اور تاویلوں کا سہارا لینے سے دینی فلاح کا حصول ممکن نہیں، بلکہ بدعات و خرافات کی راہیں کھلتی ہیں۔

امام ابوبکر محمد بن حسین الآجری اور امام ابوعبداللہ عبیداللہ بن محمد ابن بطہ العکبری دونوں کا زمانہ تقریباً ایک ہی تھا۔ اگرچہ الآجری کی وفات 360ھ میں اور ابن بطہ کی 387 میں ہوئی اور دونوں کی کتابیں بنیادی طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنے، جماعت کو لازم رکھنے، بدعات وخرافات سے بچنے اور قرآن وسنت کے مطابق عمل کرنے کے بارے میں ہی ہیں۔

قاضی صاحب نے عمر بن عبدالعزیز کے سلام بھیجنے کا تذکرہ بلاشبہ متعدد بار کیا ہے جبکہ کتاب الشریعہ (حدیث رقم 107) اور الابانة: (حدیث رقم 99) کے مطابق عمر بن عبدالعزیز نے لوگوں کی طرف لکھا: لَا رَأْیَ لِاَحَدٍ مَعَ سُنَّةٍ سَنَّھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ۔ جو کام رسول اللہ ﷺ نے سنت بنایا، اس سنت کے مقابلے میں کسی کی رائے کی کوئی حقیقت نہیں۔

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل قبور کی زیارت اور ان کے لیے دعا وسلام کرنے کا جو طریقہ آپ ﷺ نے بتایا وہ صحیح اور درست ہے۔ اس کے مطابق عمل ہوگا تو عنداللہ مقبول ہوگا۔ اگر اس طریقہ کے علاوہ کوئی طریقہ اپنایا جائے گا تو وہ بدعت ہوگا اور ہر بدعت گمراہی کا سبب ہوگی اور ہر گمراہی جہنم میں لے جائے گی۔

کتاب الشریعة کے باب الحث علی التمسك بکتاب اللّٰہ عز و جل و سنة رسول اللّٰہ ﷺ و سنة اصحابه رضی اللّٰہ عنھم و ترك البدع و ترك النظر و الجدال فیما یخالف فیه الکتاب و السنة و قول الصحابة رضی اللّٰہ عنھم (اللہ عزوجل کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت اور صحابہؓ کے طریقہ کو مضبوطی سے تھامے رکھنے اور اس بدعت ونظر اور جدال کو ترک کرنے، جس میں کتاب وسنت اور صحابہؓ کے طریقہ کی مخالفت ہو، کے بارے میں ابھارنے والا باب) میں جابرؓ بن عبداللہ سے

مروی ہے:

رسول اللہ ﷺ اپنے خطبۂ مبارکہ میں اللہ عزوجل کی وہ حمد کہ جس کا وہ اہل ہے، بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کرتے تھے:

مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَا هَادِیَ لَهٗ۔ اَصْدَقُ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَ اَحْسَنُ الْهَدْیِ هَدْیُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَ شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَکُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَّ کُلُّ بِدعَةٍ ضَلَالَةٌ وَّ کُلُّ ضَلَالَةٍ فِی النَّارِ۔

جس کو اللہ ہدایت سے نواز دے، اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو (اس کے اعمال کی بنا پر) وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ سب سے سچی حدیث اللہ عزوجل کی کتاب ہے اور سب سے بہترین راہ محمد ﷺ کی راہ ہے اور بدترین امور دین میں کوئی نئی بات پیدا کرنا ہے اور ہر نئی پیدا کردہ بات یا کام بدعت ہوگا اور ہر بدعت گمراہی ہوگی اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے کا سبب ہوگی۔

یہ حدیث سنن النسائی (ج 1 رقم 1579 ص 188) میں بھی منقول ہے۔ امام مسلم، امام ابن ماجہ اور امام احمد بن حنبل نے بھی اس کو الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ نقل کیا ہے۔

کتاب الشریعة کے اسی باب میں عرباضؓ بن ساریہ کے حوالے سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا، عنقریب وہ بہت اختلاف دیکھے گا، پس اس وقت تم میری سنت اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کو لازم رکھنا۔ اس پر خوب مضبوطی سے قائم رہنا اور دین میں نئے نئے کام نکالنے سے بچنا، کیونکہ دین کے

مکمل ہونے کے بعد ہر نیا کام بدعت ہوگا اور ہر بدعت گمراہی ہوگی۔

اس حدیث کا بھی ذکر مسند احمد (ج 4 ص 127-126) میں موجود ہے۔

اس حدیث سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ آپ نے صحابہؓ اور اپنی امت کو سنت کے مطابق عمل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اسی حکم کے تحت صحابہ میں کوئی بھی وہ کام نہیں کیا کرتا تھا جس کی راہ قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی نے تاویلوں اور ضعیف وموضوع روایات کا سہارا لیتے ہوئے اپنی کتاب میں دکھائی ہے۔ یہ راہ یقینی طور پر اہل غلو کی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِیَّاکُمْ وَ الغُلُوَّ فِاِنَّمَا اَھلَکَ مَنْ کَانَ قَبلَکُمُ الغُلُوُّ

غلو سے بچو کیونکہ جو تم سے پہلے تھے ان کو غلو نے ہلاک کر دیا۔

غلو سے مراد کسی کی شان ومقام کو اصل حد سے بڑھا دینا ہے۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں نے عقیدہ بنا لیا کہ وہ اللہ کے بیٹے یا خود ہی اللہ یا تینوں میں سے ایک تھے۔ انسانیت کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے سولی پر (نعوذ باللہ) چڑھ گئے۔ مرنے کے تین دن بعد زندہ ہوئے اور آسمان پر جا کر اللہ کے دائیں جانب بیٹھ گئے۔

اس عقیدے کا پہلا حصہ تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی قرآن حکیم میں بیان فرمایا ہے اور دوسرا پطرس کے پہلے خط کے باب 3 کی آیت 22 ہے۔

ضعیف روایات کی مثال

عجیب بات یہ ہے کہ امام محمد بن حسین الآجری نے بھی اپنی کتاب الشریعہ کے باب 104 ذکر ما خص عزوجل به النبی ﷺ من المقام المحمود یوم القیامة" میں عیسائیوں کے عقیدہ کے دوسرے حصہ سے ملتی جلتی روایت نقل کر دی جو پانچ مختلف

طرق سے لیث عن مجاہد سے مروی ہے۔ جبکہ لیث بن ابی سلیم کے بارے میں امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج 3 ص 460 رقم 6997) میں یحییٰ اور نسائی سے نقل کیا ہے کہ وہ ضعیف راوی تھا۔

ابن معین کا کہنا ہے: لیث عطاء بن السائب سے زیادہ ضعیف تھا۔

مؤمل بن الفضل کا قول ہے: میں نے عیسیٰ بن یونس سے لیث بن ابی سلیم کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا: میں نے دیکھا، اس کا معاملہ خلط ملط ہو گیا تھا۔ میں کئی مرتبہ اس کے پاس سے گزرا۔ وہ دن چڑھے منارے پر اذان دے رہا ہوتا۔

پانچ روایات میں محمد بن حسین الآجری نے سورۃ الاسراء کی آیت 79 ﴿عَسٰٓی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا﴾ (قریب ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر پہنچائے) کو نقل کرنے کے بعد مقامِ محمود کی تفسیر لیث عن مجاہد سے یہ نقل کی ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ اپنے عرش پر بٹھائے گا۔

حالانکہ اس روایت سے پہلے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد شفاعت ہے۔ یعنی آپ لوگوں کے لیے شفاعت کریں گے اور اللہ کی طرف سے آپ کو اجازت ملے گی۔

کتاب الشریعہ کی حدیث 1098 میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس سے مراد شفاعت ہے۔

اسامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ ہیں: هُوَ الْمُقَامُ الَّذِیْ یَشْفَعُ فِیْهِ لِاُمَّتِهٖ۔ یہ وہ مقام ہوگا کہ جہاں آپ اپنی امت کی شفاعت فرمائیں گے۔

یہ روایت مسند احمد (ج 2 ص 528-441) اور جامع الترمذی (رقم 3358) میں بھی مذکور ہے۔ محمد حسین الآجری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ مبارک کے

مقابلے میں لیث اور مجاہد والی روایت کو ترجیح دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں غلو کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

* محمد بن حسین الآجری کے زمانے میں بعض نے یہ بھی کہہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابو بکر اور عمر مدفون نہیں ہیں۔ ان کا رد کرتے ہوئے انہوں نے یہ روایت بھی نقل کر دی۔ جو حدیث 1861 کا حصہ ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے۔ جب ان کی موت کا وقت آیا تو انہوں نے (لواحقین) سے کہا: جب میں مر جاؤں اور دفنانے کے لیے تم مجھے تیار کر چکو تو مجھے اس گھر کے دروازے کے پاس لے جانا جس میں نبی ﷺ کی قبر مبارک ہے۔

دروازے کے پاس کھڑے ہو کر کہنا، اللہ کے رسول! آپ پر سلامتی ہو۔ یہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اندر آنے کی اجازت چاہ رہے ہیں۔ اگر تمہیں اجازت مل گئی اور دروازہ کھولا گیا، جو بند تھا تو مجھے اندر داخل کر کے دفنا دینا۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق لواحقین نے ویسے ہی کیا۔ جب ان کی میت کو لے کر دروازے کے پاس آئے تو انہوں نے دیکھا، تالا گر گیا اور دروازہ کھل گیا۔ ایک ہاتف کی اندر سے آواز آئی۔ حبیب کو حبیب کے پاس لے آؤ۔ حبیب حبیب کا مشتاق ہے۔

کتاب الشریعة کے محقق عبداللہ بن عمر بن سلیمان الدمیجی کا تبصرہ ہے کہ یہ ایسی روایت ہے کہ نہ اس کی کوئی نکیل ہے اور نہ کوئی لگام۔

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ ابو بکر کی بیٹی کا گھر تھا اور بیٹی کے گھر کے بارے میں جو روایت منقول ہے۔ ذرا سی عقل رکھنے والا انسان اس کو قبول نہیں کرے گا۔

محمد بن حسین الآجری نے اپنی کتاب کے باب 18 میں یہ روایت بھی نقل کر دی:

بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق سے ایک ہزار سال پہلے طٰہٰ اور یٰسین پڑھیں۔ فرشتوں نے جب قرآن سنا تو انہوں نے کہا: برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اس امت پر کہ جس پر یہ نازل ہوگا۔ برکتیں اور رحمتیں ہوں گی ان زبانوں میں کہ جن میں یہ پڑھا پڑھایا جائے گا۔ برکتیں اور رحمتیں ہوں گی ان سینوں میں جو اس کو حفظ کر کے اٹھائے پھریں گے۔

ابن عدی اور العقیلی نے اپنی کتاب الضعفاء میں ابراہیم بن مہاجر بن مسمار عن عمر بن حفص بن ذکوان کے طریق سے روایت کیا ہے: یہ روایت نہ صرف ضعیف بلکہ موضوع ہے۔ امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج1 ص 67، رقم 223) میں امام بخاری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ وہ منکر الحدیث ہے۔ امام نسائی کا کہنا تھا کہ وہ ضعیف ہے۔

امام ابن حبان کا قول ہے: قرأ طٰہٰ و یٰسین یہ متن من گھڑت موضوع ہے۔

اس موضوع روایت کے دوسرے راوی عمر بن حفص بن ذکوان کے بارے میں میزان الاعتدال (ج3 ص 189 رقم 6075) میں امام احمدؒ سے منقول ہے۔ ہم نے نہ صرف اس کی حدیث کو چھوڑ دیا بلکہ جلا دیا۔ یعنی وہ اس قابل ہی نہ تھی کہ اس کو روایت کیا جاتا۔

امام نسائی نے اس کو متروک اور الدارقطنی نے ضعیف کہا۔

ایسے ہی اور بھی بہت سی ضعیف وموضوع روایات کتاب الشریعة میں مذکور ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر ان شاء اللہ آگے ہوگا۔

معز الدولہ کا بدعات کو رائج کرنا

البدایة والنهایة (ج11 ص 173) میں حافظ ابن کثیر نے بنی بویہ کی ابتدا کا ذکر

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک محتاج وفقیر مچھلیوں کا کام کرنے والے ابوشجاع کے تین بیٹے تھے، جو فارسی الاصل تھے۔ وہ اپنی عسکری قابلیت کی بنا پر ترقی کرتے ہوئے اتنے طاقتور ہوگئے کہ انہوں نے بغداد پر قبضہ کرلیا اور انہی کے حکم سے تمام معاملات طے ہوتے اور انہی کی طرف حکومتی آمدنیوں کا رخ ہوگیا۔

ان میں سے ایک عماد الدولہ ابوالحسن بن علی، دوسرا رکن الدولہ ابوعلی حسن اور تیسرا معزالدولہ ابوالحسین احمد تھا۔ جس نے بغداد پر قبضہ کرکے خلیفہ مستکفی باللہ کی 334ھ میں بیعت کرلی۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کو معزول کرکے اس کی آنکھیں نکلوادیں اور مطیع اللہ کی بیعت کرلی۔

حافظ ابن کثیر کے مطابق اس وقت خلافت کا معاملہ بالکل کمزور ہوچکا تھا۔ خلیفہ کے پاس کوئی اختیار نہ تھا۔ کل اختیارات کا مالک معزالدولہ بن بویہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بنوعباس نے علویوں سے حکومت چھینی ہے۔ لہٰذا وہ علویوں کی طرف پھر سے حکومت لوٹانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ متعصب رافضی ہونے کے ناتے اسلامی تاریخ میں پہلی بار 352ھ میں اسی کے حکم سے عاشورہ کے دن بازار بند کردیے گئے۔ عورتیں بالوں کے کمبل پہن کر ننگے سر، بالوں کو کھول کر چہروں پر طمانچے مارتی ہوئی سرعام نوحہ کرتی رہیں۔ شیعہ کے غلبہ کی بنا پر اہل سنت کے لیے ان کو روکنا ممکن نہ رہا۔

وہی تھا جس نے غدیر خم کو عیدین کی طرح منانے، رات کو بازار کھلے رکھنے، ڈھول باجے بجانے اور فوجیوں کے دروازوں پر چراغاں کرنے کا حکم دیا۔ اسی نے کھیل تماشوں اور بے حیائی کو فروغ دیا۔

اسی کے دورِ حکومت میں بغداد وحلب کی مساجد کے دروازوں پر صحابہؓ کی شان میں انتہائی گستاخانہ نعرے لکھے گئے۔ جس کی وجہ سے کئی مرتبہ شیعہ سنّی فسادات ہوئے جن

میں بہت سی جانوں کا نقصان ہوا۔

اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی کو قاضی یا محتسب مقرر کرنے پر حکمران نے رشوت لی۔ تاریخ الکامل (ج6 ص360) اور البدایۃ النہایۃ (ج11 ص237) میں منقول ہے۔ 350ھ میں قاضی ابوسائب عتبہ بن عبداللہ کی وفات ہوئی کہ اس کی جائیداد پر قبضہ کرلیا گیا۔ اس کے بعد ابوعبداللہ الحسین بن ابی الشوارب کو اس شرط پر قاضی بنایا گیا کہ وہ ہر سال معزالدولہ کو دو ہزار درہم ادا کیا کرے گا۔ معزالدولہ نے اس کو خلعت سے نوازا اور ڈھول باجے بجا کر اس کو اس کے گھر پہنچایا۔ وہ پہلا شخص تھا کہ جس نے قاضی بننے کے لیے رشوت دی۔ خلیفہ مطیع اللہ اسی وجہ سے اس سے ناراض تھا اور اس نے قاضی کو اپنے پاس آنے اور سواری کے ساتھ چلنے کی اجازت نہ دی۔

اس کے بعد معزالدولہ نے پولیس اور محتسبوں سے بھی رشوت لینی شروع کر دی۔

مہنگائی اور رومی غلبہ کا عذاب

اللہ تعالیٰ کا قانون ایسا ہے کہ قوم جب باہمی خانہ جنگی میں مصروف ہو جائے، بزرگوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنائے، اخلاقی قدریں تباہ ہو جائیں، برائی بے حیائی اور رشوت کا بازار گرم ہو جائے۔ حکمران عوامی مفاد کے بجائے ذاتی مفادات کے تحفظ میں لگ جائیں۔ دین حق کو مسخ کر دیا جائے۔ عدل وانصاف کا تصور معدوم ہو جائے۔ ظلم و زیادتی عام ہو جائے تو اللہ اس قوم کو دو عذابوں میں مبتلا کرتا ہے۔

پہلا عذاب معیشت کی تباہی کی صورت میں آتا ہے۔ خوراک کا حصول مشکل ہو جاتا ہے۔ ملے تو اس کا خریدنا ممکن نہیں ہوتا۔ اموات عام ہو جاتی ہیں۔ حلال حرام کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ جس کو جو ملتا ہے، کھا جاتا ہے۔

یہی حال معز الدولہ، سیف الدولہ اور ناصر الدولہ کی حکمرانی میں اہل اسلام کا ہوا۔ غلہ کی گرانی بہت زیادہ ہوگئی۔ لوگ مردار اور حرام جانور کھانے پر مجبور ہو گئے۔

دوسرا عذاب رومی بادشاہ نقفور دمستق کا شامی علاقوں پر حملے کر کے غالب آنا تھا۔

البدایۃ النہایۃ (ج 11 ص 243) کے الفاظ ہیں:

تمام بادشاہوں میں سے یہ ملعون سب سے زیادہ سخت دل، سختی سے کفر پر ڈٹا رہنے والا، سب سے زیادہ طاقتور اور مسلمانوں سے مقابلہ کرنے والا تھا۔ اس نے طاقت کے زور پر مسلمانوں سے بہت سے ساحلی علاقے چھین لیے اور ان کو اپنی مملکت کا حصہ بنالیا تھا۔ بیت المقدس پر بھی قبضہ اسی نے کیا تھا۔ اسلام کے دشمنوں کے تسلط کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کردی گئی۔

اس کا سبب اس زمانے والوں کی کوتاہی، بدعات قبیحہ کا ظہور پذیر ہونا، عام وخاص کا معاصی میں ڈوب جانا، رافضیوں کا غالب آ کر وہاں کے اہل سنت پر بے دردی کے ساتھ ظلم کرنا تھا۔

اس ملعون نے اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جس شہر میں داخل ہوتا وہاں کے باشندوں کو قتل کرتا، عورتوں اور بچوں کو قیدی بناتا، جامع مسجد کو گھوڑوں کا اصطبل بنالیتا۔ منبر کو توڑ کر اذان کی جگہ کو پامال کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے خود اس سے بدلہ لیا اور اس کی بیوی کو اس پر مسلط کردیا، جس نے باندیوں کی مدد سے گھر کے عین درمیان میں اس کو قتل کردیا۔

اس لعین نے خلیفہ کی طرف ایک قصیدہ بھجوایا جس میں اس نے دھمکی دی کہ وہ نہ صرف اسلامی ممالک پر قبضہ کرلے گا بلکہ حرمین شریفین کا بھی وہی مالک ہوگا۔

قصیدہ بہت طویل تھا، جس کا جواب محمد بن حزم نے خوب اچھی طرح دیا۔ جو البدایۃ

النہایۃ کی (جلد 11 کے صفحات 244 تا 252) میں حافظ ابن کثیر نے نقل کر دیا ہے۔

قرامطہ کا ظلم

حافظ ابن کثیر نے 317ھ کے واقعات میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسی سال عراقی باشندے اپنے امیر منصور دیلمی کی ماتحتی میں خیروعافیت سے مکہ مکرمہ پہنچ گئے تھے اور چاروں اطراف سے لوگ حج کے لیے جمع ہو رہے تھے کہ سات ذوالحجہ کو قرامطیوں نے بھی وہاں پہنچ کر لوگوں کو لوٹنا اور قتل کرنا شروع کر دیا۔ مکہ کی گلیوں، بازاروں اور خانہ کعبہ میں قتل عام ہو رہا تھا اور ان کا امیر ابو طاہر خانہ کعبہ کے دروازے پر بیٹھا یہ وحشیانہ منظر دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا "میں ہی اللہ ہوں۔ میں ہی مخلوق تخلیق کرتا ہوں اور میں ہی اس کو فنا کرتا ہوں۔"

اس قرامطی امیر کے حکم سے بیت اللہ کا غلاف اتار کر چاک کر دیا گیا۔ حجر اسود کو اس کی جگہ سے اکھیڑا گیا۔ اکھیڑنے والا کہہ رہا تھا: کہاں گئے ﴿طَيْرًا اَبَابِيْلَ اور حِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ بیت اللہ کی حرمت کو پامال کرنے اور حجاج کرام کا خون بہانے کے بعد حجر اسود کو اپنے ساتھ لے گئے۔ جو 22 سال ان کے پاس رہا اور 339ھ میں انہوں نے واپس دیا۔

قرامطہ کے بارے میں البدایۃ و النہایۃ (ج 11 ص 61) 378ھ میں منقول ہے کہ یہ زندیقوں اور ملحدوں کا ایک فرقہ تھا جو فارس کے فلاسفہ کی اقتداء کرتے ہوئے زرتشت اور مردک کو مانتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دونوں محرمات کو حلال کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہر کس و ناکس کو ماننے لگ گئے۔

دراصل رافضیوں نے ان کو گمراہ کیا اور ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ قرمط بن

الاشعث کی طرف منسوب ہونے کی بنا پر اُن کا نام قرامطہ پڑ گیا۔

ان کا دوسرا نام اسماعیل الاعرج بن جعفر الصادق کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اسماعیلیہ مشہور ہو گیا۔

ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے لیڈر نے ان کو دن میں پچاس نمازیں پڑھنے کا حکم دیا۔ تا کہ اس کا مکروفریب پوشیدہ رہے اور اس نے بارہ خلیفے مقرر کر دیے اور اپنے ماننے والوں کے لیے کچھ اصول وضوابط بھی بنا دیے۔

ان کا تیسرا نام باطنیہ مشہور ہے۔ کیونکہ وہ اپنے رفض کو ظاہر کرتے اور اپنے کفر کو چھپاتے تھے۔ ان کا چوتھا نام جرمیہ یا بابکیہ ہے، کیونکہ بابک جرمی سے بھی ان کی نسبت رہی تھی۔ البدایۃ (ج 11 ص 62) میں ابن جوزی کے حوالے سے فرقہ بابکیہ کے بارے میں یہ بھی منقول ہے کہ اس میں اب بھی ایک جماعت ایسی ہے جس کے مردوں اور عورتوں کا سال میں ایک رات ایسا مخلوط اجتماع ہوتا ہے کہ جس میں روشنی بجھا دی جاتی ہے اور جس کے ہاتھ جو عورت لگتی ہے اس سے وہ زنا کاری کرتا ہے اور اس کو حلال شکار کا نام دیتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

ان کا پانچواں نام بنو عباس کی مخالفت کرتے ہوئے لال رنگ کو شعار بنانے کی وجہ سے محمرہ مشہور ہو گیا۔

ان کا چھٹا نام اپنی تعلیم دینے کی وجہ سے تعلیمیہ شہرت پا گیا۔

ان کا ساتواں نام سبعیہ اس لیے پڑ گیا کہ ان کا عقیدہ تھا۔ نظام عالم کو چلانے والے ستارے ہی ہیں۔ جن میں سے پہلے آسمان میں قمر، دوسرے میں عطارد، تیسرے میں زہرہ، چوتھے میں شمس، پانچویں میں مریخ، چھٹے میں مشتری اور ساتویں میں زحل ستارہ ہیں۔

ابن الاثیر نے بھی 278ھ کے واقعات میں قرامطہ کے عقائد کا ذکر کیا ہے۔ ان کے جو بھی عقائد تھے وہ یقیناً اسلامی تعلیم کے خلاف تھے اور بیت اللہ کی حرمت کو جس طرح انہوں نے پامال کیا اور مسلمانوں کا خون بہایا اور حجر اسود کو 22 سال اپنے پاس رکھا۔ یہ ان کی اسلام دشمنی کی واضح دلیل ہے۔

کتاب الشریعہ کا پس منظر

امام ابوبکر محمد بن حسین الآجری کی ساری زندگی مذکورہ حالات میں گزری۔ اسی لیے ان کی کتاب میں بہت سی روایات ضعیف و موضوع ہیں۔ اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس درود و سلام کہنے کا جو طریقہ ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ کتاب الشریعہ میں مذکور نہیں۔ درود و سلام دونوں ہی آپ کے لیے دعا کی صورتیں ہیں۔ لہٰذا دونوں ہی صورتوں میں درود و سلام کہنے والے کا رخ قبر مبارک ہی کی طرف ہونا چاہیے، لیکن اپنے لیے دعا مانگتے ہوئے اللہ کے مقرر کردہ قبلہ کی طرف کر لینا ہی رسول اللہ ﷺ کی سنت مبارکہ ہے۔ قاضی صاحب نے بھی اس کو رد نہیں کیا، بلکہ حسن فرمایا ہے۔

کتاب المستوعب

قاضی السبکی صاحب نے امام ابن تیمیہؒ کے اس قول کا بھی رد کیا ہے کہ ائمہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں تھا کہ دعا کے وقت قبر مبارک کی طرف منہ کیا جائے۔ قاضی صاحب کا فرمان ہے کہ یہ غلط ہے اور ان کا کہنا ہے۔ اس کے متعلق ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ابوعبداللہ سامری حنبلی جو المستوعب فی مذھب احمد کے مؤلف ہیں، انہوں نے کہا ہے کہ قبر کی طرف منہ سامنے رکھے اور قبلہ کی جانب پشت کرے اور منبر نبی کو بائیں

ہاتھ کی جانب کرے۔ پھرانہوں نے سلام ودعا کی تفصیل بیان کی ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سلام ودعا دونوں ہی حالتوں میں قبر کی طرف منہ کرنے کے قائل تھے۔

جائزہ

امام ابن تیمیہؒ نے ان ائمہ کرام کے حوالے سے بات کی تھی جن کو خیر القرون میں ائمہ امت تسلیم کرلیا گیا تھا،لیکن قاضی صاحب نے جس بزرگ ابوعبداللہ سامری کا حوالہ دیا۔ان کی پیدائش بغداد کے قریب سامراء میں 535ھ میں ہوئی اورانہوں نے 616ھ میں وفات پائی۔انہوں نے المستوعب کے نام جو کتاب لکھی،اس کی ابتداء کتاب الطھارۃ سے ہوکر کتاب الحج پرختم ہوتی ہےاور ڈاکٹر مساعد بن قاسم الفالح نے اس پرتحقیق کی ہے۔مکتبہ المعارف الریاض نے اس کو چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔جن میں اصل کتاب کی ایک ہی جلد بنتی ہےاور تین جلدیں اصل کتاب کے مصادر کی نشاندہی اور محقق کی تحقیق کومحیط ہیں۔

مؤلف نے اپنی کتاب کی تالیف میں حسب ذیل کتابوں کوسامنے رکھا ہے:

(1) الخرقی کی مختصر، (2) غلام الخلال کی التنبیہ، (3) ابن ابی موسیٰ کی الارشاد، (4) قاضی ابویعلی کی الجامع الصغیر اور الخصال، (5) ابن البنا کی الخصال، (6) ابوالخطاب کی کتاب الھدایۃ، (7) ابن عقیل کی التذکرۃ۔

مؤلف نے ابن قتیبہ کی ادب الکاتب، الآجری کی النصیحۃ، ابن بطہ کی کتاب الحمام، خلال کی کتاب الحمام، ابوبکر بن عبدالعزیز بن جعفر کی کتاب الخلاف، ابن بطہ کی کتاب الشرح والابانۃ عن اصول السنۃ والدیانۃ اور مسند احمد سے بھی استفادہ کیا ہے،لیکن مذکورہ کتابوں کے حوالے نہیں دیے۔ان کے نزدیک جوراجح

یا پسندیدہ مسلک تھا، اس کے لیے انہوں نے عمومی طور پر مستحب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سنت و مسنون کا لفظ بہت ہی قلیل دکھائی دیتا ہے۔

بہت سی جگہوں میں مؤلف نے اپنی طرف سے اضافے بھی کر دیے ہیں۔ مثال کے طور پر نمازِ جنازہ کے لیے ان کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی خاص دعا مقرر نہیں بلکہ امام اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے، مسلمانوں اور میت کے لیے دعا مانگے۔ پھر انہوں نے "المنقول" کے تحت چند دعائیں نقل کی ہیں جن میں مسنون دعائیہ الفاظ کے ساتھ اضافے بھی کر دیے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ (المستوعب ج3 ص127، 128، 129)

حالانکہ احادیث میں مسنون دعائیں جلیل القدر صحابہ ابو ہریرہؓ، عوف بن مالکؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، قتادہؓ، جابر، ابوابراہیم اشہلی کے والد اور عائشہؓ سے مروی ہیں۔

اسی طرح (المستوعب ج3 ص162 میں) ان کا کہنا ہے:

قبروں کی زیارت کرنے یا ان کے پاس سے گزرنے کے لیے مستحب ہے کہ وہ کہے:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُم اَهْلَ دَارِ قَوْمٍ مُؤْمِنِيْنَ وَ اِنَّا بِكُمْ عَنْ قَرِيْبٍ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَاحِقُوْنَ۔ اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ وَاغْفِرْلَنَا وَلَهُمْ، اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الْاَجْسَادِ الْبَالِيَةِ وَالْعِظَامِ النَّاخِرَةِ الَّتِیْ خرجَتْ مِنَ الدُّنْيَا وَهِیَ بِكَ مُؤْمِنَةٌ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ و اَنْزِلْ عَلَيْهِمْ رَوْحًا مِنْكَ وَ سَلَامًا مِنِّیْ۔

اے مؤمنوں کی قوم کے گھر والو! تم پر سلامتی ہو اور اللہ نے چاہا تو عنقریب ہم تم سے ملنے والے ہیں۔ اے اللہ! ان کے اجر کو ہم پر حرام نہ کرنا اور نہ ہی ان کے بعد فتنے میں ڈالنا ہمیں اور ان کو بخش دے۔ اے اللہ! ان بوسیدہ جسموں اور ریزہ ریزہ ہونے والی ہڈیوں کے رب! جو دنیا سے چلی گئیں اور وہ تجھ پر ایمان رکھنے والی ہیں۔ اپنی طرف سے محمد ﷺ اور آپ کی اولاد پر رحمتیں نازل فرما اور ہماری طرف

سے ان کو سلام پہنچا۔

یہاں بھی مسنون دعا میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

جبکہ صحیح مسلم (ج 1 ص 314، کتاب الجنائز) میں بریدہؓ سے مروی ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُعَلِّمُهُمْ اِذَا خَرَجُوْا اِلَى الْمَقَابِرِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ۔

رسول اللہ ﷺ صحابہ کو تعلیم دیا کرتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو کہا کریں۔ مومنوں مسلمانوں کے گھروں میں رہنے والو! تم پر سلامتی ہو اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم تم سے ضرور ملنے والے ہیں۔ ہم اللہ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔

ابوعبداللہ السامری فقیہ تھے، لہٰذا انہوں نے اپنے طور پر امام احمد کے مذہب کے مطابق کتاب الحج تک اپنی کتاب میں مسائل بیان کیے ہیں۔ حالانکہ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی زندگی میں کوئی مذہب و مسلک نہ بنایا اور نہ ہی دوسروں کو اپنی اتباع کرنے کی تلقین کی۔ ان کا مسلک صرف قرآن و سنت تھا، لیکن بعد والوں نے دوسرے ائمہ کے مقلدین کی طرح حنبلی مسلک بھی ایجاد کر لیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی امام نے قرآن و سنت سے ہٹ کر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا، لیکن مفاد پرستوں نے ائمہ کرام کی تقلید کا سہارا لے کر گروہ بندی کو رائج کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی 23 سالہ جدوجہد سے جس منتشر معاشرے کو مثالی معاشرہ بنایا تھا۔ ائمہ کرام کے نام پر مختلف فقہاء نے باہمی اختلاف اور قرآن و سنت پر فقہ کو فوقیت دیتے ہوئے پھر سے منتشر کر دیا۔ جس کا نتیجہ ہلاکت و بربادی کی صورت میں مرور زمانہ کے ساتھ ظاہر ہوتا رہا اور اب بھی ہو رہا ہے۔

ایک طرف رسول اللہ ﷺ کی واضح تعلیم اور دوسری طرف 616ھ میں فوت ہونے والے ایک فقیہ کا حوالہ۔ امت کا شیرازہ بکھیرنے کا سبب یہی تھا کہ قرآن وسنت اور صحابہؓ کے عمل پر فقہاء کے اقوال کو ترجیح دی جاتی تھی۔

قاضی السبکی نے اپنی کتاب کے چوتھے باب میں تفصیلاً اور ساتویں باب میں اختصاراً کتاب المستوعب کا حوالہ دیا ہے کہ ابو عبداللہ السامری نے کہا۔ حالانکہ ابو عبداللہ نے ابن البناء کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

جب زائر مدینہ آئے تو اس کے لیے مستحب ہے کہ داخلہ کے وقت غسل کرے۔ پھر مسجد پہنچے اور داخل ہوتے ہوئے دایاں پاؤں پہلے داخل کرے۔ پھر نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس پہنچ کر اس طرح کھڑا ہو کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک سامنے اور قبلہ اس کی پشت پر ہو اور نبی ﷺ کی منبر اس کے بائیں جانب ہو۔ پھر دعا وسلام کی کیفیت بیان کرنے کے بعد انہوں نے کہا: وہ کہے، اے اللہ! تُو نے فرمایا ہے:

اگر وہ لوگ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول ﷺ بھی ان کے لیے بخشش طلب کرتے تو وہ ضرور اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔ (سورۃ النساء:64)

اس کے بعد زائر کہے: اے اللہ! میں تیرے نبی ﷺ کے پاس مغفرت چاہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

اے اللہ! میں تیری طرف تیرے نبی ﷺ کے واسطہ سے متوجہ ہوا ہوں۔

اس کے بعد جب واپسی کا ارادہ کرے تو دوبارہ نبی ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر رخصت ہو۔

اسلام اور دوسرے مذاہب میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اس میں مدد ونصرت

اور شفاعت کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھا جاتا ہے۔ غیر اللہ کو پکارنے اور اس سے مدد چاہنے کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ اسی کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی امت کو دی۔ خلفائے راشدین نے اسی تعلیم کو آگے بڑھایا، لیکن جب اہل حق دنیا سے رخصت ہوتے گئے اور دنیا داروں کا زور بڑھتا چلا گیا تو اسلامی عقائد میں بھی ضعف آنا شروع ہو گیا اور ان میں بھی بدعات و خرافات کا رواج عام ہوتا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے جب قرآنِ حکیم میں یہ اعلان کر دیا: مجھ کو پکارو، میں تمہاری پکار سنوں گا، جو مانگو گے وہ دوں گا اور اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے انتہائی مشکل حالات میں اپنا نمونہ قائم کر دیا، لیکن قاضی تقی الدین السبکی جیسے حضرات نے قبروں میں دفن ہونے والوں کی حیات و ممات میں نہ صرف فرق مٹا دیا بلکہ اہل قبور کے پاس جا کر ان سے حاجات طلب کرنے کی تعلیم دی۔ تعلیم کے مطابق عمل کرنے والوں کو قبولیت کا یقین دلایا جو سراسر قرآن و سنت کی مخالفت ہے۔

قاضی السبکی نے سورۃ النساء کی 64 نمبر آیت کا متعدد بار ذکر کیا ہے، لیکن یہ کہیں نہیں بتایا کہ کسی صحابیؓ نے اس آیت مبارکہ کا وہ معنی و مطلب سمجھا ہو جس کا حوالہ قاضی صاحب نے بار بار دیا ہے۔

قاضی صاحب نے عبداللہ بن عمرؓ کے قبر مبارک پر آنے اور سلام کہنے کو بھی اپنے موقف کی دلیل بنایا ہے، لیکن یہ انہوں نے نہیں بتایا کہ عبداللہؓ بن عمرؓ یا عمر بن عبدالعزیز یا کسی اور صحابیؓ نے اس آیت کا وہ مفہوم سمجھا جس کا ذکر قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں فرمایا۔

کیا صحابہ بھی آپ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس جا کر اسی طرح دعا کیا کرتے تھے جس طرح ابو عبداللہ السامری کی کتاب المستوعب میں مذکور ہے۔ اس کتاب کی

حقیقت بھی ان کتابوں جیسی ہے جن میں ضعیف وموضوع روایات منقول ہیں۔

المستوعب (ج1 ص259) میں بغیر راوی کے نام سے روایت مروی ہے:

مَنْ قص اَظْفَارَهٗ يَوْمَ الْجُمُعَةِ دَخَلَ فِيْهِ شِفَآءٌ و خَرَجَ مِنْهُ دَآءٌ

جس نے اپنے ناخن جمعہ کے دن کاٹے، اس میں شفاء داخل ہوگئی اور بیماری نکل گئی۔

امام ابن جوزی نے الموضوعات کی تیسری جلد کے صفحہ 53 پر اس روایت او

اس جیسی دوسری روایات کے بارے میں لکھا ہے کہ حدیث رسول ﷺ کے نام مبارک پ

گھڑی گئی ہے اور یہ انتہائی بُری قسم کی موضوعات میں سے ہے۔

اسی طرح المستوعب (ج1 ص269) کی یہ روایت بھی ہے۔ جمعہ کے دن میں

ایک ایسی گھڑی ہے کہ جو اس میں سینگی لگوائے تو اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

الموضوعات (ج3 ص213) میں امام ابن جوزی نے اس کو بھی موضوع یعنی

گھڑی ہوئی حدیث قرار دیا ہے۔

ایسی اور بھی کئی روایات اور اضافے ہیں جو شرعی طور پر ثابت نہیں۔ لہٰذا ایک

کتابوں کی روایات کو حجت بنانا اہل علم کے شایانِ شان نہیں۔

ابراہیم حربی کا حوالہ

قاضی السبکی نے پہلے کتاب الشریعہ کے حوالے سے ابراہیم الحربی کا یہ قول نقل

کیا ہے کہ دعا وسلام کے لیے رخ قبر مبارک کی طرف ہونا چاہیے۔ پھر اس کی مز

وضاحت بھی کر دی کہ ہمارے اصحاب کی تصریح ہے کہ نبی ﷺ کی قبر کے پاس پہنچ

قبلہ کی جانب پشت کر کے قبر کی دیوار کی طرف رخ کرے۔ چار ہاتھ قبر کے سرہانے سے

دور کھڑا ہو۔ پھر نبی ﷺ پر سلام کہے۔ اس کے بعد دائیں جا کر ہٹ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سلا

کہے۔ پھر مزید تھوڑا اور ہٹ کر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سلام کہے۔ پھر پہلی جگہ پر آ کر رسول اللہ کو اپنی دعا میں وسیلہ بنائے اور اللہ کی طرف اپنے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع بنائے۔ پھر قبر اور ستون کے درمیان قبلہ رخ کھڑا ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرے اور اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے دعا کرے۔

تجزیہ

مذکورہ عبارت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ اور شفیع بنانے کی بحث اگلے باب میں ان شاء اللہ تعالیٰ ہو گی، لیکن یہاں قاضی صاحب نے ابراہیم الحربی کے اس حصے کو نقل کر کے امام ابن تیمیہؒ کے موقف کو تسلیم کر لیا ہے۔

''پھر قبر اور ستون کے درمیان قبلہ رخ کھڑا ہو کر اللہ کی حمد و ثناء کرے۔ پھر اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے دعا کرے۔'' ائمہ کرام کے حوالے سے امام ابن تیمیہؒ نے یہی کہا تھا۔

قاضی السبکی کا حق کو قبول کرنا

خلاصہ کے طور پر ان کا کہنا تھا کہ دعا میں قبلہ رخ ہونا بھی بہتر ہے اور قبر مبارک کی طرف رخ کرنا بھی بہتر ہے اور ہمارے علم میں نہیں کہ کسی عالم نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے تو اس کو ثبوت مہیا کرنا چاہیے۔

قاضی صاحب اس سوچ کو پہلے ہی اگر اپنا لیتے تو بحث کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ ان کے زمانے سے پہلے ہی اس بارے میں اختلاف چلا آ رہا تھا۔ اسی لیے امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتویٰ میں دو قولوں کا حوالہ دیا تھا۔ انہوں نے اپنی ذاتی رائے دینے سے اجتناب کیا

تھا، لیکن قاضی صاحب نے ان کے خلاف کتاب لکھ دی۔ جس میں اتنا تکرار ہے کہ قاری کے لیے اس کا مطالعہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

امام مالکؒ والی حکایت کا پھر ذکر اور اس کا جواب

قاضی تقی الدین السبکی نے اپنی کتاب کے چوتھے باب میں خلیفہ ابو جعفر المنصور اور امام مالک والی حکایت کا خوب ذکر کیا ہے، لیکن ایک مرتبہ پھر امام ابن تیمیہؒ کے قول کہ دعا مانگتے ہوئے قبر مبارک کی طرف رخ کرنے کے بارے میں ایک جھوٹی روایت امام مالک سے منسوب ہے۔ جبکہ ان کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے اس دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لیے انہوں نے پھر بحث کو پھیلا دیا کہ قاضی عیاض (التوفی 544ھ) نے اپنی کتاب الشفآء کے تیسرے باب میں اس کا ذکر کرتے ہوئے نہ اس پر کوئی نکیر کی اور نہ ہی اس کو امام مالک کے مذہب کے خلاف کہا ہے۔

ابن حمید نے بیان کیا ہے۔ خلیفہ ابو جعفر (التوفی 158ھ) کی امام مالک سے مسجد نبوی میں ایک بحث ہوئی۔ جس میں ابو جعفر نے امام مالک سے کہا:

اے ابو عبداللہ! مجھے بتاؤ۔ میں قبلہ رخ ہو کر دعا کروں یا رسول اللہ ﷺ کی طرف رخ کر کے کروں۔

امام مالک نے فرمایا: اپنا چہرہ ان سے کیوں پھیرتے ہو؟ جو تمہارے اور تمہارے باپ آدم علیہ السلام کے وسیلہ ہیں۔ ان کی طرف رخ کرو اور ان کو شفیع بناؤ۔ اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت قبول فرمائے گا۔

قاضی عیاض نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کسی نے اس کا انکار نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے کہا ہے کہ امام مالکؒ کا مذہب اس کے خلاف ہے۔

قاضی عیاضؒ نے الشفآء کے چوتھے باب کی فصل "فی حکم زیارۃ قبرہ" میں ابن وہب سے روایت کی ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا:

اِذَا سَلَّمَ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ وَ دَعَا یَقِفُ وَجْهَهُ اِلَی الْقَبْرِ لَا الْقِبْلَةِ یَدْنُو وَ یُسَلِّمُ وَلَا یَمَسُّ الْقَبْرَ بِیَدِهٖ۔

اس روایت میں درود و سلام کہنے والے کے لیے رہنمائی دی گئی ہے کہ سلام و دعا کا طریقہ کیا ہوگا۔ چنانچہ روایت کا ترجمہ ہے کہ نبی ﷺ کو سلام کہے اور آپ ﷺ کے لیے دعا مانگے تو اپنے چہرے کو قبر کی طرف کر کے کھڑا ہو جائے، قبلہ کی طرف نہیں۔ پھر وہ قبر کے قریب ہو کر سلام کہے۔ قبر مبارک کو ہاتھ سے نہ چھوئے۔

قاضی تقی الدین السبکی نے یہاں لفظ دَعَا سے مراد سلام کہنے والے کی اپنے لیے دعا ہے۔ حالانکہ یہاں دعا سے مراد رسول اللہ ﷺ ہی کے لیے دعا ہے جو درودِ ابراہیمی کی صورت میں ہے اور آپ ﷺ کو قیامت کے روز مقامِ محمود اور وسیلہ عطا کیے جانے کے لیے ہوتی ہے۔

اس کی وضاحت ابن وہب نے خود ہی کر دی ہے کہ امام مالکؒ کا کہنا تھا:

لَا اَرٰی اَنْ یَّقِفَ عِنْدَ قَبْرِ النَّبِیِّ ﷺ یَدْعُو وَلٰـکِنْ یُسَلِّمُ وَ یَمْضِی۔

میری رائے نہیں کہ وہ قبر مبارک کے پاس کھڑا ہو کر دعا مانگے، بلکہ سلام کہے اور گزر جائے۔ الشفاء (ج2 ص85)

قاضی ابوالفضل عیاض نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایسا ہی نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس آتے، آپ ﷺ کو سلام کہنے کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی سلام کہتے ہوئے گزر جاتے۔

الشفاء (ج2 ص86) میں یہ بھی منقول ہے کہ یحییٰ بن یحییٰ اللیثی نبی ﷺ کی قبر

کے پاس کھڑے ہوتے اور نبی ﷺ، ابوبکرؓ اور عمرؓ کے لیے رحمت کی دعا کرتے، چونکہ ان کی دعا کے لیے "فَیُصَلِّی" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی لیے ابوالقاسم اور القعبنی نے اس کی وضاحت کر دی۔ یَدْعُو لِاَبِی بَکْرٍ وَعُمَرَ۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے لیے دعا کرے۔ یعنی درود صرف رسول اللہ ﷺ پر بھیجے۔

امام مالکؒ سے ابن وہب کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کو سلام کرنے والا کہے:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

اے نبی! آپ پر سلامتی اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔

ابن حبیب نے تو بات بالکل ہی صاف کر دی: جب کوئی مسجد نبوی میں داخل ہو تو کہے:

بِاسْمِ اللّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا مِنْ رَبِّنَا وَ صَلَّی اللّٰہُ وَمَلَائِکَتُہٗ عَلٰی مُحَمَّدٍ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوبِی وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ وَ جَنَّتِکَ وَاحْفَظْنِی مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔

اللہ کے نام کے ساتھ اور سلام ہو رسول اللہ ﷺ پر اور سلام ہو ہمارے رب کی طرف سے ہم پر اور محمد ﷺ پر اللہ اور اس کے فرشتوں کا درود ہو۔ اے اللہ! میرے گناہ معاف کر دے اور میرے لیے اپنی رحمت اور اپنی جنت کے دروازے کھول دے اور شیطان رجیم سے میری حفاظت فرما۔

پھر اس روضہ (ریاض الجنۃ) کی طرف جائے جو قبر مبارک اور منبر مبارک کے درمیان ہے۔ اس میں قبر کے پاس کھڑے ہونے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے۔ اس میں اللہ کی حمد بیان کرے اور اس سے ان تمام چیزوں اور کاموں کے سوال کرے کہ جس

کے لیے وہ نکلا ہے اور ان پر اس کی مدد مانگے۔ ریاض الجنۃ کے علاوہ مسجد میں جہاں بھی پڑھی جائیں گی تو وہ کفایت کریں گی۔ اگر ریاض الجنۃ میں مل جائیں تو افضل ہوں گی۔

قاضی عیاض کی کتاب الشفآء کا حوالہ قاضی تقی الدین السبکی نے دیا اور اسی کتاب سے جو قاضی السبکی نے سمجھا تھا، اس کی نفی ہوگئی۔ لہٰذا شرعی طریقہ وہی ہے جس کا ذکر امام ابن تیمیہؒ نے کیا ہے۔

حکایت کی سند

قاضی السبکی نے حکایت کے راویوں کی عظمت وجلالت اور امانت وثقاہت کا ذکر کر کے حکایت کو سچ ثابت کرنے میں بہت محنت کی ہے، لیکن جھوٹ پر جتنی بھی محنت کی جائے وہ سچ نہیں بن جاتا۔ وقتی طور پر لوگ دھوکے میں تو آسکتے ہیں، لیکن بالآخر حقیقت اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ چونکہ ہماری کتاب کا موضوع الشفآء اور اس کی روایات اور ان کو روایت کرنے والے راوی نہیں، ورنہ ہم بتاتے کہ قاضی ابوالفضل عیاض کی کتاب الشفاء میں بھی بہت سی روایات ضعیف وموضوع ہیں۔

رہی بات کہ ان پر نکیر کیوں نہ ہوئی۔ اس کی پہلی وجہ تو سید الانبیاء ﷺ سے اہل اسلام کی محبت ہے۔ عوام کے سامنے محبت کے نام پر جو کچھ آیا، سب نے قبول کرلیا۔ دوسری بات محترم ومکرم قاضی عیاض کا قاضی ہونا تھا۔ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کی کہی اور لکھی ہوئی بات کو جھٹلائے۔ امام ابن تیمیہؒ نے جب ان روایات کو جرح وتعدیل کے پیمانے پر پرکھا اور ان کی حقیقت کو لوگوں کے سامنے رکھا تو اس وقت کے قاضیوں نے ان کو قید کروا دیا۔ حالانکہ وقت کے بڑے بڑے عظیم علماء موجود تھے۔ جو علمی انداز میں ان کے خیر خواہ اور مدد ومعاون تھے، لیکن قاضیوں کے خلاف ان کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھے۔

جس کی وجہ سے امام ابن تیمیہ کو متعدد بار قید خانے جانا پڑا اور قید خانے میں ہی ان کی وفات ہوئی۔ یہ معاملہ ان کے ساتھ ہوا کہ جن کو عوامی تائید حاصل تھی۔ جنہوں نے تارتاریوں پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ان کا فتنہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ گیا۔ دمشق کی تاریخ میں ان کا جنازہ بے مثال تھا۔ حافظ ابن کثیر الشافعی نے علمائے کرام میں سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنی تاریخ البدایة و النهاية میں انہی کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی الشافعی نے بھی الدرر الكامنة میں سب سے زیادہ مفصلاً ترجمہ انہی کا رقم کیا ہے۔ لہٰذا قاضی کی بات کا رد کرنا ایک انتہائی مشکل کام ہوتا ہے۔ جرأت کرنے والا مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔

قاضی السبکی نے بھی شفاء السقام میں ضعیف و موضوع روایات و حکایات نقل کرنے کے ساتھ چند ایسے حوالے بھی دیے جو اصل کتابوں میں موجود نہیں۔

کتاب الشفاء سے ابن حبیب کی روایت کو نقل کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی لکھ دیا:

ثُمَّ اقْصِدْ اِذَا قَضَیْتَ رَکْعَتَیْكَ اِلَی الْقَبْرِ مِن وَّجَاءِ الْقِبْلَةِ فَادْنُ مِنْهُ ثُمَّ سَلِّم عَلیٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَثْنِ عَلَیْهِ وَ عَلَیْكَ السَّکِیْنَةَ وَالْوَقَارَ فَاِنَّهٗ ﷺ یَسْمَعُ وَ یَعْلَمُ وُقُوفَكَ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ تُسَلِّمُ عَلیٰ اَبِیْ بَکْرٍ وَ عُمَرَ رضی اللہ عنہما۔

جب تُو اپنی دو رکعتیں پڑھ چکے تو قبر مبارک کی طرف قبلہ کی جانب سے آ۔ پھر قبر کے قریب ہو کر رسول ﷺ کو سلام کر اور آپ ﷺ کی تعریف کر اور اپنے اوپر سکینت و وقار کو لازم رکھ، کیونکہ آپ ﷺ سن رہے ہیں اور اپنے سامنے تیرے کھڑے ہونے کا ان کو علم ہے، پھر تُو ابو بکر اور عمر کو سلام کہہ۔

جبکہ المكتبة التجارية الكبرى مصر کی شائع کردہ الشفاء (ج2 ص87) کی عبارت ہے:

ثُمَّ تَقِفُ بِالْقَبْرِ مُتَوَاضِعًا مُتَوَقِّرًا فَتُصَلِّی عَلَیْهِ وَ تُثْنِی بِمَا یَحْضُرُكَ وَ تُسَلِّمُ عَلٰی اَبِیْ بَکْرٍ وَ عُمَرَ وَ تَدْعُو لَهُمَا۔

پھر تو قبر کے پاس تواضع و وقار کے ساتھ کھڑا ہو جا اور آپ ﷺ کے لیے درود والی دعا کر اور آپ ﷺ کی وہ تعریف کر کہ جو اس وقت تیرے ذہن میں آئے اور ابوبکرؓ اور عمرؓ کو بھی سلام کہتے ہوئے ان کے لیے بھی دعا کر۔

ظاہر ہے کہ اصل کتاب میں رسول اللہ ﷺ کے سننے اور سامنے کھڑے ہونے والے کے بارے میں علم ہونے والی عبارت موجود نہیں۔ اوپر سے قاضی صاحب نے اس کو اپنے موقف کے لیے دلیل بھی بنا لیا۔

حکایات کی سند کے تمام راویوں پر بحث کرنے کے بجائے جو اصل راوی ابن حمید ہے، اس کی حقیقت چوتھے باب میں بیان ہو چکی ہے کہ وہ ضعیف، منکر اور کذاب تھا۔ حدیثیں چرا کر ان کے متن اور سندیں بدل دیتا تھا۔

چونکہ قاضی عیاض نے راوی کا پورا نام اور اس کی ولادت و وفات کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ لہٰذا قاضی السبکی نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھ دیا:

اَظُنُّ اَنَّهٗ اَبُو سُفْیَان محمد بن حمید المعمری۔ فَاِنَّ الخطیب ذَکَرَهٗ فِی الرُّواة عَنْ مَالِكٍ وَ اَنَّهٗ قَالَ کَتَبَ عَنْ مَالِكٍ موطاهُ اَرَانِیهِ فَجَعَلَ یَعْرِضُهٗ عَلَیَّ وَ یَقُوْلُ وَ کُنْتُ فِی کِسْوَةِ الْمُسْلِمِیْنَ فِی کَفَّارَةِ الْیَمِیْنِ کَذَا الَیْسَ هذا حسن فان یکنه فهو ثقة ۔ (روی له مسلم)

میں خیال کرتا ہوں کہ وہ ابوسفیان بن حمید المعمری ہیں۔ خطیب بغدادی نے ان کو امام مالکؒ سے روایت کرنے والوں میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے امام مالکؒ سے ان کی موطا لکھی۔ وہ مجھے دکھائی اور مجھ پر وہ پیش کیا کرتے تھے اور

کہتے تھے: میں قسم کے کفارہ میں لباس لینے والوں میں سے تھا اور وہ ثقہ تھے۔ (امام مسلم نے ان سے روایت کی)۔

مذکورہ عبارت میں قاضی السبکی نے اَظُنُّ کا استعمال کیا ہے جس کا معنی ہے میرا گمان یا میرا خیال ہے۔ یعنی قاضی صاحب کو قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ حکایت کا اصلی راوی محمد بن حمید ابوسفیان تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس حکایت سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور فن حدیث میں ظن کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ حدیث کو صحیح ثابت کرنے کے لیے واضح دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ بغداد ج 2 میں چار ابن حمید کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں سے سب سے پہلے فوت ہونے والے ابوسفیان تھے۔ لہٰذا قاضی السبکی نے حکایت ان سے منتھی کر دی، لیکن انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ جو عبارت انہوں نے خطیب بغدادی کے حوالے سے نقل کی ہے وہ ابوسفیان کے ترجمہ میں مذکور نہیں اور جس یعقوب بن اسحٰق بن کامجر کا ذکر فرمایا ہے، اس کے اساتذہ میں ابن حمید کا نام شامل یا مذکور نہیں۔ لہٰذا امام مالکؒ سے منسوب حکایت یقینی طور پر جھوٹی اور من گھڑت ہے۔

قاضی السبکی کا خلاصہ تحریر

قاضی صاحب نے حکایت کے راویوں کی عظمت و جلالت کو اجاگر کرنے کے بعد اپنی بحث کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے:

اب ہمارے لیے چند راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم صرف ابن وہب کی روایت لیں۔ کیونکہ ترجیح اسی کو حاصل ہے۔ (یہ بھی قاضی صاحب کا اپنا فیصلہ تھا۔)

دوسرے یہ کہ دونوں روایتوں پر عمل کریں۔ اس لیے کہ یہ اختلاف حلال و حرام کا نہیں ہے نہ کراہت و عدم کراہت کا ہے۔ قبلہ رخ ہونا بھی حسن ہے اور قبر کی طرف منہ

کرنا بھی حسن ہے۔

تیسرے یہ کہ ابن تیمیہ کے زعم کے مطابق اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ قبلہ رخ رہے اور قبر کا استقبال نہ کرے تو اس سے اصل مسئلہ زیارت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ہم نے مالکی علماء کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، کسی میں ہم نے نہیں پڑھا کہ دعا کے وقت استقبالِ قبر ممنوع و مکروہ ہے اور نہ ہی خلاف اولیٰ ہے۔ سوائے مبسوط کے۔ بہر حال ابن تیمیہ کا یہ دعویٰ کہ امام مالکؒ اور تمام علماء کا مذہب ہے کہ جب سلام کہے تو قبر کی طرف منہ کرے اور جب دعا مانگے تو قبر کی طرف پشت کرے۔ یہ صحیح نہیں اور اسی بنیاد پر انہوں نے اس حکایت کو مردود قرار دیا ہے۔ زیارت کے سلسلہ میں ہم مالکی علماء کا کلام چوتھے باب میں بیان کر چکے ہیں جس سے ابن تیمیہ کے اس دعویٰ کی تردید ہوتی ہے۔

خلاصے کا جائزہ

قاضی صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کہ حکایت کو مردود اس لیے قرار دیا گیا کہ وہ امام مالک اور مالکی علماء کے مذہب کے خلاف ہے۔ بلکہ وہ اس لیے مردود ہے کہ فن حدیث کے معیار کے مطابق جھوٹی من گھڑت ہے۔ الشفاء میں مذکور سند صحیح نہیں۔ ابن حمید ابو سفیان نہیں بلکہ ابن حمید وہ ہے جس کی وفات 248ھ میں ہوئی۔ ائمہ حدیث نے اس کو منکر الحدیث اور کذاب کہا۔

قاضی صاحب کے نزدیک اگر یہ مسئلہ حلال و حرام اور کراہت کا نہ تھا تو پھر کتاب لکھنے اور امت میں تفریق و تقسیم پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب امام ابن تیمیہؒ کا موقف بھی حسن تھا تو ان کو طعن و تشنیع کا نشانہ کیوں بنایا گیا۔ ایک عظیم مصلح کو بار بار قید میں کیوں ڈالا گیا۔ قاضی ابن الاخنائی مالکی کا امام ابن تیمیہؒ نے جب رد کیا تو ان کو ان کی

قلم و دوات اور کاغذات اور کتابوں سے محروم کیوں کر دیا گیا۔ کیا علمی اختلاف کی بنا پر کسی پر ظلم کرنا جائز ہے۔ قرآن و سنت کے حقیقی داعی پر جھوٹا الزام لگانا شریعت محمدی میں کیا اس کی اجازت ہے؟ کیا ائمہ کے درمیان علمی اختلاف نہ تھا۔

مالکی قاضی الاخنائی کے معاملہ سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ امام ابن تیمیہ مالکیوں کے حمایتی نہ تھے بلکہ قرآن و سنت کی سربلندی میں کوشاں رہنے والے بے مثال انسان تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں حکومت سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ حالانکہ سلطان ناصران کی بہت عزت کرتا تھا۔ اگر چاہتے تو وہ بھی قاضی بن سکتے تھے، لیکن انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے نمونہ کے مطابق زندگی بسر کر دی۔ دین حق کے غلبہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ ان کو حنبلیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ ہر قسم کی گروہ بندی سے آزاد تھے۔ قرآن و سنت کے مطابق جو بھی بات کرتا وہ اسی کے ساتھی تھے۔ اسی لیے ان کے وقت کے عظیم علمائے حق ان کی عزت و احترام کرتے تھے۔ جیسے امام المزی، امام الذہبی اور حافظ ابن کثیر تینوں ہی شافعی تھے۔ امام ابن تیمیہؒ پر راقم کی کتاب امام ابن تیمیه- ایك عظیم مصلح مزید تفصیل کے لیے دیکھی جا سکتی ہے۔ قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی کے بیٹے تاج الدین السبکی کے مطابق امام ابن تیمیہؒ نے ان کو خراب کر دیا تھا۔

قاضی تقی الدین السبکی اپنے عہدہ قضاء سے اس وقت الگ ہوئے جب ان کی خواہش پر ان کے بیٹے تاج الدین السبکی کو اس عہدہ پر فائز کر دیا گیا۔ کیا امام ابن تیمیہؒ نے حکومت سے کوئی ایسی منفعت لی۔ قید میں ہوتے ہوئے انہوں نے قیدیوں کو ملنے والی قانونی مراعات بھی قبول نہ کیں۔ ایسے عظیم انسان کی مخالفت عدل و انصاف کے ترازو کو تھامنے والے اہل علم کو قطعاً زیب نہیں دیتی تھی۔

تھوڑی سی بات

قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی نے اپنی عادت کے مطابق لمبی لمبی تحریروں اور الجھاؤ پیدا کرنے والی تاویلوں کے باوجود بحث کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھا ہے۔ چنانچہ ان کا فرمان ہے۔ تھوڑی سی بات باقی ہے۔ وہ ہم یہاں ذکر کیے دیتے ہیں۔

ابوالحسن لخمی نے تبصرہ میں ذکر کیا ہے۔ جو مدینہ پہنچے وہ سب سے پہلے مسجد نبوی میں جائے۔ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے۔ پھر قبر پر جائے اور سلام پڑھے۔ یہی امام مالک کا قول ہے۔ (یہی بات امام ابن تیمیہؒ نے کہی تھی)

ابن حبیب نے کہا ہے: جب مسجد میں داخل ہو تو کہے:

بِسْمِ اللّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ۔

قاضی صاحب نے ابن حبیبؒ کے قول کی جو تاویل کی ہے، وہ بڑی ہی عجیب ہے۔

قاضی صاحب کا فرمان ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہو تو سلام سے ابتداء کرے۔ پھر تحیۃ المسجد پڑھے اور اگر اس کا داخلہ اس دروازے سے ہو جو قبر مبارک سے متصل ہے اور اس کا گزر قبر کے پاس سے ہو تو ٹھہر کر سلام پڑھے۔ پھر وہاں جائے جہاں اس نے نماز پڑھنی ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

جائزہ

قاضی صاحب کی بیان کردہ مراد قاضی عیاض کی سمجھ میں نہ آئی۔ اسی لیے انہوں نے اس کو اپنی کتاب کا حصہ نہ بنایا، لیکن قاضی صاحب نے ابن حبیبؒ کے کھاتے میں ڈال دی۔

ابن بشیر مالکی کی کتاب التنبیۃ کے حوالے سے قاضی صاحب نے یہ نقل کیا: جو شخص مدینہ میں داخل ہو، اس کے لیے بہتر ہے کہ پہلے مسجد نبوی میں نوافل پڑھے، پھر نبی ﷺ کی قبر کے پاس جائے۔ رسول اللہ ﷺ کو سلام کرے اور کثرت سے درود پڑھے۔ پھر اپنے لیے جو چاہے دعا کرے۔ پھر ابو بکرؓ اور عمرؓ کو بھی سلام کہے۔ جب مدینہ سے واپس ہو تو ایسا ہی کرے۔

ابن یونس مالکی کے حوالے سے پھر ابن حبیب کی روایت نقل کر دی جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ یعنی سب سے پہلے ریاض الجنۃ میں جا کر دو رکعت نماز پڑھ کر جس مقصد کے لیے نکلا ہے، اس کی تکمیل کے لیے دعا کرے۔ پھر قبر کے پاس آ کر سلام کہے اور آپ کی تعریف کرے۔

(نوٹ اس روایت اور اس میں اضافے کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے)

امام مالکؒ کے بارے میں پھر مغالطہ آمیزی

قاضی صاحب نے فرمایا: امام نوویؒ نے کتاب رؤس المسائل میں حافظ ابو موسیٰ اصبہانی سے روایت کی ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا: جب کوئی شخص نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس جانے کا ارادہ کرے تو قبلہ کی طرف پشت کر کے نبی ﷺ کی طرف رخ کرے درود بھیجے اور دعا کرے۔

قاضی صاحب نے یہ بھی نقل کیا کہ میں نے عبداللہ بن عبدالحکیم الکبیر کی کتاب الجامع کی شرح میں دیکھا کہ ابن وہب نے کہا: امام مالکؒ سے دریافت کیا گیا کہ سلام کرنے والا نبی ﷺ کے پاس کس طرح کھڑا ہو؟ تو انہوں نے کہا: اس گوشہ میں قبلہ رو کھڑا ہو جو منبر کے قریب قبلہ کی جانب ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ وہ قبر کو چھوئے۔

قاضی صاحب کے علمی جوہر کا مظاہرہ

قاضی تقی الدین السبکی نے امام مالکؒ سے ابن وہب کے حوالے سے روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے: ممکن ہے کہ یہ نسخہ غلط ہو، کیونکہ ابن وہب کی امام مالکؒ سے روایت پہلے گزر چکی ہے۔ اس میں قبر کے استقبال کا حکم ہے نہ کہ قبلہ کا۔

ابو موسیٰ کی روایت اور امام مالکؒ کا کلام اس کی تائید کرتا ہے اور ممکن ہے کہ ان سے دو روایتیں ہوں۔ ایک میں قبلہ کا استقبال اور دوسری میں استدبار ہو۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ امام مالکؒ اللہ تعالیٰ سے دعا کے وقت استقبال قبلہ کے قائل تھے تو اس سے زیارتِ قبر نبی ﷺ اور اس کے لیے سفر اور تعظیم قبر نبی ﷺ کی مخالفت ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود اگر کوئی ایسا اعتقاد رکھتا ہو تو وہ گمراہ ہے۔ اس کے بعد جو کچھ اس نے ذکر کیا ہے، اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے اور اس کے اشکالات اپنے مقصود پر دلالت نہیں کرتے۔

اختتامی عبارت کا جائزہ

ساتویں باب کی اختتامی عبارت سے قاضی صاحب کی منفی ضدی اور جھگڑالو سوچ کی نشاندہی ہوتی ہے کہ جس نسخہ کی روایت ان کے حق میں نہ تھی، اس کے غلط ہونے کے امکان کے ساتھ اپنی سوچ کو زبردستی صحیح ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

کیسی عجیب سوچ ہے کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ اللہ ہی خالق و مالک ہے، وہی اَلْحَیُّ الْقَیُّوْم اور وہی دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا ہے، وہی انسان کی شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام اسی کی طرف دیکھتے اور اسی سے مانگا کرتے

تھے۔سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کا بھی یہی معمول تھا اور آپ نے اسی کی تعلیم اپنی امت کو دی تھی۔

لہٰذا اس سے مانگتے ہوئے اس کے مقرر کردہ قبلہ کی طرف منہ کر کے اسی سے مانگا جائے۔ کیونکہ وہ ایسا رب ہے کہ اس تک پہنچنے اور اس سے لینے کے کسی وسیلے کی ضرورت نہیں۔وہ ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کا جواب دیتا ہے۔

لیکن قاضی صاحب نے اپنا پورا علمی زور اپنی کتاب میں اس بات پر لگا دیا کہ اس رب سے مانگتے ہوئے مانگنے والے کا منہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف ہونا چاہیے۔

ان کا اپنا بیان ہے کہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے ساتھ معاملہ ویسا ہی ہونا چاہیے جیسے آپ کی زندگی مبارک میں ہوا کرتا تھا۔

سوچنے اور سمجھنے کی صرف اتنی بات ہے کہ صحابہؓ اور صحابیاتؓ کیا آپ کی زندگی مبارک میں آپ کی طرف منہ کر کے دعا مانگا کرتے تھے۔کیا آپ نے اپنی امت کو یہی حکم دیا تھا۔ ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کا کیا یہی معمول تھا اور وہ مدینہ میں رہتے ہوئے قبر مبارک پر آ کر ایسا ہی کیا کرتے تھے۔کیا ابن عمرؓ اور عمر بن عبدالعزیز کا یہی عمل تھا۔

قاضی صاحب کا اختیار کردہ یہی وہ عمل ہے کہ جس کا رسول اللہ ﷺ کو خطرہ تھا اور آپ نے اس سے منع فرمایا کیونکہ یہی غلو انجام کار شرک کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور اعمال کی بربادی کا سبب بنتا ہے اور آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے۔

مولانا حالی نے کیا ہی خوب کہا:

کرے غیر بت کی پوجا تو کافر　　جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر　　کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں   اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پر دن رات نذریں چڑھائیں   شہیدوں سے جاجا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

۱۱

شفاء السقام کا آٹھواں باب

اس باب میں قاضی القضاۃ تقی الدین علی بن عبدالکافی نے نبی ﷺ کو وسیلہ بنانے اور آپ سے مدد حاصل کرنے اور آپ کی شفاعت چاہنے پر خصوصی بحث فرمائی ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب کا فرمان ہے۔ نبی ﷺ کی مدد اور شفاعت چاہنا جائز ہی نہیں بلکہ امر مستحسن ہے۔ اس کا جائز ہونا ہر دین دار کے لیے ایک بدیہی امر ہے، جو انبیاء و رسل علیہم السلام اور سلف صالحین و علمائے کرام سے ثابت ہے۔ کسی مذہب والے نے اس کا انکار نہیں کیا اور نہ ہی کسی زمانہ میں ان امور کی بات کہی گئی ہے۔ حتیٰ کہ ابن تیمیہ نے ان امور کا انکار شروع کر دیا اور ایسی باتیں کہیں کہ جس سے ایک بھولا بھالا مسلمان دھوکے میں پڑ جائے اور ایک ایسی نئی بات کہنی شروع کر دی جو آج تک کسی نے نہ کہی تھی اور اس نے ابو جعفر اور امام مالکؒ والی مشہور حکایت پر بھی جرح و قدح شروع کر دی۔ جس کو ہم تفصیل سے نقل کر چکے ہیں اور اس کی صحت بھی واضح کر دی ہے۔ یعنی امام مالکؒ نے خلیفہ منصور سے کہا: "نبی ﷺ سے شفاعت کی درخواست کر۔"

ابن تیمیہ نے نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے انکار کے ساتھ شفاعت و استعانت کا بھی انکار کر دیا۔ ابن تیمیہ کے اس موقف کے باطل ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس طرح کی بات اس سے پہلے کسی عالم نے نہیں کی۔

اس سلسلے میں انہوں نے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ لیکن ہم نے بہتر راستہ یہ سمجھا ہے کہ ان کی باتوں کے رد و ابطال سے صرف نظر کرتے ہوئے اصل مسئلے کا ثبوت اور

دلائل واضح کردیں۔ کیونکہ جن علمائے کرام نے امت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے۔ان کا طریقہ کار یہی رہا ہے کہ دین کے مسائل اس طرح بیان کریں کہ لوگوں کی سمجھ میں آجائیں اور قابل قبول ہوجائیں۔لیکن ابن تیمیہ کی باتیں اس کے برعکس ہیں۔

قاضی صاحب کی صریح ناانصافی

قاضی صاحب کی یہ تحریر ہرگز درست نہیں کہ امام ابن تیمیہ نے بہت سی باتیں لکھی ہیں لیکن ہم نے بہتر راستہ یہ سمجھا ہے کہ ان کی باتوں کے رد و ابطال سے صرف نظر کرتے ہوئے اصل مسئلے کا ثبوت اور دلائل واضح کردیں۔

امام ابن تیمیہؒ کے فتوی کے کل صفحات عربی کتاب میں چھ سے بھی کم بنتے ہیں۔ جن کا جواب دینے اور امام ابن تیمیہؒ کا رد کرنے میں قاضی صاحب نے 244 صفحات تحریر کر دیے اور رد کرتے ہوئے جو بھی دلیل ان کو جہاں سے ملی اس کو اپنی کتاب کا حصہ بنا دیا۔اپنے منصب کا خیال کئے بغیر ضعیف وموضوع روایات وحکایات اور خوابوں کا حوالہ دے دیا۔جھوٹ کو سچ کا روپ دینے میں، اپنا سارا علمی سرمایہ لگا دیا۔حیران کن بات یہ ہے کہ کئی ایک حوالوں میں اپنی طرف سے کمی بیشی بڑی دلیری سے کردی اور علمی خیانت کے مرتکب ہوئے لیکن پھر بھی بہتر راستے کا ذکر کردیا۔

انہوں نے یہ اقرار بھی کیا ہے کہ جس مسئلہ استعانت وشفاعت کو انہوں نے اپنایا ہے اہل ادیان یعنی اسلام سے پہلے یا اسلام کے علاوہ ادیان میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ قاضی صاحب کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلام کے علاوہ ادیان کی تعلیم کو اپنایا اور امت محمدیہ کو ان کی راہ دکھائی۔ جن پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی۔

امام ابن تیمیہؒ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ انہوں نے اہل اسلام کو قرآن وسنت کی حقیقی تعلیم کو اپنانے کی دعوت دی۔ وہ حالات وواقعات سے بے پرواہو کر حق کی سربلندی کے لیے کوشاں رہے۔ تاتاریوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے میں انہوں نے بہترین کردار ادا کیا۔ انتہائی آزمائش کے وقت قاضی حضرات اپنی عدالتیں چھوڑ کر دمشق سے غائب ہو گئے لیکن امام ابن تیمیہ سپاہ اسلام کا نمونہ بن گئے۔

اللہ نے ان کو علم کا سمندر بنایا تھا۔ اس لیے ہر ضعیف وموضوع روایت وحکایت کو جرح وتعدیل کے معیار کے مطابق پرکھتے اور اس کی حقیقت بیان کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے مصر وشام کے قاضی حضرات ان سے حسد کرتے ہوئے ان کو منظر سے ہٹانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے لیکن بے لاگ داعی اور عظیم مصلح امام ابن تیمیہ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں سرفراز فرمایا۔

مسئلۂ توسل

قاضی صاحب نے فرمایا: میں کہتا ہوں کہ نبی ﷺ سے توسل ہر حال میں جائز ہے، آپ کی ولادت سے پہلے اور ولادت کے بعد بھی۔ آپ کی دنیاوی زندگی اور آپ کی وفات کے بعد بھی حشر کے میدان میں اور جنت میں بھی...... اور اس کی تین قسمیں ہیں: پہلی حالت یہ ہے کہ نبی ﷺ کی ولادت مبارکہ سے قبل آپ کے وسیلہ سے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ احادیث سے ثابت ہے کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام آپ کی ولادت سے قبل آپ کے وسیلہ سے اللہ کی بارگاہ میں حاجات طلب کیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب ان میں سے اس حدیث کو پہلے بیان کرتے ہیں جس کو امام حاکمؒ نے اپنی المستدرك على الصحيحين میں نقل کیا ہے اور اس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔ حدیث یہ ہے:

عبدالرحمٰن بن زید اپنے دادا اسلم سے روایت کرتے ہیں کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا:
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام نے جب اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا تو بارگاہ الٰہ میں عرض کیا: اے اللہ! میں بحق محمد درخواست کرتا ہوں کہ مجھے معاف کردے۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تجھے محمد کے بارے میں کیسے علم ہوا۔ حالانکہ میں نے اس کو پیدا ہی نہیں کیا۔

آدم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! جب تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور مجھ میں اپنی روح پھونکی تو میں نے اپنا سر اٹھایا اور عرش کے پایوں پر لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه لکھا ہوا دیکھا۔ میں نے جان لیا کہ جس کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ یقیناً تمام مخلوق میں تجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تم نے صحیح کہا، بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق میں سب سے محبوب ہیں۔ جب تو نے ان کے حق کا واسطہ دے کر مغفرت چاہی ہے تو میں نے تجھے معاف کردیا۔ وَلَوْ لَا مُحَمَّدٌ مَّا خَلَقْتُکَ اگر محمد نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا نہ کرتا۔

امام حاکمؒ نے اس حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا۔ امام بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں اور امام طبرانی نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ امام طبرانی نے یہ اضافہ بھی کیا ہے۔ تیری اولاد میں سے وہ آخری نبی ہوں گے۔

امام حاکم نے اس حدیث کے ساتھ یہ روایت بھی نقل کی ہے:
اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعے حکم دیا: اے عیسیٰ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور اپنی امت سے کہو کہ جو ان کو پائے وہ ان پر ایمان لائے۔
اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو میں آدم کو پیدا نہ کرتا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو میں

جنت اور جہنم کو پیدا نہ کرتا۔ میں نے عرش کو پانی پر پیدا کیا تو وہ ہلنے لگا۔ میں نے اس پر لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لکھا تو ٹھہر گیا۔

مترجم نے اپنی طرف سے ''ابن تیمیہؒ کی لاعلمی'' کا عنوان لگا کر قاضی صاحب کی عبارت کا ترجمہ کیا ہے اور یہ ترجمہ چھوڑ دیا۔ حاکم نے کہا۔ یہ حدیث حسن صحیح الاسناد ہے۔ لیکن بخاری مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔

قاضی صاحب کا کہنا تھا: ابن تیمیہؒ نے حضرت آدم علیہ السلام کے توسل کی روایت کے بارے میں کہا ہے کہ وہ بے اصل ہے اور کسی صحیح سند کے ساتھ کسی نے نقل نہیں کی کہ جس پر اعتماد و اعتبار ہو۔

ان کا دعوی محض اپنا خیال اور وہم ہے۔ انہوں نے بہت سی باتیں اپنی طرف سے کہہ کر اس کو جھوٹ قرار دے دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے علم میں نہیں آیا کہ امام حاکم نے اس روایت کو صحیح سند کے ساتھ نقل کر کے اس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔ اگر ان کے علم میں امام الحاکمؒ کی تصحیح آ جاتی تو وہ کبھی یہ بے جا جرأت نہ کرتے۔

ہوسکتا ہے کہ ان کو امام حاکمؒ کی روایت کا علم ہو جاتا تو وہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم جو اس حدیث کے راوی ہیں۔ ان پر طعن نہ کرتے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان میں ضعف ہے تو وہ ضعف اس درجہ کا نہیں کہ اس کی بنیاد پر اس روایت کو ساقط الاعتبار قرار دے کر ایسے مسئلہ کا انکار کر دیا جائے جو عقلاً اور شرعاً ہر طرح سے جائز ہے۔

المستدرک کی دونوں روایات کی حقیقت

قاضی السبکی صاحب کو امام ابن تیمیہؒ کی مخالفت نے علمی طور پر ایسا اندھا و بہرہ کر دیا تھا کہ انہوں نے مذکورہ روایات نقل کر کے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کے متعدد بار بیان

ہونے والے آدم علیہ السلام کے واقعہ کو بھی مسخ کر دیا۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ (۳۶) فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۳۷)﴾

پس شیطان نے اس کے بارے میں دونوں کو پھسلا دیا اور جس میں تھے وہاں سے نکال دیا۔ اور ہم نے کہا۔ نیچے اتر جاؤ۔ بعض تمہارا بعض کا دشمن ہوگا اور تمہارے لیے زمین میں ایک مدت تک قرار ہوگا۔ پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے تب اللہ نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوا:

﴿وَ قَاسَمَهُمَاۤ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (۲۱) فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (۲۲) قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (۲۳)﴾

اور شیطان نے ان کے سامنے قسم کھائی کہ بلاشبہ میں تم دونوں کا بہت ہی خیر خواہ ہوں۔ پھر پس دھوکے سے ان دونوں کو (ممنوعہ درخت کی طرف) مائل کیا۔ جب ان دونوں نے درخت کا پھل چکھا تو ان کی شرمگاہیں ان کے لیے کھل گئیں اور وہ دونوں اپنے اوپر جنتی پتے چپکانے لگے۔ ان دونوں کے رب نے ان دونوں کو آواز دی۔ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہ کیا تھا اور میں نے تم سے نہ کہا

تھا۔ بے شک شیطان تم دونوں کا کھلا کھلا دشمن ہے۔ ان دونوں نے عرض کیا۔ اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کرلیا اور تو نے اگر ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم ضرور گھاٹے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے خود آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ جب میاں بیوی سے اللہ کے حکم کی نافرمانی ہوگئی اور ان کو جنت سے زمین پر اتار دیا گیا۔ تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے چند کلمات سیکھے۔ اس واقعہ کی مزید وضاحت کے بعد اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان کلمات کے الفاظ کو سورۃ الاعراف کا حصہ بنا دیا اور واقعہ بیان ہونے میں کوئی انقطاع نہیں۔

سورۃ البقرہ میں اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ(۳۱)﴾

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں پر پیش کیا۔

لیکن قاضی صاحب کی پیش کردہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام پیدا کیے جانے سے پہلے ہی پڑھنا جانتے تھے۔ روح پھونکے جانے کے ساتھ ہی انہوں نے عرش پر لکھے ہوئے کلمات پڑھ لیے۔

لہٰذا قاضی صاحب کی نقل کردہ روایت قرآنی نص کے خلاف ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں۔ رہی بات عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے ضعیف ہونے کی تو قاضی صاحب نے خود ہی اس کا اقرار کیا ہے اور ائمہ رجال ابو جعفر محمد بن عمرو العقیلی المکی (المتوفی 322ھ) نے الضعفاء الکبیر (ج۲،ص۳۳۱) میں اور ابو احمد عبداللہ بن عدی الجرجانی (المتوفی 365ھ) الکامل فی ضعفاء الرجال، (ج4،ص1581) میں حدیث کے راوی کے بارے میں جو لکھا ہے وہ قاضی تقی الدین السبکی کے بیٹے قاضی القضاۃ تاج

الدین السبکی کے استاد اور قاضی تقی الدین کے ہمعصر محترم امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان الذہبی (المتوفی 748ھ) کی مشہور کتاب میزان الاعتدال (ج2،ص562-566) کے حوالے سے ذیل میں نقل کیا جارہا ہے:

عثمان الدارمی نے یحییٰ بن معین سے عبدالرحمٰن بن زید کے بارے میں روایت کی کہ وہ ضعیف تھا۔ امام بخاری نے علیؒ کے حوالے سے کہا۔ وہ بہت ضعیف تھا۔ امام نسائی نے بھی اس کو ضعیف کہا۔

امام شافعی سے مروی ہے کہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے ایک آدمی نے پوچھا: کیا آپ کے باپ نے آپ سے حدیث بیان کی کہ نوح علیہ السلام کی کشتی نے بیت اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم پر دو رکعتیں پڑھی۔ تو عبدالرحمٰن نے کہا: ہاں۔ یہ روایت تہذیب التہذیب (ج6،ص129) میں بھی منقول ہے۔ امام ابن الجوزی (المتوفی 597ھ) نے بھی کتاب الموضوعات (ج1،ص169) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

امام شافعیؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ امام مالک سے ایک شخص نے حدیث بیان کی۔ امام مالک نے پوچھا۔ تجھ سے یہ حدیث کس نے بیان کی۔ تو اس نے ایسی سند بتائی جو منقطع تھی۔ امام مالکؒ نے اس سے کہا: تم عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے پاس جاؤ۔ وہ تمہیں اپنے باپ کے حوالے سے حضرت نوح علیہ السلام کی حدیث بیان کرے گا۔

البدایة والنهایة (ج2،ص322) میں منقول ہے:

قال البیهقی تفرد به عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وهو ضعیف و اللّٰه اعلم

امام بیہقی نے کہا عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم اس میں متفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ایسے راوی کے ضعف کو معمولی ضعف کہہ کر اس کی منکر اور قرآنی نص کے خلاف

روایت کو قبول کرنا قاضی تقی الدین السبکی صاحب ہی کو یہ شرف حاصل تھا کیونکہ حق باتوں میں الجھاؤ پیدا کرنے میں وہ بہت ماہر تھے۔ قاضی تقی الدین السبکی صاحب نے امام حاکم کی جس المستدرك کا حوالہ دیا ہے۔ اتفاق سے اس کی تلخیص امام الذہبی نے رقم کی ہے اور اس روایت مذکورہ کے بارے میں انہوں نے لکھا:

بَلْ موضوعٌ و عبدالرحمٰن واہٍ...... رواہ عبداللّٰہ بن مسلم الفھری ولا ادری من ذا عن اسمعیل بن مسلمة عنه۔ بلکہ یہ من گھڑت ہے اور عبدالرحمٰن کمزور راوی ہے۔ عبداللہ بن مسلم الفھری نے اس کو اسمٰعیل بن مسلمہ سے نقل کیا ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون ہے۔

جامع الترمذی (ج2،ص108) میں امام ترمذی نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کو ضعیف کہا اور امام احمد بن حنبل اور علی بن المدینی نے بھی اس کو ضعیف کہا۔ ان دونوں کے علاوہ اہل الحدیث بھی اس کو ضعیف کہتے تھے۔

قاضی صاحب نے امام ابن تیمیہؒ کو لاعلمی کا طعنہ دیا۔ حالانکہ ان کی اپنی معلومات کا دائرہ ضعیف وموضوع روایات وحکایات تک محدود تھا۔ جیسا کہ ان کی کتاب سے واضح ہو رہا ہے۔

صحیح بخاری: کتاب التوحید میں ابوھریرہؓ سے مروی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

جب اللہ نے تخلیق کا معاملہ پورا کرلیا تو اس نے عرش پر لکھا:

میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام والی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ عرش ہلنے لگا اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس پر لکھنے سے ساکن ہوگیا۔

اس روایت کے بارے میں بھی امام الذہبیؒ کا بیان ہے کہ میرے خیال کے مطابق

یہ سعید کے نام پر گھڑی گئی ہے اور انہوں نے میزان الاعتدال (ج3،ص246) میں بھی یہی بات کہی ہے کیونکہ روایت میں دو سعید ہیں، دونوں روایتوں میں لَو لَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ اور مَا خَلَقْتُ آدَمَ کے ساتھ جنت اور جہنم کا بھی ذکر ہوا ہے۔

امام ابن الجوزی نے کتاب الموضوعات (ج1،ص289) میں سلمانؓ کے نام سے مروی روایت نقل کی ہے جس کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

وَلَولَاكَ يَا مُحَمَّد مَا خَلَقْتُ الدُّنيا

اے محمد ﷺ! اگر آپ نہ ہوتے تو میں دنیا پیدا ہی نہ کرتا۔

امام ابن الجوزی کا فیصلہ ہے کہ یہ حدیث بغیر کسی شک کے من گھڑت ہے۔

اگر اس روایت پر غور کیا جائے تو کوئی اچھا نتیجہ اس سے اخذ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو کچھ دنیا میں ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے یا ہوگا۔ اس کی وجہ کون بنتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلك) اسی لیے یہ روایت جھوٹی ہے۔

علامہ محمد بن علی الشوکانی (المتوفی 1250ھ) نے الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعة (ص326) میں الدنیا کی بجائے اَلْاَفلَاك کا لفظ نقل کر کے صغانی کے حوالے سے لکھا ہے۔ یہ بھی من گھڑت ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کی لسان المیزان (ج4،ص408) میں عمرو بن اوس کے ترجمہ (رقم 6299) میں ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ محمد ﷺ پر ایمان لے آؤ۔ اگر وہ نہ ہوتے تو میں آدم کو پیدا نہ کرتا اور نہ ہی جنت و دوزخ کی تخلیق کرتا۔

سند پر بحث کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ عمرو بن اوس مجہول الحال ہے اور وہ منکر خبر لایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جندل بن والق کے طریق سے روایت موضوع ہے۔

جن دو روایتوں پر قاضی صاحب نے وسیلہ توسل کی انتہائی مبالغہ آمیز بحث کی بنیاد رکھی ہے۔ وہی من گھڑت ہیں تو اس کے بعد ہونے والی بحث کا حال کیا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں اسلامی تصور

اسلام ہی دنیا میں ایک واحد دین ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا تصور ہر قسم کی آلائش سے پاک ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ نے بار بار اپنے غفور رحیم ہونے کا اعلان کیا ہے۔ جب بھی کوئی گناہگار وسیاہ کار تائب ہو کر اس کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے تو بغیر کسی کی سفارش وشفاعت کے وہ اس کو نہ صرف معاف کر دیتا ہے، بلکہ اس کے گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

سورۃ الفرقان کے الفاظ ہیں:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا(۷۰)﴾

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے تو وہی ہیں کہ جن کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ اچھائیوں میں تبدیل کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔

سورۃ آل عمران میں ارشاد ہوا:

﴿وَ الَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَکَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ(۱۳۵) اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ(۱۳۶)﴾

اور وہ لوگ جو فحاشی کا کوئی کام کر لیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر لیں پھر وہ اللہ کو یاد کریں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ اور جو انہوں نے کہا۔ اس پر ڈٹے نہ رہیں اور وہ یہ جانتے ہیں۔ وہی ہیں کہ جن کی جزا ان کے رب کی طرف سے بخشش اور ایسے جنتی باغات ہوں گے کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ اجر عمل کرنے والوں کے لیے ہوگا۔

قاضی تقی الدین السبکی نے سورۃ النساء کی جس آیت نمبر 64 کا بار بار حوالہ دیا ہے وہ منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی اور سورۃ ال عمران میں اللہ تعالیٰ ایمان والوں سے مخاطب ہوا اور یہاں کسی شفاعت وسفارش کا ذکر نہیں ہوا۔ بلکہ مسلمانوں میں سے ہر مسلمان کو خوشخبری دی گئی ہے کہ جب اس سے گناہ کا کوئی کام ہو جائے تو فوراً توبہ کر کے نیک عملوں میں لگ جائے تو اللہ اس کو نہ صرف معاف فرمائے گا بلکہ بخشش و جزا سے نوازے گا۔

سورۃ الزمر میں اعلان عام ہے اور اعلان بھی سید الانبیاء کے ذریعے ہی ہوا:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۵۳) وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۵۴)﴾

آپ کہہ دیں۔ اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی۔ اللہ کی رحمت سے تم مایوس نہ ہونا۔ بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔ اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور تم تک عذاب کے پہنچنے سے پہلے تم اس کے فرمانبردار ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ

پھر تمہاری مدد نہ کی جائے۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و بخشش کو کسی کی شفاعت و سفارش سے مشروط نہیں کیا۔ بلکہ تمام خطا کاروں اور اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کو یقین دلایا ہے کہ ان کا رب بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ اس کی طرف رجوع کیا جائے اور اس کی فرمانبرداری کا عملی مظاہرہ کیا جائے۔

سورۃ غافر میں مزید وضاحت یوں ہوتی ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِیٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (٦٠)﴾

اور تمہارے رب نے فرمایا، مجھ کو پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ بے شک وہ لوگ جو اس کی عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل و رسوا ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

اس سے بڑھ کر یقین دہانی اور کیا ہو سکتی ہے اور یہاں اللہ کو پکارنے کو اللہ نے اپنی عبادت قرار دیتے ہوئے اس کا انکار کرنے والوں کو جہنم کی وعید سنائی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یقین دہانی اس لیے کرائی کہ اہل مکہ اپنے بتوں کو اللہ کے ہاں سفارشی بنایا کرتے تھے۔ سورۃ یونس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے عقیدہ کے بارے میں خود ہی فرمایا ہے کہ ان کا کہنا تھا:

﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (١٨)﴾ یہ اللہ کے نزدیک ہمارے سفارشی ہیں۔

یہود و نصاریٰ میں یہی عقیدہ رائج تھا۔ اسی عقیدہ کو قاضی السبکی صاحب نے بھی اسلام کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

وسیلہ وتوسّل کی بحث

قاضی صاحب نے رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ سے پہلے وسیلہ وتوسل کی صورت کے جائز ہونے پر جن دوروایات کا المستدرك کے حوالے سے ذکر کیا۔ان کے من گھڑت ثابت ہونے پر نہ صرف وہ صورت بے اصل ہوگئی، بلکہ قاضی صاحب کی پوری بحث ہی بے وزن ہوگئی۔

دوسری صورت رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں آپ سے دعا کرانا یا آپ کے سامنے اپنی حاجات کا ذکر کرنا تھا۔ یہ ایسی صورت ہے کہ اس میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ وہ صحابہ بہت ہی خوش نصیب تھے جن کے لیے آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے ان کی حاجتوں پر خصوصی توجہ فرمایا کرتے تھے۔

اسی لیے ہر زمانے میں زندہ صالح بزرگوں سے دعا کرانا بھی مشروع رہا ہے۔یہ تو ایسی صورت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر خود بھی عمل فرمایا۔

جامع الترمذی، ابواب الدعوات (ج2،ص218) اور سنن ابو داؤد، کتاب الصلوۃ (ص210) میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے عمرہ کرنے کی اجازت چاہی۔آپ نے نہ صرف اجازت دی بلکہ آپ نے فرمایا:

اَیْ اُخَیَّ اَشْرِکْنَا فِیْ دُعَائِكَ وَلَا تَنْسَنَا

اے میرے چھوٹے بھائی! اپنی دعا میں ہمیں بھی شریک رکھنا،ہمیں بھول نہ جانا۔

رہی بات تیسری صورت کی کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس جا کر آپ سے دعا کرنے یا حاجات کو پورا کرنے کی درخواست کرنا یا اپنی دعاؤں میں آپ کو وسیلہ بنانا، تو یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا معمول نہ تھا۔رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ وتابعین کو بڑی بڑی

آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا لیکن کسی نے یہ کام نہ کیا۔ لیکن قاضی صاحب نے اس کو دین کا حصہ بنانے پر پورا زور صرف کر دیا۔

قاضی صاحب کی دلیل یہ ہے کہ مانگنے والا اللہ ہی سے مانگتا ہے مگر نبی ﷺ کو وسیلہ بنانے سے دعا قبول ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر آپ کو وسیلہ نہ بنایا تو دعا قبول نہ ہوگی۔ یہ ایسی سوچ ہے جو قرآن وحدیث کی سراسر مخالفت ہے۔

سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ کی یقین دہانی ہے:

﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (١٨٦)﴾

جب بھی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے جب یہاں کوئی شرط دعا کی قبولیت کے لیے نہیں لگائی تو جو اپنی طرف سے شرط عائد کر دے یا قبولیت کے لیے اس کو سبب قرار دے تو ظاہر ہے کہ وہ اللہ کی مخالفت ہوگی۔ جن نبیوں علیہم السلام کا قرآن حکیم میں ذکر ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے بغیر کسی وسیلہ کے رب العالمین کو ہی پکارا اور قبول کرنے والے نے ان کی پکار سنی اور ان کی مشکلات میں ان کی مدد کی۔

صحیح بخاری: کتاب التوحید (ص 1116) میں ابوہریرۃؓ سے مروی ہے:
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جب رات کا آخری ایک تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو ہمارا رب دنیا کے آسمان پر ہر رات نزول فرماتا ہے اور اعلان کرتا ہے: کون ہے جو مجھے پکار رہا ہے تاکہ میں اس کی پکار کا جواب دوں۔ کون مجھ سے مانگ رہا ہے تاکہ میں اس کو عطا کروں۔ کون مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہ رہا ہے تاکہ میں اس کو معاف کر دوں۔

اسلام کی بنیادی تعلیم ہی یہی ہے کہ اللہ کو پکارا جائے۔ اس کے بارے میں مشرکوں اور غیر مسلموں والا عقیدہ نہ رکھا جائے۔ اس کی مخلوق میں جس طرح بڑے لوگوں تک

پہنچنے کے لیے کسی سفارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ خالق و مالک تک پہنچنے اور اس کے مانگنے کے لیے کسی سفارش وسیلہ یا توسل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ہر جھکنے والے پر اپنی رحمتوں اور بخشش کی بارش برسا دیتا ہے۔

قاضی صاحب نے بنی اسرائیل کے تین شخصوں والی حدیث کا ذکر کیا جو ایک غار میں بند ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے نیک اعمال کا ذکر کر کے دعا کی تو اللہ نے ان کی مشکل آسان کر دی۔ قاضی صاحب نے اس خوبصورت حدیث کو، ایک نیا رنگ دے دیا۔ حالانکہ اس حدیث میں بتایا یہ گیا ہے کہ انسان کے نیک اعمال دنیا اور آخرت میں اس کی نجات کا سبب بنتے ہیں۔

قاضی صاحب نے یہ بھی فرمادیا کہ نبی ﷺ کو وسیلہ بنا کر دعا مانگنے میں کیا قباحت ہے۔

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ یہ اسلامی طریقہ نہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔

قاضی صاحب نے کوڑھے، گنجے اور اندھے والی حدیث کا بھی حوالہ دیا۔ جن کو آزمائش کے طور پر ان کی خواہش کے مطابق صحت و مال سے نواز گیا۔ لیکن اللہ کے نام پر ان سے جب مانگا گیا تو اندھے کے سوا کوڑھے اور گنجے نے نہ دیا۔ جس بنا پر دونوں کو پھر سے ان کی پہلی حالت میں لوٹا دیا گیا اور اندھے کو ملنے والی بینائی اور مال اسی کے پاس اس لیے رہنے دیا گیا کہ اس نے عملی طور پر اقرار کیا کہ جو کچھ اس کو ملا ہے اس کا عطا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ جو بہترین شکرانے کی صورت تھی۔

یہاں بھی قاضی صاحب نے غلط استدلال کرتے ہوئے اللہ کے واسطے کو اللہ کے نبی کے واسطے سے ملا دیا۔ اللہ کو بغیر وسیلہ کے نہ پکارنے میں یہی قباحت ہے۔

قاضی صاحب نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس گفتگو کا بھی ذکر کر دیا کہ جو رسول اللہ ﷺ کی بیماری کے آخری دنوں اور آپ کی وفات کے بعد فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی۔

فاطمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ نے جب اپنی وفات کا ذکر کیا تو وہ رونے لگ گئیں اور جب آپ نے ان کو جنتی عورتوں کی سردار ہونے اور سب سے پہلے وہاں ملنے کی بشارت دی تو وہ ہنسنے لگیں۔ عائشہؓ نے جب اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے راز کو ظاہر کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب آپ فوت ہو گئے تو عائشہ رضی اللہ عنہا کے پوچھنے پر فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وہ بات بتا دی۔ اس روایت کے راوی مسروق اور عروہ ہیں۔ مسروق کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں جو صحیح مسلم میں منقول ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا "میں تجھے اس حق کا واسطہ دیتی ہوں جو تجھ پر میرا ہے۔" حق یہ تھا کہ وہ ان کی سوتیلی ماں تھیں۔ الاصابہ، اسد الغابۃ، بخاری اور طبقات ابن سعد میں مروی روایت میں ان الفاظ کا ذکر نہیں ہوا۔

یہاں بھی قاضی صاحب کی دلیل یہ ہے کہ جب عائشہ حق کی بات کر سکتی ہیں تو نبی ﷺ کے حق کا واسطہ اللہ کو کیوں نہیں دیا جا سکتا۔ (اللہ ہم پر رحم کرے) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعا میں حق یا واسطہ کا ذکر ان کے نزدیک ضروری تھا۔

جبکہ اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے۔ جو بھی مجھے پکارے گا میں اس کی پکار کا جواب دوں گا۔

حضرت عثمان بن حنیف کی روایت

قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی صاحب نے ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور بیہقی کے حوالے سے عثمان بن حنیف سے نقل کیا ہے کہ ایک ضریر البصر آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مترجم نے ضریر البصر کا ترجمہ 'نابینا' کیا ہے جبکہ نابینا کے لیے اعمی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں مناسب ترجمہ کمزور نظر والا یا جس کی بینائی میں نقص واقع ہو چکا تھا، اس نے عرض کیا:

اُدْعُ اللّٰہَ اَنْ یُعَافِیَنِی اللہ سے دعا کر دیں، وہ مجھے عافیت عطا فرمائے۔

یعنی میری بینائی میں جو نقص واقع ہو چکا ہے اس کو دور کر دے۔

آپ نے فرمایا: اگر تو چاہے تو میں تیرے لیے دعا کیے دیتا ہوں اور اگر تو صبر کرے تو تیرے لیے بہتر ہوگا۔

اس آدمی نے کہا۔ آپ میرے لیے دعا کر دیں۔ آپ نے اس کو وضو اور اچھی طرح وضو کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگے:

اے اللہ! میں تجھ سے سوال کر رہا ہوں اور نبی الرحمۃ تیرے نبی محمد ﷺ کے ذریعے تیری طرف متوجہ ہوں۔ اے محمد! میں آپ کے ذریعے اپنی حاجت کے لیے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں تا کہ وہ اس کو پورا کر دے۔ اے اللہ! ان کی شفاعت میرے بارے میں قبول فرما۔

روایت کا تجزیہ

یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک کا ہے۔ آپ کے پاس جو سائل بھی آتا۔ آپ اس کی حاجت پوری کرنے میں پوری کوشش فرمایا کرتے تھے۔ صحیح مسلم: باب استحباب الشفاعة فیما لیس حرام (ج2، ص330) میں ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ کے پاس حاجت طلب کرنے والا کوئی آتا تو آپ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرماتے۔ اس کی سفارش کرو تمہیں اجر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے وہ فیصلہ کرائے گا کہ جو اس کو پسند ہے۔

قاضی صاحب کی بیان کردہ روایت میں جو اصل تعلیم والی بات تھی قاضی صاحب کی بصیرت نے اس پر غور و فکر کرنے اور اس کو آگے بڑھانے کی بجائے۔ اس بات پر زور دیا

جو اسلام میں غیر ضروری ہے۔اصل بات صبر کرنے کا مشورہ تھا۔ اگر صبر کرو گے تو تمہارے لیے بہتر ہو گا۔ کیونکہ صبر کرنے والوں کے لیے قرآن حکیم میں بہت بڑی بشارت ہے۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۱۵۳)﴾ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

سورۃ الزمر میں بشارت کی مزید وضاحت یوں ہوتی ہے:

﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۱۰)﴾ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب دیا جائے گا۔

صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب فضل من یصرع من الریح (ص833)، صحیح مسلم (ج2،ص319) اور مسند احمد (ج1،ص347) میں عطاء بن ابی رباح سے مروی ہے۔ مجھ سے ابن عباس نے کہا: کیا میں تجھے ایک جنتی عورت نہ دکھاؤں۔ میں نے عرض کیا: ضرور دکھائیں۔ انہوں نے کہا: یہ سیاہ رنگ والی عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور اس نے کہا۔ میں بیماری کی وجہ سے گر جاتی ہوں اور میرا ستر کھل جاتا ہے۔ اللہ سے میرے لیے دعا کر دیں۔

آپ نے فرمایا: اگر تو چاہے کہ صبر کرے تو تیرے لیے جنت ہو گی اور اگر تو چاہے تو میں دعا کیے دیتا ہوں کہ وہ تجھے عافیت سے نواز دے اور تیری بیماری دور ہو جائے۔ اس عورت نے کہا: میں صبر کروں گی۔ لیکن میرے لیے اللہ سے یہ دعا کر دیں کہ گرنے کی وجہ سے میرا ستر نہ کھلا کرے۔ آپ نے اس کے لیے دعا فرما دی۔

اس عظیم عورت نے بیماری میں صبر کرنے کے بدلے جنت کا سودا منظور کر لیا۔

صحیح بخاری، (ص844) کے متصل باب فضل من ذھب بصرہ۔ میں انسؓ بن مالکؓ سے مروی ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جب میں اپنے بندے کو اس کی دو پیاری آنکھوں کی ابتلا میں ڈالتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو ان آنکھوں کے بدلے میں اس کو جنت دے دیتا ہوں۔

اس واقعہ میں صبر کی فضیلت بیان ہونے کے ساتھ علم الابدان میں زبردست راہنمائی یہ مہیا کی گئی ہے کہ آنکھوں کی مختلف امراض کا علاج ممکن ہے۔ جو دوا اور دعا دونوں سے ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود بیماری دور نہ ہو تو صبر کر کے جنت میں جگہ حاصل کی جائے۔

رہی بات آپ کے واسطے کی تو روایت سے واضح ہوتا ہے کہ جب صبر کرنے کا مشورہ دعا کرانے کے خواہشمند نے قبول نہ کیا تو آپ نے نبی الرحمہ ہونے کے ناتے ناراضی کا اظہار کرنے کی بجائے شفاعت پر مبنی دعائیہ کلمات سکھا دیے اور اس کو خود دعا کرنے کا حکم دیا۔ اس نے دعا کرتے ہوئے بارگاہ الٰہ میں عرض کیا: اے اللہ! میرے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت قبول فرما۔ اللہ نے وہ قبول فرمائی اور اس کی بیماری دور ہوگئی۔

ضعیف ومنکر واقعہ

قاضی السبکی صاحب نے آنکھوں کی بیماری والے آدمی کے واقعہ کو بنیاد بنا کر طبرانی کے حوالے سے حسب ذیل ضعیف ومنکر واقعہ بھی نقل کیا ہے:

ایک آدمی اپنی ضرورت پوری کرانے کے لیے حضرت عثمان غنیؓ کے پاس چکر کاٹا کرتا تھا۔ مگر وہ نہ اس کی طرف دیکھتے اور نہ اس کی حاجت پر غور کرتے۔ وہ

آدمی حضرت عثمانؓ بن حنیف سے ملا اوران سے شکایت کرتے ہوئے اس کا ذکر کر دیا۔تو انہوں نے کہا:

وضو کر اور مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھ اور اس کے بعد دعا کر۔اے اللہ! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں اور تیری طرف ہمارے نبی محمد نبی الرحمۃ کے ذریعے متوجہ ہوتا ہوں۔اے محمد! اِنِّی اَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ اِلٰى رَبِّكَ فَيَقْضِیَ حَاجَتِیْ۔ بے شک میں آپ کی طرف متوجہ ہو کر آپ کے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تا کہ وہ میری حاجت پوری کر دے۔

میرے پاس شفاء السقام کے بن دو نسخے ہیں۔ دونوں میں یہی عبارت ہے۔ جبکہ طبرانی کی المعجم الکبیر میں عثمان بن حنیف کے ترجمہ رقم 765، الجزء التاسع، حدیث رقم 8311 میں مذکورہ عبارت کی بجائے۔ اَتَوَجَّهُ بِكَ اِلٰى رَبِّی یعنی میں آپ کے ذریعے اپنے رب کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں تا کہ وہ میری حاجت پوری کر دے۔

عثمانؓ بن حنیف نے یہ بھی کہا: پھر اپنی حاجت کا ذکر کرنا۔تو چل میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ وہ آدمی گیا اور اس نے اسی طرح کیا کہ جس طرح عثمانؓ بن حنیف نے اس سے کہا تھا۔ پھر وہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دروازے پر آیا۔ دربان نے آ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کو عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس لے جا کر ان کے ساتھ دری پر بٹھا دیا۔

عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: تیری کیا حاجت ہے۔ اس نے حاجت بتائی تو انہوں نے پوری کر دی اور یہ بھی کہا کہ تو نے اس وقت تک اپنی حاجت کا ذکر ہی نہ کیا۔(یا اس وقت سے پہلے مجھے تیری حاجت یاد ہی نہ آئی) جو بھی تیری حاجت ہو اس کا ذکر کر دیا کرو۔

وہ آدمی عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس سے نکلا اور عثمانؓ بن حنیف سے ملاقات کر کے ان

کا شکریہ ادا کیا اور ان کے لیے بھلائی کی دعا کی اور کہا وہ تو نہ میری طرف دیکھتے اور نہ ہی میری حاجت کی پروا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ نے ان سے میرے بارے میں بات کی۔

عثمانؓ بن حنیف نے قسم کھا کر کہا: میں نے ان سے بات نہیں کی بلکہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ کے پاس آنکھوں کی بیماری کی وجہ سے بینائی سے محروم ہونے والا ایک آدمی آیا اور اس نے بینائی کے چلے جانے کی شکایت کی۔

نبی ﷺ نے فرمایا: کیا تو اس پر صبر کر سکتا ہے۔ اس نے عرض کیا: میرا ہاتھ تھام کر مجھے لانے لیجانے والا کوئی نہیں اور یہ تکلیف مجھ پر بہت بھاری ہو گئی ہے۔

نبی ﷺ نے اس سے فرمایا: وضو والی جگہ پر جا کر وضو کرو، پھر دو رکعت نماز پڑھو اور مذکورہ دعائیہ الفاظ کے ساتھ دعا کرو۔ یعنی دعا کا ذکر حکایۃً تھا۔

عثمانؓ بن حنیف کا بیان ہے۔ اللہ کی قسم! ہم وہاں سے اٹھے بھی نہ تھے اور نہ باہمی گفتگو لمبی ہوئی تھی کہ آدمی ہمارے پاس ایسے آیا گویا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ تھی۔

امام طبرانی نے مذکورہ بالا روایت کو نقل کرنے کے بعد ادریس بن جعفر العطار والی سند بھی نقل کر دی ہے۔

المعجم الکبیر، المعجم الاوسط اور المعجم الصغیر

یہ تینوں کتابیں امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب اللخمی الطبرانی کی ہیں۔ پہلی میں انہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی روایات کو جمع کیا ہے۔ دوسری ان کے استادوں کی بیان کردہ غرائب روایات کا مجموعہ ہے اور تیسری میں انہوں نے اپنے ہر استاد سے ایک ایک روایت نقل کی ہے۔

امام طبرانی 260ھ میں 'عکا' کے مقام پر یمنی قبیلہ لخم میں پیدا ہوئے اور ایک سو سال کی عمر پانے کے بعد اصفہان میں 360ھ میں رب حقیقی سے جا ملے۔ انہوں نے حصول علم کے لیے شام، حجاز، یمن، مصر، عراق، بلاد الفرس وغیرہ کے سفر کئے اور تقریباً ایک ہزار شیوخ سے سماعِ حدیث کیا اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہونے کا ان کو شرف حاصل ہوا۔ لیکن ان کے زمانہ میں بھی رافضیوں کا غلبہ تھا جس کی بنا پر عمر کے آخری حصہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بعض باتوں پر انہوں نے اعتراض کرنے شروع کر دیے تھے۔ جیسا کہ امام الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (ج3، ص915) میں ابو عمر بن عبدالوہاب اسلمی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

چونکہ ان کی جمع کردہ روایات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لیے ان میں صحیح حسن ہونے کے ساتھ بہت سی روایات ضعیف و موضوع بھی ہیں۔ انہوں نے روایات کو جمع کرنے میں صحاح ستہ کے مؤلفین جیسا اہتمام نہیں کیا بلکہ روایات کی صحت کا خیال رکھے بغیر ان کو جمع کرنے میں اپنی زندگی گزار دی۔

امام بخاریؒ نے لاکھوں مرویات میں سے تکرار کے بغیر تقریباً چار ہزار احادیث کو اپنی صحیح میں جمع کیا۔ اگر وہ بھی اپنے استادوں سے سنی ہوئی تمام روایات جمع کر دیتے تو وہ لاکھوں میں ہوتیں۔ لیکن انہوں نے 16 سال میں ایسی کتاب لکھ دی جس کو قرآن حکیم کے بعد سب سے صحیح کتاب تسلیم کیا گیا۔

جبکہ امام طبرانی کی مذکورہ کتابوں میں تفرد کا انکار ممکن نہیں۔ حافظ ابو بکر ابن مردویہ نے طبرانی کے غلط ہونے اور بھول جانے کی بنا پر ان کو کمزور راوی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج2، ص195) اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان (ج3، ص83، رقم 3893) میں نقل کیا ہے۔ جس احمد سے انہوں نے مغازی

بیان کی اس کی موت ان کے مصر میں داخل ہونے سے دس سال پہلے ہو چکی تھی۔

لسان المیزان میں یہ بھی منقول ہے: ابن مردویہ کا کہنا ہے: میں بغداد گیا اور ادریس بن جعفر العطار عن یزید بن ھارون اور روح بن عبادۃ کی احادیث تلاش کیں جو مجھے چند گنتی کی ملیں۔ جبکہ طبرانی نے ان سے بہت سی احادیث نقل کی ہیں۔

حافظ ابن حجر کا تجزیہ ہے کہ طبرانی کی الشیخ ادریس سے ملاقات ہوئی اور جوان سے ملاوہ لے لیا۔ حالانکہ بغدادیوں کے نزدیک ادریس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے ان سے زیادہ احادیث اخذ نہ کیں۔

ابوبکر بن ابی کا کہنا ہے: طبرانی وسیع العلم اور کثیر التصانیف تھے۔ لیکن اسماعیل بن محمد بن الفضل الیتمی نے ان کی احادیث میں عیب جوئی کی ہے۔ کیونکہ ان میں تفرد اور سخت نکارت والی روایات کے ساتھ موضوعات (من گھڑت) بھی ہیں۔

حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الھیثمی (المتوفی 807ھ) نے مجمع الزوائد و منبع الفوائد کے نام سے آٹھ اجزا میں زوائد مسند احمد، ابویعلی الموصلی، ابوبکر البزار اور طبرانی کی معاجیم کو جمع کیا ہے۔ ان میں سب سے زیاد تعداد میں ضعیف و موضوع روایات طبرانی کی ہیں۔

ضعیف و منکر واقعہ کا تجزیہ

المعجم الکبیر (ج9، ص17، مکتبہ ابن تیمیہ، القاہرہ) اور المعجم الصغیر (ج1، ص183-182) (عباس احمد الباز، مکۃ المکرمۃ) میں اس آدمی کا واقعہ بیان مذکور ہے جو عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس چکر لگایا کرتا تھا۔ لیکن وہ نہ اس کی طرف دیکھتے اور نہ ہی اس کی حاجت پر غور کرتے تھے۔ عثمان بن حنیف کے کہنے پر جب اس نے نماز پڑھ

کر وہ دعا کی جو رسول اللہ ﷺ نے ضریر البصر کو سکھائی تھی۔ تو عثمان غنی رضی اللہ عنہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی حاجت پوری کر دی۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس قصہ کو نقل کرنے والوں نے اس سے وہ نتیجہ اخذ نہیں کیا اور نہ ہی اس پر وہ عنوان باندھا جس کو قاضی السبکی صاحب نے اپنی دلیل بنایا ہے اور اگر اس قصہ کی کوئی اہمیت یا اس کی صحت قابل توجہ ہوتی تو جامع الترمذی، مسند احمد، المستدرك اور سنن ابن ماجه میں عثمان بن حنیف کے بیان کردہ ضریر البصر آدمی کے واقعہ کے ساتھ ہی منقول ہوتا اور یہ بھی عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر بہتان کی ایک صورت ہے کہ وہ حاجتمند انسان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ پانچ نمازیں مسجد میں پڑھاتے اور جمعہ کے دن خطبہ دیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں کہنا کہ چکر لگانے والے کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ یہ عثمان رضی اللہ عنہ کے اخلاق عالیہ کے خلاف ہے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک میں دعا کرانے والوں کے واقعات ہیں۔ تو ان میں اختلاف والی کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ جب عام انسانوں کی دعائیں قبول فرماتا ہے تو سید الانبیاء کی دعا مبارک کا قبول ہونا زیادہ اولیٰ تھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپ کی وفات کے بعد یہ معمول نہ تھا کہ آپ کی قبر مبارک کے پاس آکر آپ کو دعا کرنے کے لیے کہا کرتے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عباس رضی اللہ عنہ کے توسل سے دعا کرنا

صحيح بخاری: ابواب الاستسقاء، باب سوال الناس الامام اذا قحطوا، (ص 137) میں انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے مروی ہے۔ جب لوگ قحط سالی کا شکار ہوتے تو امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب کے ذریعے اللہ سے بارش برسانے کی دعا کیا کرتے تھے اور کہتے اے اللہ! ہم نبی ﷺ کو تیری طرف وسیلہ بنایا کرتے تھے

اور اب تیری طرف اپنے نبی ﷺ کے چچا کو وسیلہ بنا رہے ہیں۔ پس ہم پر بارش برسا دے۔ راوی کا بیان ہے کہ لوگوں پر بارش برسائی جاتی تھی۔

مصنف عبدالرزاق (ج3، ص93-92) میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: مصلیٰ میں عمر رضی اللہ عنہ نے بارش کے لیے دعا کی۔ پھر عباس رضی اللہ عنہ سے کہا: کھڑے ہوں اور دعا کریں۔ چنانچہ انہوں نے دعا کر دی۔ مصنف میں مذکور دعائیہ الفاظ ان سے مختلف ہیں جن کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری (ج2، ص497) میں نقل کیا ہے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عمل کی حقیقت

مذکورہ روایت سے واضح اور ثابت ہو گیا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی وفات کے بعد آپ سے دعا کرانے کے لیے قبر مبارک کے پاس حاضر نہیں ہوا کرتے تھے، بلکہ زندہ امام کے پاس آتے تھے۔ امام خود بھی دعا کرتا اور زندہ بزرگ سے بھی دعا کرایا کرتے تھے۔ زندہ کا زندہ سے دعا کرانے میں کوئی اشکال نہیں، بلکہ یہی مسنون طریقہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہر بات اور ہر معاملہ آپ کی طرف لوٹایا جاتا تھا اور آپ کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ الصدیق کی خلافت میں ہر معاملہ انہی کی طرف لوٹتا تھا کیونکہ اسلامی ریاست کے وہی سربراہ تھے۔ جب وہ بھی اللہ کے پاس چلے گئے تو لوگ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس اپنی حاجتوں کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز تھے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ دس سال مسلمانوں کے امیر رہے۔ ایران اور شام کے خلاف جنگوں کا زبردست سلسلہ جاری رہا۔ لیکن کسی بھی موقع پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر مدد کے لیے آپ کو نہ پکارا۔

البدایۃ والنہایۃ (ج7، ص65) میں مسلمانوں اور مدائن کے درمیان جب دریائے دجلہ حائل ہو گیا تو امیر لشکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ساتھیوں کو یہ دعا کرتے ہوئے دریا میں داخل ہونے کا حکم دے دیا:

نَسْتَعِيْنُ بِاللّٰهِ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمُ

ہم اللہ سے مدد چاہتے ہیں اور اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ اللہ ہی ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین وکیل ہے اور گناہوں سے بچنے اور نیکی کرنے کی توفیق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتی ہے جو بہت ہی بلند و عظیم ہے۔

عمر فاروق اپنے امراء کو لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ والا جملہ کثرت سے کہنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو جب قیساریہ کا والی بنایا تو ان کو بھی حکم دیا: دشمن کی طرف بڑھو ان کے خلاف اللہ سے مدد چاہو اور کثرت سے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کا ورد کرتے رہو۔ اللہ ہی ہمارا رب اور ہماری قوت اور ہماری امید اور ہمارا مولا ہے اور وہ بہت اچھا مولیٰ اور بہترین مددگار ہے۔

انہوں نے کبھی قبر مبارک پر جا کر آپ کو اپنی دعاؤں میں وسیلہ نہیں بنایا۔ عباس رضی اللہ عنہ کو ساتھ لا کر خود دعا کرنے کے بعد ان سے دعا کرائی۔

قاضی السبکی صاحب نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عمل و معمول کے باوجود یہ کہنے کی جرأت کی کہ اس سے توسل کا انکار لازم نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عمل و معمول کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اعجب العجائب تو یہ ہے کہ حضرت قاضی صاحب نے دلائل النبوہ کے حوالے سے یہ روایت بھی نقل کر دی کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک

کے پاس آیا اور عرض کیا۔ اللہ کے رسول! اپنی امت کے لیے اللہ تعالیٰ سے بارش برسانے کی دعا فرمائیں کیونکہ امت برباد ہو رہی ہے۔ جب وہ شخص سویا تو خواب میں نبی ﷺ نے اس سے فرمایا: عمرؓ کے پاس جاؤ۔ اس کو ہمارا سلام کہو اور اس کو بتا دو کہ بارش ہو گی۔ ان سے یہ بھی کہنا کہ سمجھداری سے کام لو، سمجھداری سے۔ وہ شخص عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور جب سارا واقعہ سنایا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ رونے لگے اور انہوں نے کہا: اے رب میں تو اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔

قاضی صاحب کا فرمان ہے۔ اس روایت سے بتانا یہ مقصود ہے کہ نبی ﷺ کے وصال کے بعد برزخی زندگی میں بھی آپ سے بارش کی دعا کے لیے درخواست کی جا سکتی ہے۔ اس حالت میں بھی نبی ﷺ سے دعا کرانا کوئی امر مانع نہیں۔ کیونکہ سائل کے سوال کا آپ کو علم ہوتا ہے۔ اس بارے میں وارد ہونے والی اخبار کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اور کچھ مزید کریں گے، لہٰذا اس میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ جس طرح دنیاوی زندگی میں بارش کے لیے دعا کیا کرتے تھے اسی طرح برزخی زندگی میں بھی دعا فرمائیں۔

قاضی صاحب نے یہاں جو فرمایا: صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کا اگر علم ہوتا تو وہ عباس رضی اللہ عنہ سے دعا کرانے کی بجائے آپ کی قبر مبارک پر جاتے اور ضرور آپ سے دعا کراتے۔ بغیر نام کے جس آدمی کا ذکر ہوا ہے اس کو خواب میں حکم دینے کی بجائے رسول اللہ ﷺ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حکم کیوں نہ دیا۔ کیا اس آدمی کا مرتبہ اور شان عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ارفع و اعلیٰ تھا۔ جبکہ صحیح بخاری: مناقب عمر بن الخطاب میں ہے: سید الانبیاء ﷺ نے تو خواب میں دیکھے گئے جنتی محل کی ان کو بشارت دی اور آپ نے یہ بھی فرمایا: اے ابن الخطاب! قسم ہے اس کی کہ جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ جس راہ پر تم چلتے ہو، شیطان وہ راہ چھوڑ دیتا ہے۔

معلوم نہیں کہ قاضی السبکی جیسے علامہ سے مصنف عبدالرزاق (ج3، ص93) میں مروی روایت کیوں اوجھل رہی۔ حالانکہ وہ ان کے موقف میں زیادہ مؤثر تھی۔

عبداللہ بن عبید بن عمیر سے مروی ہے۔ لوگوں پر قحط پڑا۔ صحرا میں ایک آدمی نے اپنے ساتھیوں کو دو رکعت نماز پڑھانے کے بعد بارش کے لیے دعا کی۔ پھر وہ سو گیا اور اس نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اس کے پاس آئے اور آپ نے فرمایا عمر رضی اللہ عنہ کو میرا اسلام کہو اور اس کو بتا دو کہ اللہ نے تمہاری دعا قبول کر لی ہے۔ کیونکہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے باہر آ کر بارش کے لیے دعا کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس آدمی کو یہ بھی حکم فرمایا کہ وہ عہد و عقد کو سختی سے پورا کرے۔

چنانچہ وہ شخص عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دروازے پر آیا اور کہا: رسول اللہ ﷺ کے پیغامبر کے لیے ان سے اجازت لی جائے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی یہ بات سن لی اور کہا۔ رسول اللہ ﷺ پر افتراء کرنے والا کون ہے؟

اس آدمی نے عرض کیا۔ امیر المومنین! میرے بارے میں ذرا جلدی نہ کریں، بلکہ میری بات سن لیں۔ چنانچہ اس نے سارا واقعہ بیان کیا جس کو سن کر عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔

پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ صحاح ستہ کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابوں میں بہت سی ایسی روایات مذکور ہیں جو ائمہ رجال کی پرکھ کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اور افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ قاضی السبکی صاحب نے زیادہ تر سہارا انہی کا لیا ہے۔

قبر مبارک والے حجرے کی چھت میں سوراخ کرنا

قاضی تقی الدین السبکی صاحب نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ کتاب کا حوالہ دیئے بغیر ابوالجوزاء سے یوں نقل کیا ہے:

ایک مرتبہ مدینہ میں سخت قحط پڑا۔ لوگوں نے عائشہؓ کے پاس اس کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا: نبی ﷺ کی قبر مبارک کی چھت میں ایسے سوراخ کرو کہ قبر اور آسمان کے درمیان چھت حائل نہ ہو۔ جب ان کے حکم کے مطابق عمل کیا گیا تو خوب بارش ہوئی اور کثرت سے ہریالی ہو گئی۔ اونٹ اتنے موٹے ہو گئے کہ چربی سے ان کے بدن پھٹنے لگے۔ اسی لیے اس سال کہ عام الفتق (پھٹن) کا سال کہا جاتا ہے۔

اس اہم واقعہ کا تجزیہ

مذکورہ روایت سنن دارمی میں منقول ہے۔ راوی کا نام ابوالجوزاء اوس بن عبداللہ ہے۔ راوی کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ عائشہ کی وفات راجح روایت کے مطابق 58 ہجری کے رمضان المبارک کے مہینے میں ہوئی۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے وتروں کے بعد ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

ابوالجوزآء کے بارے میں امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر میں لکھا کہ 83ھ میں ان کو دیر جماجم کی لڑائی میں قتل کیا گیا تھا۔ جو ابن الاشعث اور حجاج بن یوسف کے درمیان ہوئی تھی۔ تاریخی اعتبار سے ابوالجوزآء حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد 25 سال زندہ رہے۔ واقعہ کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کہ کونسے سال میں پیش آیا اور اس سال مدینہ کا حاکم کون تھا۔ شرعی تعلیم کے مطابق اہل مدینہ کیا اس کے پاس گئے اور اس کو مسنون نماز استسقاء پڑھانے کے لیے کہا تھا۔ جس سال کو "عام الفتق" کہا گیا، اس کا ذکر تواریخ اور اسماء الرجال کی کتابوں میں کیوں نہیں ہوا۔ اتنا اہم واقعہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حالات میں بھی منقول نہیں۔ ائمہ صحاح ستہ کی نظروں سے اوجھل کیوں رہا۔

اس کی وجہ راوی کے بارے میں ائمہ حدیث و رجال کا اختلاف ہے۔

حافظ امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج1، ص278، رقم 1045) میں اتنا ہی لکھا ہے: وَثَقُوهُ وَقَالَ البخاری: قال یحیی بن سعید: قُتِل فِی الحماجم: فی اسناده نظر و یختلفون فیه۔ اورانہوں نے اس کی توثیق کی اور بخاری نے کہا: یحیٰ بن سعید کا قول ہے کہ وہ جماجم میں قتل کیا گیا۔ اس کی اسناد غور طلب ہے اور ائمہ اس کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں۔

ابو الجوزآء والی روایت کے دوسرے راوی سعید بن زید ہیں جو حماد بن زید کے بھائی تھے۔ میزان الاعتدال (ج2، ص138، رقم 3185) میں ان کے بارے میں یحیٰ بن سعید کا کہنا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ السعدی نے کہا: وہ کوئی حجت نہیں۔ ائمہ کرام اس کی حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ نسائی وغیرہ نے کہا: وہ مضبوط نہیں۔ احمد نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں لیکن یحیٰ بن سعید ان کے بارے میں اپنی بات پر قائم رہتے تھے۔

اتنا بڑا واقعہ کہ آپ کی قبر مبارک کی چھت میں شگاف کر دیا گیا اور امیر مدینہ یا صحابہؓ اور تابعینؒ میں سے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ جب راوی مشکوک ہو گئے تو اس روایت کی اہمیت کیا ہو گی اور نماز استسقاء کے مسنون طریقہ کا بھی اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔

توسل کے دو واقعات

قاضی السبکی صاحب نے توسل کی ایک قسم یہ بھی بیان فرمائی کہ نبی ﷺ سے مقصد عرض کیا جائے اور آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے پورا کرائیں۔ جیسے ایک صحابی نے عرض کیا کہ جنت میں آپ کے ساتھ ہونے کا سوال کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کثرت سے سجدے کر کے میری مدد کر۔

امام بیہقی کی دلائل النبوۃ کے حوالے سے دوسرا واقعہ عثمان بن ابی العاص کا ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوت حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا: یہ اس شیطان کا اثر ہے جس کا نام خنزب ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: اے عثمان! قریب آ جا۔ ان کا کہنا ہے میں جب قریب ہوا تو آپ نے اپنا دست مبارک میرے سینہ پر رکھا۔ جس کی ٹھنڈک میں نے کمر تک محسوس کی۔ آپ نے فرمایا: اے شیطان! عثمان کے سینہ سے نکل جا۔

عثمانؓ کا کہنا ہے: اس کے بعد میرا حافظہ اس قدر قوی ہو گیا کہ جو سنتا تھا وہ یاد ہو جاتا تھا۔

مذکورہ توسل کی حقیقت

پہلے بھی واضح کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں جو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کرایا کرتے تھے۔ اس میں کوئی اختلاف و اشکال نہیں۔ قاضی صاحب نے شفا السقام (عربی ص 175، اردو ص 219) میں خود بھی اعتراف کیا ہے کہ ایسی صورت میں نبی ﷺ کا مقام سفارش کرنے والے کی طرح ہے۔

الجھاؤ تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ کی حیات دنیوی اور حیات برزخی میں اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ فرق کو مٹایا جائے اور قبر مبارک کے بارے میں قاضی صاحب کے اختیار کردہ موقف کو اپنایا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی جنت میں رفاقت کا سوال کرنے والے جس صحابی کا حوالہ دیا گیا ہے ان کا نام ربیعہؓ بن کعب الاسلمی تھا۔ صحیح مسلم (ج 2، ص 193) میں ان سے مروی ہے۔ میں رسول اللہ ﷺ کے قریب ہی رات گزارا کرتا اور آپ کے لیے وضو کا پانی پیش کیا کرتا تھا (کیونکہ وہ اصحاب صفہ میں سے تھے)۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا: کچھ مانگو۔ میں نے عرض کیا: جنت میں آپ کی رفاقت کا سوال کرتا ہوں۔

آپ نے فرمایا: اپنے اس معاملے میں کثرت سے سجدے کر کے میری مدد کر۔

امام مسلمؒ نے اس روایت سے پہلے ایک روایت معدان بن ابی طلحہ الیعمری سے بھی نقل کی ہے ان کا کہنا ہے: رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ثوبانؓ کے پاس میں آیا اور ان سے کہا: مجھے ایسا عمل بتائیں جس کی وجہ سے اللہ مجھے جنت میں داخل کر دے یا میں نے یہ کہا اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین عمل کونسا ہے۔

ثوبانؓ خاموش رہے۔ میں نے اپنے سوال کو دہرایا تو بھی خاموش رہے۔ جب تیسری مرتبہ پوچھا تو انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے سوال کیا تھا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا: اپنے اوپر کثرت سے سجدے کرنے لازم کرلو۔ کیونکہ جب تو اللہ کے لیے ایک سجدہ کرے گا۔ تو اللہ اس سے ایک درجہ تیرا بلند کر دے گا اور تیرا ایک گناہ مٹا دے گا۔

قاضی السبکی صاحب نے اپنی کتاب میں قبر مبارک پر زیارت کے ذریعے شفاعت پانے کا ضعیف وموضوع روایات کے ذریعہ جو تصور قائم کیا ہے، اس کی نفی امام مسلم کی نقل کردہ روایات سے ہو جاتی ہے۔ آپ کی رفاقت کے حصول کے لیے آپ کے بتائے ہوئے آپ کے نمونہ کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے۔

ربیعہؓ بن کعب الاسلمی جورات آپ کی خدمت کے لیے تیار رہتے۔ ان کو آپ نے کثرت سے نمازیں پڑھنے اور سجدے کرنے کا حکم فرمایا۔ بلکہ آپ نے ان سے مدد کرنے کو فرمایا۔

دوسرا واقعہ بھی صحیح مسلم (ج 2 ص 224) میں ابوالعلاء سے یوں مروی ہے کہ عثمان بن ابی العاص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اللہ کے رسول! شیطان میری نماز اور میری قرأت میں حائل ہو کر معاملہ خلط ملط کر دیتا ہے۔

آپ نے فرمایا: یہ وہ شیطان ہے جس کا نام خنزب ہے۔ جب تو اسے محسوس کرے تو اللہ کے ساتھ اس سے پناہ مانگ کر تین مرتبہ اپنی بائیں جانب تھوک دیا کرو۔

عثمانؓ بن ابی العاص کا اپنا بیان ہے۔ میں نے ویسے ہی کیا تو اللہ نے اُسے مجھ سے دور کر دیا۔

سیرت ابن ھشام (ج3، ص541-540) میں مروی ہے۔ قبیلہ ثقیف کا وفد 9ھ میں جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عثمان اس میں شامل تھے۔

اسلام اور قرآن کی طرف ان کی رغبت و محبت کو دیکھ کر آپ نے ان کی کم عمری کے باوجود ان کو ان کے قبیلہ پر امام بنا دیا اور حکم دیا کہ نماز پڑھاتے ہوئے لوگوں میں کمزوروں کا خیال رکھا کرنا۔ کیونکہ ان میں بوڑھے، ضعیف، حاجتوں والے اور چھوٹی عمر کے بھی ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب نے صحیح مسلم کی روایت کو چھوڑ کر دلائل النبوۃ کا حوالہ دیا۔ حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ امام بیہقی نے بہت سی ضعیف و موضوع روایات اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔

استغاثہ کا معنی ومفہوم

قاضی صاحب نے غوث و استغاثہ کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ نبی ﷺ سے استغاثہ کرنے سے مراد ہے کہ آپ ہمارے لیے دعا کریں۔ یہ بالکل درست اور جائز ہے۔ ہاجرہؑ نے کہا تھا: اَغِثْ اِنْ کَانَ عِنْدَكَ غَوَاث۔ اگر تیرے پاس مدد ہے تو مدد کر۔

قاضی صاحب نے المعجم الکبیر کے حوالے سے ایک روایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔ جو بظاہر ہر غیر اللہ سے استغاثہ کو منع کرتی ہے وہ یہ ہے:

حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: چلو اس منافق کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے استغاثہ کرتے ہیں۔ جب آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ ہم آپ سے اس منافق کے بارے میں استغاثہ کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ استغاثہ مجھ سے نہیں بلکہ اللہ سے ہوتا ہے۔

بخاری کے حوالے سے قیامت کے روز امر شفاعت کے ضمن میں استعمال ہونے والا جملہ بھی نقل کر دیا: اِسۡتَغَاثه بِادَمَ ثم بِمُوسٰی ثُمَّ بِمُحَمَّدٍصلی اللّٰہ علیه وسلم۔ لوگوں نے آدم علیہ السلام سے، پھر موسیٰ علیہ السلام اور پھر محمد ﷺ سے استغاثہ کیا۔

مذکورہ معنی و مفہوم کا تجزیہ

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں صحابہؓ کا حاضر ہونا اور اپنے لیے دعائیں کرانا یہ بالکل جائز اور درست تھا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد آپ کی قبر مبارک کے پاس جا کر دعا کی درخواست کرنا درست نہ تھا اور نہ ہے۔ اس پر بہت بحث ہو چکی ہے۔

رہی بات ہاجرہ علیہا السلام کے واقعہ کی تو وہ بھی کسی کی قبر پر جا کر انہوں نے مذکورہ الفاظ نہ کہے تھے بلکہ فرشتے کی آواز سن کر اس کو سامنے آنے کو کہا تھا۔

المعجم الکبیر والی روایت کے بارے میں قاضی صاحب نے خود ہی فرمایا۔ اس میں ابن لھیعۃ ضعیف راوی ہے۔ جب روایت ہی ضعیف ہے تو اس پر یا اس کے بارے میں بحث فضول ہے۔

قیامت کے روز جو ہوگا اس کا حوالہ بھی بے محل ہے۔ بات تو قبر مبارک کی ہے یا صلحائے امت کی قبروں کی ہے جہاں جا کر بے علم لوگ وہی کچھ کرتے ہیں جس کی شریعت محمدی میں اجازت نہیں۔ اہل قبور کے پاس جا کر اپنی حاجات بیان کرنا اور جو اللہ

شہ رگ سے بھی زیادہ قریب اور دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے اس کو بھول جانا، اس سے بڑھ کر اسلامی تعلیم کی مخالفت اور کیا ہوسکتی ہے۔

علی ہجویریؒ نے اپنی مشہور کتاب کشف المحجوب (مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور) کے چالیسویں باب (ص302) مشاہدہ الٰہی کی حقیقت میں سہل بن عبداللہ تستری کا یہ قول نقل کیا ہے:

مَنْ غَضَّ بَصَرَہٗ عَنِ اللّٰہِ طَرْفَۃَ عَیْنٍ لَّا یَھْتَدِی طُوْلَ عُمْرِہٖ

جس نے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی نظر کو اللہ سے ہٹایا، وہ ساری عمر ہدایت نہیں پائے گا۔

بارہویں باب (ص111) میں بشر حافی کا قول ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ پر چلنا چاہتا ہے وہ بندوں سے حاجت طلب نہیں کرتا۔ بندوں سے حاجت طلب کرنا اللہ کو نہ پہچاننے کی دلیل ہے۔ اگر وہ حاجتیں پوری کرنے والے اللہ کو جانتا تو اپنے جیسے بندے کے آگے سوال نہ کرتا۔

لِاَنَّ اِسْتِغَاثَۃَ الْمَخْلُوْقِ مِنَ الْمَخْلُوْقِ کَاسْتِغَاثَۃِ الْمَسْجُوْنِ مِنَ الْمَسْجُوْنِ

کیونکہ مخلوق کا مخلوق سے مدد طلب کرنا ایسے ہی ہے جیسے قیدی کا قیدی سے مدد طلب کرنا۔

تیسرے باب (ص39) کی عبارت ہے:

مَنْ نَظَرَ اِلَی الْخَلْقِ ھَلَکَ وَ مَنْ رَجَعَ اِلَی الْحَقِّ مَلَکَ

جس نے مخلوق کی طرف دیکھا یعنی اللہ کو یاد نہ رکھا وہ ہلاک ہوا اور جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہوا وہ مالک ہوگیا۔

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے سید الانبیاء محمد رسول ﷺ کو حکم فرمایا:

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِیْ لَا يَمُوْتُ (۵۸)﴾

اور آپ اس پر توکل کریں جس کو مرنا نہیں۔

سورۃ التغابن میں مومنوں کے لیے ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۳)﴾

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں مگر وہی اور اللہ ہی پر مومنوں کو توکل کرنا چاہیے۔

اہل اسلام کے عقائد میں بہت بگاڑ واقع ہو چکا ہے۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہمیں قرآن وسنت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

❁❁❁

۱۲

شفاء السقام کا نواں باب

اس باب میں قاضی القضاۃ السبکی صاحب نے وہ روایات نقل کی ہیں جن میں انبیاء علیہم السلام کی قبروں میں برزخی حیات کا ذکر ہوا ہے اور ان سے رسول اللہ ﷺ کا قبر مبارک میں زندہ ہونا اور مدد کے طلبگاروں کی مدد کرنے کا ثبوت مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے شہداء کی جنتی زندگی سے بھی اپنے موقف کا استدلال کیا ہے۔ مدفون صحابہ کی لاشوں کے خراب نہ ہونے، سماع موتی کے سلسلے میں قرآنی آیت میں تاویل کرنے، آپ کی وفات کے بعد آپ کا احترام کرنے، شہادت و روح کی وضاحت کرنے، اہل سنت کے عقیدہ کو بیان کرنے اور اپنی کتاب لکھنے کا اصل مقصد تحریر فرمایا ہے۔ لیکن خلاصۂ کلام میں ایک ایسی حق بات بھی انہوں نے لکھی ہے جس سے ان کی ساری بحث کی نفی ہو جاتی ہے۔ قبر میں مردے سے جب سوال ہوں گے تو ان کا جواب انسانی جسم دے گا یا اس کی روح یا روح و جسم دونوں مسئول ہوں گے۔ قاضی صاحب نے وضاحت فرمائی کہ عقلاً ہر بات جائز ہے لیکن اس سلسلے میں شرعاً کوئی دلیل ایسی نہیں کہ جس سے کسی خاص پہلو پر صحیح طور پر استدلال کیا جائے۔

اس کے باوجود قاضی صاحب نے شرع سے راہنمائی لینے کی بجائے اپنی ساری کتاب میں اپنی عقل ہی کو معیار بنایا ہے اور کمال جرأت سے قرآن و سنت کے واضح احکام کو تاویلوں میں الجھایا ہے۔ ان کی نقل کردہ روایات حسب ذیل ہیں:

1- انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ (بیہقی)

2- انبیاء علیہم السلام چالیس راتوں کے بعد قبروں میں چھوڑے نہیں جاتے لیکن وہ اللہ کے سامنے نمازیں پڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ صور پھونکا جائے گا۔ (بیہقی)

3- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا، وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ (مسلم)

4- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے آپ کو انبیاء کی جماعت میں دیکھا۔ وہاں موسیٰ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ ایک چھریرے بدن اور گھنگریالے بالوں والے آدمی تھے گویا کہ قبیلہ شنوءہ کے آدمیوں میں سے ہیں۔

حضرت عیسیٰ بن مریم وہاں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اور عروہ بن مسعود الثقفی کے بہت مشابہ تھے۔ حضرت ابراہیم بھی وہاں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ تمہارے صاحب یعنی مجھ جیسے تھے۔

پھر نماز کا وقت ہوا تو میں نے ان کی امامت کی۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو کسی کہنے والے نے کہا: اے محمد! یہ جہنم کے داروغہ مالک ہیں ان کو سلام کریں۔ میں ان کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ انہوں نے مجھے سلام کیا۔ (صحیح مسلم)

5- اوس رضی اللہ عنہ بن اوس سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے دنوں میں سے سب سے افضل دن جمعہ کا ہے۔ اس دن آدم کی تخلیق ہوئی اور اسی دن ان کی وفات ہوئی۔ اس دن صور پھونکا جائے گا اور وہی دن بیہوشی کا ہوگا۔ اس دن میں مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرنا۔ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ ہمارا درود آپ پر کیسے پیش کیا جائے گا جبکہ آپ کی ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہوں گی۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے۔ (ابو داؤد)

6- ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ جمعہ کے دن کثرت سے مجھ پر درود بھیجا کرو۔ جمعہ کے دن جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔(بیہقی)

7- ابو امامۃؓ کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: ہر جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو۔ کیونکہ میری امت کے درود ہر جمعہ مجھ پر پیش کیے جاتے ہیں۔ جس کے جس قدر درود زیادہ ہوں گے وہ اتنا ہی میرے قریب ہوگا۔(بیہقی)

8- انسؓ بن مالک سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن ہر جگہ وہ شخص میرے زیادہ قریب ہوگا جو دنیا میں کثرت سے مجھ پر درود بھیجے گا۔ جو شخص جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات مجھ پر درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس کی سو حاجتیں پوری کرے گا جن میں ستر آخرت کی اور تیس دنیا کی ہوں گی۔

پھر اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس کو میری قبر میں داخل کر دیتا ہے جس طرح تم پر ہدیے داخل ہوتے ہیں۔ وہ مجھے درود بھیجنے والے کا نام ونسب اور قبیلہ بتا دیتا ہے۔ میں اس کو سفید صحیفہ میں لکھ لیتا ہوں۔(بیہقی)

9- امام بیہقیؒ نے ان احادیث کا بھی ذکر کیا ''تم جہاں بھی ہو تمہارا درود وہاں سے مجھ کو پہنچ جاتا ہے۔'' جو مسلمان مجھے سلام کرتا ہے۔ اللہ میری روح مجھ پر لوٹاتا ہے اور میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ (مترجم نے یہاں ترجمہ میں خیانت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ اللہ نے میری روح واپس کردی ہوئی ہے۔ تاکہ میں اس کا جواب دوں) بلکہ بیہقیؒ کا کہنا ہے: اِنَّمَا اَرَادَ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ اِلَّا وَ قَدْ رَدَّ اللّٰہُ عَلَیَّ رُوْحِی حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیْہِ بے شک اس سے آپ کا ارادہ تھا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر یہ کہ اللہ نے میری روح مجھ پر واپس لوٹا دی ہے تاکہ میں اس کا جواب دوں۔

نوٹ: یہ عبارت قابل غور ہے کہ یہ بات آپ نے حیات دنیوی میں فرمائی یا آپ

نے قبر مبارک میں سے یہ پیغام دیا۔ امام بیہقی کو اس کا علم کیسے ہوا۔

10- اللہ کے کچھ فرشتے ہیں جو گھومتے رہتے ہیں اور میری امت کا سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں۔

11- ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے: آپ کا جو امتی آپ پر درود بھیجتا ہے وہ آپ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور فرشتہ آپ سے عرض کرتا ہے: فلاں نے آپ پر اتنی مرتبہ درود بھیجا ہے۔

12- آپ نے فرمایا۔ جو میری قبر کے پاس آ کر درود بھیجے میں وہ سن لیتا ہوں لیکن اس کا راوی محمد بن مروان ابو عبدالرحمٰن السدی ہے۔ جس کی روایت کی صحت کو دیکھنا ہوتا ہے۔ [قاضی صاحب نے (عربی ص 50، اردو ص 74 میں) محمد بن مروان کے ضعیف ہونے کا اقرار کیا ہے لیکن مترجم نے محمد بن مروان کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔]

13- صور کے پھونکے جانے کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مجھے ہوش آئے گا تو میں دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ بیہوش ہوئے تھے اور مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے تھے یا اللہ تعالیٰ نے ان کو بیہوشی سے مستثنیٰ کر دیا ہوگا۔ (بیهقی بحواله بخاری مسلم)

14- امام بیہقی نے فرمایا: پہلے صور پر بے ہوشی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی ارواح ان کی طرف لوٹا دیتے ہیں اور وہ اپنے رب کے پاس شہداء کی طرح زندہ ہیں۔ جب پہلی بار صور پھونکا جائے تو دوسروں کی طرح وہ بھی بے ہوش ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی یہ موت بھی ہر حیثیت سے موت نہ ہوگی بلکہ محض شعور کا فقدان ہوگا اور اگر موسیٰ علیہ السلام اس بے ہوشی سے مستثنیٰ رہیں گے تو ان کا شعور بھی باقی رہے گا۔ اسی طرح شہداء بھی بے ہوشی سے مستثنیٰ رہیں گے۔

پھر قاضی صاحب نے موسیٰ علیہ السلام کے قبر میں نماز پڑھنے اور رسول اللہ ﷺ کا انبیاء علیہم السلام کی امامت کرانے سے پہلے موسیٰ وعیسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھنے کا ذکر کیا۔ یعنی تکراراً نمبر 3 اور نمبر 2 والی روایت پھر سے نقل کر دی۔ اسی طرح ابن ماجہ والی روایت (ص 118) کے اس حصے کا پھر سے ذکر کر دیا جس کے مطابق اللہ کے نبی زندہ ہیں اور رزق دیے جاتے ہیں۔

موت وحیات کا مسئلہ

قاضی السبکی صاحب کے نزدیک انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کی حیات وممات میں کوئی فرق نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک میں صحابہؓ جس طرح آپ سے دعا کرایا کرتے تھے اسی طرح اب بھی آپ سے دعا کی درخواست کی جاسکتی ہے۔

مذکورہ روایات کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہے کہ حیات وممات کا معنیٰ ومفہوم قرآن وحدیث کی روشنی میں سمجھ لیا جائے۔ کیا دونوں میں کوئی فرق ہے یعنی کیا زندہ اور مردہ دونوں برابر ہیں۔ زندہ جب مرتا ہے تو مرنے کے بعد پھر سے اسی طرح زندہ ہو جاتا ہے کہ جس طرح مرنے سے پہلے تھا اور اپنے اہل وعیال سے اس کا ناتا ویسے ہی قائم رہتا ہے کہ جیسے اس کی دنیاوی زندگی میں ان سے قائم تھا۔ ان کے مصائب ومشکلات میں وہ ان کی کوئی مدد واعانت کرتا ہے کہ نہیں۔ اللہ خالق ومالک نے موت وحیات کا سلسلہ کیوں قائم کیا۔ سورۃ الملک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۱) الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَّھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (۲)﴾

بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں ساری بادشاہت ہے اور وہ ہر شئے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ وہی ہے جس نے موت وحیات کی تخلیق کی۔ تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں اچھے اعمال کرنے والا کون ہے۔ وہی غلبے والا بخشنے والا ہے۔

موت وحیات کے سلسلہ کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے ساتھ ہی ہوگئی تھی۔

سورۃ ص میں اللہ تعالیٰ کا اعلان اور حکم ہے:

﴿اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ(۷۱) فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ(۷۲)﴾

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا: بے شک میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے لگا ہوں۔ پس جب میں اس کو ٹھیک ٹھاک کر دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کو سجدہ کرنا۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور جو شکل وصورت اللہ نے ان کو دینی تھی وہ دے دی تو پھر ان میں اپنی روح پھونک دی۔ جس سے مٹی سے بنا ہوا ایک پتلا حقیقی طور پر جاندار انسان بن گیا۔ سورۃ الانفطار میں ارشاد ہوا:

﴿یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ(۶) الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ(۷) فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ(۸) کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ(۹) وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ(۱۰) کِرَامًا کَاتِبِیْنَ(۱۱) یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ(۱۲) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ(۱۳) وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ(۱۴) یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ(۱۵) وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ(۱۶) وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ(۱۷) ثُمَّ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ(۱۸) یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا وَّالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ(۱۹)﴾

اے انسان! تیرے رب کریم کے بارے میں تجھے کس چیز نے دھوکے میں رکھا۔ جس نے تیری تخلیق کی۔ پھر تجھے ٹھیک ٹھاک کیا اور تیرے اعضاء کو مناسب طور پر بنایا۔ اس نے جو شکل وصورت تجھے دینی چاہی وہ دے دی۔ پھر بھی تم قیامت کے دن کو جھٹلاتے ہو۔ حالانکہ تم پر نگران ونگہبان مقرر ہیں۔ جو عزت والے کاتب ہیں۔ تم جو کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔ بے شک نیکو کار نعمتوں میں ہوں گے۔ اور بدکار جہنم میں ہوں گے۔ اس میں قیامت کے روز داخل ہوں گے اور اس میں سے نکل نہیں پائیں گے۔ اور آپ کیا جانیں کہ قیامت کا دن کیسا ہوگا۔ پھر آپ کیا جانیں۔ قیامت کا دن کیسا ہوگا۔ اس دن کوئی نفس کسی نفس کے لیے کسی چیز کا مالک نہ ہوگا اور اس دن اللہ کا ہی حکم چلے گا۔

سورۃ المومنون میں انسانی تخلیق کے مراحل کو یوں اجاگر کیا گیا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ (۱۲) ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ (۱۳) ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (۱۴) ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ (۱۵) ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ (۱۶)﴾

اور ہم نے انسان کی تخلیق گیلی مٹی سے کی۔ پھر ہم نے اس کو ایک قرار والی جگہ میں نطفہ کی صورت میں کر دیا۔ پھر اس نطفہ کو جمے ہوئے خون کی صورت دے دی۔ پھر اس خون کو گوشت کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر اس گوشت کو ہڈیاں بنا دیا۔ پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اس کو تخلیق کی نئی صورت دے دی۔ پس بابرکت ہے اللہ جو بہترین خالق ہے۔ پھر تم اس کے بعد ضرور مر جاؤ گے۔ پھر تم قیامت

کے روز اٹھائے جاؤ گے۔

مذکورہ آیات میں انسانی زندگی کی حقیقت بیان کر دی گئی ہے۔ پہلے انسان کی تخلیق اگر چہ مٹی سے ہوئی۔ لیکن پھر اس انسان کی اولاد کی ابتدا و انتہا پر روشنی ڈال دی گئی۔ چونکہ ابتداء مٹی سے ہوئی تھی اس لیے اس کی انتہا بھی مٹی میں ہی ہوتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام میں پھونکی ہوئی روح جب قبض کر لی گئی تو دنیا میں ان کو ملنے والی زندگی ختم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ان کی اولاد کے لیے یہی قانون جاری کر دیا کہ ہر پیدا ہونے والے انسان میں جب تک اس کو دی جانے والی روح موجود ہو گی وہ دنیا میں زندہ رہے گا اور جیسے ہی وہ روح قبض ہو جائے گی اس کو اس کی اصل مٹی کے حوالے کر دیا جائے گا۔

حضرت آدم علیہ السلام سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور ان کے بعد بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام آئے اور اپنی اپنی عمر پوری کر کے اپنے رب کے پاس چلے گئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہی قانون ہے۔ سورۃ العنکبوت کے الفاظ ہیں:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ(۵۷)﴾

ہر نفس نے موت کا مزا چکھنا ہے۔ پھر تمہیں ہماری ہی طرف لوٹایا جائے گا۔

سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوا:

﴿وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ(۳۴) كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ(۳۵)﴾

اور آپ سے پہلے ہم نے کسی بشر کے لیے ہمیشہ زندہ رہنے والا قانون نہیں بنایا۔ اگر آپ فوت ہو جائیں گے تو کیا وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ہر نفس نے موت کا مزا

چکھنا ہے اور ہم تمہاری آزمائش خیر اور شر کے فتنہ سے کریں گے اور تم کو ہماری ہی طرف لوٹایا جائے گا۔

صحیح بخاری (کتاب بدء الخلق ص456، کتاب القدر ص976، کتاب التوحید ص1110) اور صحیح مسلم (کتاب القدر ج2، ص332) میں عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا اور آپ صادق المصدوق ہیں: بے شک تمہارے کسی ایک کی تخلیق اس کی ماں کے پیٹ میں یوں ہوتی ہے کہ وہ چالیس دن نطفہ کی صورت میں۔ پھر اتنے دن علقہ کی صورت میں اور پھر اتنے ہی دنوں میں جب مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) کی صورت میں ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے۔ جو چار کلمات لکھتا ہے: (۱) اس کا عمل کیا ہوگا (۲) اس کی عمر کتنی ہوگی (۳) اس کو رزق کتنا ملے گا (۴) وہ شقی یا سعید ہوگا۔

یہاں یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ دنیا میں پیدا ہونے والے ہر انسان کو ملنے والی دنیاوی عمر اس کی ماں کے پیٹ میں اس میں روح پھونکے جانے سے پہلے ہی لکھ دی جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا کہ کسی بشر کے لیے ایسا ممکن نہیں کہ وہ دنیا میں پیدا ہونے کے بعد اس میں ہمیشہ ہی زندہ رہے۔

اگر قاضی صاحب اور ان جیسے حضرات کے دعویٰ کو درست تسلیم کرلیا جائے تو قرآن وحدیث کی نفی ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے وہ کسی بھی صورت میں درست نہ ہوگی۔ لہٰذا دنیا میں اپنی زندگی پوری کر کے جانے والے ہر شخص کی زندگی کا قبر میں جو معاملہ شروع ہوتا ہے شرعی طور پر اس کو حیات برزخیہ کہا جاتا ہے۔ جس کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے اگر ہم ماں کے پیٹ میں بچے کی تخلیق کے مراحل پر ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ایک سو بیس (120) دن بعد اس میں روح پھونک دی جاتی

ہے۔تقریباً پانچ مہینے وہ ماں کے پیٹ میں زندہ ہی ہوتا ہے اور اس کو رزق بھی ملتا رہتا ہے۔اس کی اس زندگی کو عالم رحم کی زندگی کہا جاتا ہے۔

اس زندگی سے نکل کر جب وہی بچہ دنیا میں پروان چڑھتا ہے تو اس کی اس زندگی کو عالم دنیا کی زندگی کا نام دیا جاتا ہے پھر جب وہ اس میں اپنے رب کی طرف سے ملنے والا عرصہ پورا کر کے زمین کے پیٹ میں دفن ہو جاتا ہے تو اس کی برزخی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔جس میں نیکوکار عِلِیّین میں اور بدکار سِجّین میں چلے جاتے ہیں، اور قیامت تک اس میں رہنے کے بعد قیامت کے روز اپنے اپنے حساب کے مطابق سزا یا جزا پائیں گے اور جنت یا جہنم میں داخل ہونے والوں کی وہ زندگی ہمیشہ کی زندگی ہو گی۔

آخرت کی زندگی میں جانے والوں میں سے اگر کوئی چاہے گا کہ وہ برزخی زندگی کی طرف لوٹ جائے یا برزخی زندگی میں کوئی چاہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں واپس آجائے یا دنیا کی زندگی میں پروان چڑھنے والا اگر چاہے کہ وہ پھر سے ماں کے بطن میں چلا جائے تو ایسا کبھی ممکن نہ ہو گا۔

لیکن قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں چاروں زندگیوں کو خلط ملط کر کے موت و حیات کی حقیقت کو مسخ کیا جس کی وجہ سے آج اہل اسلام کی اکثریت شرک و بدعات کا شکار ہو گئی ہے۔مزاروں اور مشاہد پر وہی کچھ ہوتا ہے جس سے سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا تھا۔

قرآنی واقعات

سورۃ عبس میں اللہ تعالیٰ نے بڑے ہی اختصار سے موت وحیات کی حقیقت یوں بیان فرمائی ہے۔

﴿مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ(۱۸) مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ(۱۹) ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ(۲۰) ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ(۲۱) ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ(۲۲)﴾

اللہ نے اس کو کس چیز سے پیدا کیا۔ نطفہ سے اس کی تخلیق کی پھر بہترین انداز میں اس کو شکل وصورت دی۔ پھر دنیا کی راہ اس کے لیے آسان کر دی۔ پھر اس کو فوت کر کے قبر میں دفن کرایا۔ پھر جب چاہے گا اس کو اٹھائے گا۔

یہاں وضاحت ہو جاتی ہے کہ اللہ جب اپنے کسی بندے کی روح قبض کرتا ہے تو وہ اس وقت اٹھے گا جب اللہ چاہے گا۔

سورۃ البقرہ میں ہے، ابراہیم علیہ السلام اپنے رب کے بارے میں وقت کے بادشاہ سے کہتے ہیں:

﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ(۲۵۸)﴾

میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور فوت کرتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے اس ایمان و یقین کی تائید میں اللہ نے ایک آدمی کا واقعہ بیان فرما دیا۔ مفسرین کا قول ہے کہ وہ عزیر علیہ السلام تھے۔ لیکن قرآن میں جو لفظ استعمال ہوا ہمیں وہی کافی ہے۔ موت وحیات کے مالک نے سورۃ البقرہ میں فرمایا:

﴿اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ کَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَ شَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِکَ وَ لِنَجْعَلَکَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَکْسُوْهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ(۲۵۹)﴾

یا اس کی مثل جو ایک بستی کے پاس سے گزرا اور وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی۔ اس نے کہا۔ اس بستی کی ایسی تباہی کے بعد اللہ پھر سے اس کو زندہ و آباد کیسے کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک سو سال کے لیے فوت کر دیا۔ پھر اس کو زندہ کرنے کے بعد پوچھا۔ تم کتنا عرصہ یونہی مرے رہے۔ اس نے عرض کیا۔ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم ایک سو سال یونہی مرے رہے۔ اپنے کھانے اور اپنے مشروب کی طرف دیکھو۔ وہ خراب نہیں ہوا اور اپنے گدھے کی طرف دیکھو۔ ہم نے ایسا اس لیے کیا ہے تاکہ تم کو لوگوں کے لیے نشانی بنا دیں اور گدھے کی ہڈیوں کی طرف دیکھتے رہیں ہم ان کو کیسے جمع کرتے اور ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ اس آدمی پر (اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا مسئلہ) واضح ہو گیا تو اس نے کہا میں جان گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

اس واقعہ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ مرنے والے انسان کو اپنی دنیاوی زندگی کا کوئی شعور نہیں ہوتا۔ ایک سو سال مرے رہنے والی مدت کو اس نے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ سمجھا۔ لہٰذا فوت ہونے والے کا تعلق دنیاوی زندگی سے منقطع ہو جاتا ہے۔

دوسرا واقعہ اصحاب کہف کا ہے جن کے بارے میں سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا (۲۵)﴾ وہ اپنی غار میں تین سو نو سال رہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر لمبی نیند مسلط کر دی۔ یہاں مرنے اور دفن ہونے کی بات نہ ہوئی بلکہ صرف سونے کی خبر دی گئی۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ جملہ استعمال کیا ہے: ﴿وَ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ اور ہم نے ان کے دلوں پر گرہ لگا دی۔

ان کے بیدار ہونے کے بعد ان کے درمیان جو بات ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو

یوں بیان فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ﴾

اور اسی طرح ہم نے ان کو اٹھایا تا کہ وہ آپس میں سوال کریں۔ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا۔تم کتنا عرصہ نیند کی حالت میں رہے۔اس کے ساتھیوں نے کہا۔ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ اس حالت میں رہے۔(جب وہ اس عرصہ کا یقین نہ کر سکے تو) انہوں نے کہا: تمہارا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے کہ تم کتنا عرصہ سوئے رہے۔

یہاں مرنے اور دفن ہونے کی بات نہیں: بلکہ زمین کے اوپر ہی سونے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔جب سونے والے انسان کو جاگنے والوں اور دنیا والوں کے حالات کا علم نہیں ہوتا تو قبر میں مدفون انسان کو دنیا والوں کی خبر کیسے ہوگی۔لہٰذا عالم برزخ کی زندگی کو دنیاوی زندگی پر قیاس کرنا سراسر غلط ہے۔

مذکورہ روایات کا تجزیہ

قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی صاحب نے جن روایات کا ذکر کیا ہے ان میں سے چار کا تعلق انبیاء علیہم السلام کی برزخی زندگی سے ہے۔آٹھ روایات کا تعلق رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے سے ہے۔دو روایتیں جو بیہقی کے حوالے سے مذکور ہیں ان میں امام بیہقی نے جو لکھا ہے: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنے رب کے پاس شہداء کی طرح زندہ ہیں۔اگرچہ امام بیہقی (المتوفی 458ھ) کا یہ اپنا قیاس ہے اور اس پر کوئی قرآنی نص موجود نہیں کہ جس طرح شہداء کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ اور سورۃ ال

عمران میں فرمایا ہے۔ پھر بھی اس سے ان کی دنیاوی زندگی ثابت نہیں ہوتی۔

نبیوں علیہم السلام کا اپنی قبروں میں زندہ ہونا اور نمازیں پڑھنا۔ اس سے ان کی حیات برزخیہ میں کوئی اشکال نہیں۔ اگرچہ امام الذہبی نے میزان الاعتدال (ج1، ص460، رقم 1767) میں حجاج بن الاسود کے بارے میں لکھا کہ ان کے علم کے مطابق مستلم بن سعید کے علاوہ کسی اور نے اس سے روایت نہیں کی اور وہ ان سے منکر خبر لایا ہے۔

میزان الاعتدال (ج1، 518-519) کے مطابق اس روایت کے ایک دوسرے راوی حسن بن قتیبہ کو الدارقطنی نے متروک الحدیث کہا۔ ابو حاتم کے نزدیک وہ ضعیف تھا۔ الازدی نے اس کو واہی الحدیث اور عقیلی نے کثیر الوھم کہا ہے۔ اس سندی جرح کے باوجود جب ہر فوت ہونے والا عالم برزخ میں زندہ ہوتا ہے تو انبیاء علیہم السلام کی برزخی زندگی سے انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن ان کی اس زندگی کا دنیاوی زندگی سے کوئی ناتا جڑا ہوا نہیں ہوتا۔

قاضی صاحب کی دوسری محولہ روایت کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں چالیس راتوں کے بعد چھوڑے نہیں جاتے۔ لیکن وہ اللہ کے سامنے نمازیں پڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ صور پھونکا جائے گا۔ یہ روایت تو قاضی صاحب کے موقف کے خلاف ہے۔ جب چالیس راتوں کے بعد وہ اپنی قبروں میں ہی نہیں ہوتے تو پھر ان کو پکارنے کا کیا جواز ہے۔

قاضی صاحب نے امام بیہقی کا خود ہی قول نقل کیا ہے۔ اگر یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ صحیح ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر چالیس دن ایسے ہی گزرتے ہیں۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے نمازیں پڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ صور پھونکا جائے گا۔ (عربی ص180، اردو ص226)۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام بیہقی کو روایت کے کمزور ہونے کا علم تھا۔ اسی لیے انہوں نے یقینی طور پر نہیں لکھا کہ یہ روایت صحیح ہے۔ بلکہ انہوں نے بھی صرف اِن شرطیہ یعنی اگر کے ساتھ اس کو نقل کیا اور ساتھ واللہ اعلم کا جملہ بھی لکھ دیا۔

اس روایت کے راوی بھی قاضی ہیں۔ کتاب المجروحین (ج2، ص251، رقم918) میں ابن حبان نے محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلی الانصاری کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خراب حافظے والے، بہت زیادہ وہم کا شکار ہونے والے، زبردست غلطی کرنے والے راوی تھے۔ وہم وگمان سے بہت سی منکر روایات روایت کیا کرتے تھے۔ اسی بنا پر حق ہے کہ ان کو چھوڑ دیا جائے۔ امام احمد بن حنبل اور امام یحییٰ بن معین ان سے روایت نہیں کرتے تھے اور ان کو ضعیف کہتے تھے۔

الجرح و التعدیل (ج7 ص322، رقم1739) اور الضعفاء الکبیر (ج4 ص98) میں امام شعبی کا قول ہے: میں نے ابن ابی لیلی سے زیادہ برے حافظے والا کوئی نہ دیکھا۔

امام بخاری نے التاریخ الکبیر (ج1 ص812) میں امام شعبی کے حوالے سے لکھا کہ ان کو محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلی نے چند احادیث دیں جو مقلوب تھیں۔ سند اور متن ان کا الٹ پلٹ تھا۔

امام ابن الجوزی نے الموضوعات (ج3 ص239) میں انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت نقل کی ہے کہ جب کوئی نبی علیہ السلام فوت ہوتے ہیں تو چالیس روز وہ اپنی قبر میں ویسے ہی رہتے ہیں۔ پھر ان پر ان کی روح لوٹا دی جاتی ہے۔

پھر ابن الجوزی نے لکھا کہ ابو حاتم کا کہنا ہے: یہ حدیث باطل، من گھڑت ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔

اسی لیے امام بیہقی نے ”اگر ان الفاظ کے ساتھ صحیح ہو۔“ کے الفاظ درج کیے اور جو الفاظ صحیح تھے وہ ابن الجوزی اور امام ابو حاتم کے نزدیک من گھڑت تھے۔

ایسے ہی اس سے ملتی جلتی روایات میں سے کوئی بھی ائمہ حدیث کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔

قاضی صاحب کی تیسری روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا اور یہ معاملہ بھی عالم برزخ کا تھا۔ اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔

مشکوۃ المصابیح: باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ کی الفصل الثانی میں مسند احمد اور امام بیہقی کی شعب الایمان کے حوالے سے جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کا آخری حصہ ہے:

وَلَوْ كَانَ مُوسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِيْ

اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو میری ہی اتباع کرنی پڑتی۔

صحیح بخاری: کتاب الانبیاء باب وفاۃ موسی علیہ السلام (ص 483-484) میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: موسیٰ علیہ السلام کی طرف ملک الموت کو بھیجا گیا تو انہوں نے اس کو تھپڑ مارا۔ ملک الموت نے اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ تو نے مجھے اس بندے کی طرف بھیجا جو مرنا نہیں چاہتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کے پاس پھر جاؤ اور اس سے کہو کہ بیل کی کمر پر ہاتھ رکھے اور اس کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آئیں گے۔ ان میں سے ہر بال کے بدلے ایک سال عمر مزید ملے گی۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ پیغام ملا تو انہوں نے عرض کیا۔ اے میرے رب! پھر کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر بھی موت۔ موسیٰ علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ جب مرنا ہی ہے تو انہوں نے عرض کیا: ٹھیک ہے تو اب ہی مجھے فوت کر دے۔ لیکن انہوں نے اللہ عزوجل کو یہ درخواست کر دی کہ موت آئے تو میں ارض مقدسہ سے اتنا قریب ہو جاؤں کہ جتنا کسی پتھر پھینکنے والے کا پتھر گرتا ہو۔ یعنی بالکل قریب ہو جاؤں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر میں وہاں ہوتا تو تم کو ان

کی قبر دکھاتا۔ وہ سرخ ٹیلے کے نیچے راستے کی ایک جانب ہے۔

قاضی السبکی صاحب نے حیات و ممات کے بارے میں جو تصور دیا ہے، اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر موسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا چاہیے تھا اور ملک الموت کے منہ پر تھپڑ مارنے کی بجائے اپنی روح ان کے سپرد کر دینی چاہیے تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور درست نہیں اور فوت ہونے کے بعد ہر انسان کا دنیا سے ناتا ختم ہو جاتا ہے۔

قاضی صاحب کی چوتھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں پایا۔ جس میں سے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو آپ نے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس روایت کی حقیقت کو واضح کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس سے ملتی جلتی وہ روایات بھی نقل کر دی جائیں جن کا ذکر صحیح مسلم کے حوالے سے قاضی السبکی صاحب نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ ایک حدیث مبارک ہے۔ ایک رات مجھے کعبہ کے پاس دکھایا گیا کہ میں نے ایک گندمی رنگ کے ایسے خوبصورت شخص کو دیکھا جو گندمی رنگ والے تمام انسانوں میں زیادہ حسن والا تھا۔ اس کے سر پر خوبصورت کنگھی کئے ہوئے بال تھے۔ ان سے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ دو آدمیوں پر ٹیک لگائے بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے تو بتایا گیا کہ یہ مسیح بن مریم ہیں۔

اس روایت کا اگلا حصہ ہے۔ پھر میں نے ایک اور شخص کو دیکھا جس کے بال گھنگھریالے تھے اور وہ دائیں آنکھ کا کانا تھا۔ گویا کہ وہ پھولا ہوا انگور ہے۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ دجال مسیح ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ وادی ازرق سے گزر رہے تھے۔ آپ

نے فرمایا: گویا کہ میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ گھاٹی سے نیچے اتر رہے ہیں اور تلبیہ کہہ رہے ہیں۔

پھر آپ ''ہرشیٰ'' گھاٹی پر پہنچے تو فرمایا: گویا میں یونس بن متی کو سرخ اونٹنی پر دیکھ رہا ہوں۔ وہ اون کا جبہ پہنے ہوئے ہیں اور ان کی اونٹنی کی مہار کھجور کے پٹھوں سے بنی ہوئی ہے اور وہ بھی تلبیہ کہہ رہے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔ گویا کہ میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ دونوں کانوں میں انگلیاں دیئے تلبیہ کہہ رہے ہیں۔

دجال کا ذکر

قاضی صاحب نے مذکورہ روایات صحیح مسلم: باب الاسراء (ج1) سے نقل کی ہیں لیکن اپنی عادت کے مطابق سیدھی سادی واضح روایات کو الجھا کر علمی خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور مترجم نے ان کو بخاری کی روایات قرار دے دیا ہے۔

مذکورہ روایات کے راویوں میں سے عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمر کا کہنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَرَانِی اللَّیْلَةَ فِی الْمَنَامِ مجھے رات خواب میں دکھایا گیا۔ پھر انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور دجال والی حدیث بیان کی ہے۔

یہاں ایک بہت ہی اہم نقطے کی بات ہے کہ خواب میں آپ نے دجال کو بھی بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ صحیح مسلم (ج1، ص96) میں عیسیٰ علیہ السلام کے لیے جملہ یَطُوفُ الْبَیْتَ استعمال ہوا ہے اور یہی جملہ دجال کے لیے امام مسلم نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور دجال دونوں کو آپ نے دیکھا کہ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مکہ اور مدینہ میں

دجال کا داخلہ حرام کر رکھا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری (ج13ص102، باب لا یدخل الدجال المدینة) میں مسلم کے حوالے سے نقل کیا ہے:

اِنَّہٗ لَا یَدۡخُلُ الۡمَدِیۡنَۃَ وَ لَا مَکَّۃَ بے شک وہ مدینہ اور مکہ میں داخل نہیں ہوگا۔

عطیہ کی روایت کے مطابق:

فَیَدۡخُلُ الۡقُرٰی کُلَّھَا غَیۡرَ مَکَّۃَ وَ الۡمَدِیۡنَۃِ حُرِّمَتَا عَلَیۡہِ

مکہ اور مدینہ کے علاوہ تمام بستیوں میں داخل ہوگا۔ ان دونوں کو اس پر حرام کر دیا گیا ہے۔

ص104 میں انسؓ سے مروی حدیث کے الفاظ ہیں:

لَیۡسَ مِنۡ بَلَدٍ اِلَّا سَیَطَؤُہُ الدَّجَّالُ اِلَّا مَکَّۃَ وَالۡمَدِیۡنَۃَ

کوئی شہر ایسا نہیں ہوگا مگر دجال عنقریب اس کو لتاڑے گا۔ سوائے مکہ اور مدینہ کے۔

جابرؓ کی روایت ہے: وہ زمین میں چالیس دن گھومتا رہے گا۔ مکہ اور مدینہ دو شہروں کے علاوہ ہر شہر میں وارد ہوگا۔ اللہ نے ان دونوں کو اس پر حرام کر دیا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام اور دجال کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھنا خواب ہی تھا۔ اگر قاضی السبکی صاحب کی بات مان لی جائے تو پھر دجال رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک ہی میں بیت اللہ پہنچ کر طواف کرتا رہا اور جو تباہی اس نے مچانی ہے وہ کہاں مچاتا رہا۔

امام بخاری کا قطعی فیصلہ

صحیح بخاری (کتاب التعبیر کے باب الطواف بالکعبة فی المنام ص1040) میں عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں سو رہا تھا

کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میں کعبہ کا طواف کر رہا ہوں۔ میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس کے بال کنگھی کیے ہوئے سیدھے تھے۔ وہ دو آدمیوں کے درمیان میں ہے اور اس کے سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں۔ انہوں نے کہا: یہ ابن مریم ہیں۔

پھر میں نے دیکھا کہ ایک موٹا سرخ رنگ والا آدمی ہے۔ اس کے سر کے بال گھنگریالے ہیں اور وہ دائیں آنکھ سے کانا ہے۔ گویا کہ اس کی آنکھ پھولے ہوئے انگور جیسی ہے۔ میں نے کہا: یہ کون ہے۔ انہوں نے کہا: یہ دجال ہے۔ لوگوں میں سب سے زیادہ مشابہت اس کی ابن قطن سے تھی۔ جو قبیلہ خزاعۃ میں سے بنو مصطلق کا آدمی ہے۔

بعینہ یہ حدیث صحیح مسلم (ج1 ص96) میں عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے۔ جس سے قاضی السبکی کی سوچ اور تحریر کی حتمی نفی ہو جاتی ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ قصہ خواب کا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کا بے ہوش نہ ہونا

صحیح بخاری (کتاب الرقاق، باب نفخ الصور ص965)، صحیح مسلم (ج2 ص267) میں ابوھریرۃؓ سے مروی ہے۔ مسلمانوں کے ایک آدمی اور یہودیوں کے ایک آدمی کے درمیان جھگڑا ہوا۔ مسلمان نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے تمام جہانوں پر محمد ﷺ کو چنا۔ یہودی نے کہا: قسم ہے اس کی کہ جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام جہانوں پر چنا۔ مسلمان کو اس پر غصہ آیا اور اس نے یہودی کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ وہ یہودی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اپنے اور مسلمان کے درمیان ہونے والے جھگڑے اور تھپڑ والے معاملے سے آپ کو آگاہ کیا۔ آپ نے فرمایا: مجھے

موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دیا کرو۔ قیامت کے روز جب لوگ بے ہوش ہوں گے تو سب سے پہلے میں ہوش میں آؤں گا اور دیکھوں گا کہ موسی عرش کی ایک جانب کو پکڑے ہوئے ہوں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ ان میں سے تھے جو بے ہوش ہوئے اور مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے یا ان میں سے تھے جن کو اللہ نے بے ہوشی سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔

مسلمان نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ ہم میں موجود ہیں اور یہ موسیٰ علیہ السلام کو تمام انسانوں پر فضیلت دے رہا ہے۔ اس مسلمان کی بات سن کر آپ کو غصہ آ گیا جو آپ کے چہرہ مبارک پر ظاہر ہو رہا تھا۔ اور آپ نے فرمایا: انبیاء کے درمیان کسی کو کسی پر فضیلت نہ دیا کرو۔ جب صور پھونکا جائے گا۔ آسمانوں اور زمین میں جو ہیں وہ سب بے ہوش ہو جائیں گے۔ سوائے ان کے جن کو اللہ چاہے گا کہ وہ بے ہوش نہ ہوں۔ پھر دوسری مرتبہ پھونکا جائے گا تو سب سے پہلے میں ہوش میں آؤں گا۔ میں دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کو پکڑے ہوئے ہوں گے۔ میں نہیں جانتا کہ ان کا طور والے دن بے ہوش ہونا اس بے ہوشی میں شمار ہو گیا ہو گا یا وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آئے ہوں گے اور نہ ہی میں کہتا ہوں کہ کوئی ایک یونس بن متی سے افضل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کو اجاگر کرنے کے لیے جو واقعہ بیان فرمایا امام بیہقی نے اس سے انبیاء علیہم السلام کا اپنے رب کے پاس زندہ ہونے کا استدلال کیا ہے۔ جیسے شہداء اپنے رب کے پاس زندہ ہوتے ہیں، لیکن امام بیہقی نے یہ نہیں کہا کہ ان کی زندگی دنیاوی زندگی جیسی ہے۔ جیسا کہ قاضی السبکی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔

حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثابت کرنے کا پس منظر

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب شام اور مصر فتح ہوئے اور وہاں کی

عیسائی آبادی اسلامی ریاست کا حصہ بن گئی تو مرور زمانہ کے ساتھ عیسائیوں نے موقع ملنے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سیدالانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ پر فضیلت دینے کی کوشش کرنی شروع کر دی۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی تھی کہ تمہارا قرآن کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان میں زندہ ہیں اوران کی حکمرانی ہوگی۔ جبکہ تمہارے نبی ﷺ فوت ہو کر زمین میں مدفون ہو گئے اور قیامت تک انہوں نے قبر میں دفن ہی رہنا ہے، لہٰذا ہمارے نبی افضل ہیں۔

سیدھی سی بات ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی فضیلت ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اپنا مرتبہ و مقام ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو کسی پر فضیلت نہ دیا کرو تو ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام معجزانہ طور پر بن باپ پیدا ہوئے اور معجزانہ طور پر ہی آسمان کی طرف اٹھائے گئے۔ قیامت کے قریب شام میں نازل ہو کر شریعت محمدی کے تحت فیصلے کریں گے۔ دنیا میں ملنے والا وقت پورا کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس دفن ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے جب نبوت سے نواز کر اسلام کی تبلیغ کرنے کا حکم دیا تو آپ نے مسلسل 23 سالہ جدوجہد کے بعد ملنے والی انتہائی مشکل ذمہ داری کو اللہ کی مدد و نصرت سے اس طرح نبھایا کہ سارے عرب پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔

قیامت کے روز جب تمام انبیاء علیہم السلام لوگوں کی شفاعت سے معذرت کریں گے تو شفاعت کرنے اور اس کے قبول ہونے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہوگا۔ مقامِ محمود پر آپ ہی فائز ہوں گے۔

عیسائیوں کو اسلام کی خوبیوں سے متعارف کرانے اور عیسائیت میں پیدا کردہ کمزوریوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ کام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے نہ صرف زبانی کیا

بلکہ الجواب الصحیح کے نام سے لاجواب کتاب بھی تحریر کی۔

اس کے برعکس بعض علمائے اسلام نے عیسائیوں کے مقابلے میں عیسائیوں والی ہی راہ اختیار کی کہ ہمارے نبی بھی قبر میں اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اپنی حیاتِ طیبہ میں زندہ تھے اور ان کو قبر مبارک میں کلی اختیارات ملے ہوئے ہیں۔ قاضی السبکی بھی ان میں ایک تھے۔ اللہ ان پر رحم کرے۔

حیاۃ الانبیاء علیہم السلام

صحیح مسلم (باب الاسراء ص 96) کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور دوزخ کے داروغہ مالک سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ بھی آپ کا خواب ہی تھا۔ جیسا کہ حدیث کے الفاظ سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا: قَدْ رَایْتُنِیْ فِیْ جَمَاعَةِ الْاَنْبِیَآء۔ میں نے اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں دیکھا۔ اسی طرح معراج کی رات انبیاء علیہم السلام سے ملاقات عالم برزخ میں ہوئی تھی۔ دنیاوی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ایک عظیم معجزہ تھا۔

صحیح مسلم والی حدیث کی شرح میں امام نووی نے قاضی عیاض کے حوالے سے نقل کیا ہے اور قاضی السبکی نے بھی اپنی کتاب میں قاضی عیاض کی توجیہات کو ہی رقم کیا ہے، لیکن چند جملے انہوں نے چھوڑ دیے۔ اسی طرح مترجم نے ترجمہ میں بھی کاریگری کا مظاہرہ کیا ہے۔

قاضی عیاض کا قول ہے۔ اگر کہا جائے کہ جن انبیاء علیہم السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھتے اور تلبیہ پکارتے دیکھا۔ وہ کیسے حج کرتے اور تلبیہ کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ فوت ہو

چکے ہیں۔(وَھُمْ اَمْوَاتٌ مترجم نے یہ جملہ چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے مسلک کے خلاف تھا) اور وہ دار العمل میں نہیں بلکہ دارالآخرت میں ہیں۔

ہماری معلومات کے مطابق مشائخ نے جو جواب دیے ہیں۔ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ وہ شہداء کی مثل بلکہ ان سے افضل ہیں اور شہداء اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ لہٰذا ان کے حج کرنے اور نماز پڑھنے کے معاملے کو سمجھنے میں دقت نہیں ہونی چاہیے۔ جیسا کہ ایک اور حدیث میں ہے وہ اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کے قریب ہونے میں لگے رہتے ہیں۔ اگرچہ اس دنیا میں وہ فوت ہو جاتے ہیں جو دار العمل ہے۔ یہاں تک کہ اس کی مدت ختم ہو جائے گی اور وہ آخرت آ جائے گی جو دار الجزاء ہے اور عمل منقطع ہو جائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آخرت کا عمل ذکر و دعا ہے۔ جیسے کہ قرآنِ حکیم میں ہے۔ ان کی اس میں دعا ہو گی سُبْحَانَکَ اَللّٰھُمَّ۔

تیسرا جواب ہے کہ یہ نیند کا خواب ہو جو معراج کے علاوہ یا اس کا کچھ حصہ ہو۔ جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ جب میں سو رہا تھا تو میں نے اپنے آپ کو طواف کرتے دیکھا اس کے بعد ابن عمرؓ نے عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کا ذکر کیا۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمثیلاً ان کی زندگیوں کا حال دکھایا گیا کہ ان کی زندگیوں میں حج اور تلبیہ کیسا ہوتا تھا۔ آپ نے خود ہی فرمایا۔ گویا کہ میں موسیٰ کو دیکھ رہا ہوں، گویا کہ میں یونس کو دیکھ رہا ہوں، گویا کہ میں عیسیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ وحی کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی ہو۔

قاضی عیاض کی توجیہات میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس سے ثابت ہو سکے کہ فوت شدہ انبیاء علیہم السلام کی زندگی ویسی ہی تھی جیسی ان کی حیات میں ہوتی تھی۔

درود وسلام کی روایات

قاضی السبکی کی عادت رہی ہے کہ چھوٹی سی بات کو زیادہ سے زیادہ پھیلا کر الجھایا جائے اور تاثر یہ دیا جائے کہ ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔اس لیے بار بار وہ اپنی بات کو دہراتے ہیں۔درود وسلام کے سلسلے میں اپنی کتاب کے دوسرے باب میں انہوں نے وہ تمام روایات جمع کر دی ہیں جو ان کو مل سکتی تھیں۔

راقم نے بھی اپنی اس کتاب کے تیسرے باب میں ضعیف راویوں کے بارے میں ائمہ حدیث نے جو کچھ اپنی کتابوں میں لکھا ہے، وہ نقل کر دیا ہے۔لہٰذا تکرار سے بچنے کے لیے بہتر ہوگا کہ درود وسلام کی بحث کو دیکھ لیا جائے۔

درود وسلام کی بڑی فضیلت ہے،لیکن قاضی السبکی نے اس فضیلت کو اجاگر کرنے کے بجائے رسول اللہ ﷺ کی برزخی حیات کو دنیوی حیات ثابت کرنے میں اپنا سارا علمی زور لگا دیا ہے۔اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے خلاف ہے جو اس نے اپنی مخلوق کی عمروں کے بارے میں بنایا۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات

صحیح بخاری (کتاب الرقاق، باب سکرات الموت، ص964) میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔رسول اللہ ﷺ کے پاس پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ پڑا تھا۔ جس میں آپ ہاتھ ڈال کر چہرہ مبارک پر پھیرتے اور فرماتے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ۔بے شک موت کے لیے بے ہوشیاں ہیں۔پھر آپ نے اپنے ہاتھ مبارک کو اونچا کیا اور فرمانا شروع کر دیا: فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی یہاں تک کہ آپ کی روح مبارک قبض کر لی گئی اور

آپ کا ہاتھ نیچے آ گیا۔

صحیح مسلم (مناقب الصحابة: باب فضائل عائشه ج2 ص286) میں ام المؤمنین کا قول ہے۔ آپؐ نے کہا: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاَلْحِقْنِیْ بِالرَّفِیْقِ اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما اور مجھے رفیق سے ملا۔

امام نوویؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے: لفظ رفیق واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، لہٰذا جمہور کے مطابق یہاں رفیق سے مراد انبیاء علیہم السلام کی جماعت ہے جو عِلِّیِّیْنَ میں مقام اعلیٰ میں ہیں۔ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا﴾ اور وہ بہترین رفیق ہوں گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رفیق سے مراد خود اللہ تعالیٰ ہے اور یہ بھی منقول ہے کہ اس سے مراد جنت کا اعلیٰ مقام ہے۔

صحیح بخاری (کتاب الانبیاء: باب ما ذکر عن بنی اسرائیل، ص491) میں ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ جب رسول اللہ کا آخری وقت آیا تو آپ اپنی چادر کو اپنے چہرہ مبارک پر ڈالتے اور جب گھبراہٹ ہوتی تو چہرہ مبارک سے ہٹا دیتے۔ اسی حال میں آپ نے فرمایا: ''اللہ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔'' آپ اس سے ڈرا رہے تھے جو انہوں نے کیا۔ یعنی اپنی امت کو ویسا کرنے سے منع کر رہے تھے۔

اسی باب کی دوسری حدیث کے راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا کہ بنی اسرائیل کی سیادت و قیادت انبیاء علیہم السلام کیا کرتے تھے۔ جب ایک نبی ہلاک ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا آ جاتا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ عنقریب خلفاء ہوں گے اور وہ کثرت سے ہوں گے۔

صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! تو آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ

نے فرمایا: جس کی پہلے بیعت ہو جائے اس کی وفا کرنا اور ان کو ان کا حق دیتے رہنا، اللہ عنقریب ان سے ان کی رعایا کے بارے میں پوچھے گا۔

تیسری حدیث ابوسعید الخذری سے مروی ہے۔ بے شک نبی ﷺ نے فرمایا: تم سے جو پہلے لوگ تھے، ان کے طریقے کی تم ضرور اتباع کرو گے۔ وہ بالشت کے برابر بالشت ہاتھ یعنی بازو کے برابر بازو ہو گی۔ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے سوراخ میں داخل ہو گا تو تم بھی ضرور اس میں داخل ہو گے۔ صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! اس سے مراد کیا یہود و نصاریٰ ہیں۔ آپ نے فرمایا تو اور کون؟

صحیح بخاری (فضائل ابی بکر ص 516)، صحیح مسلم (فضائل ابی بکر ج۲ ص 273) میں جبیر بن مطعم سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ایک عورت نے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے اس کو پھر آنے کو کہا۔ اس نے عرض کیا: اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں یعنی آپ فوت ہو چکے ہوں تو پھر کیا کروں۔ آپ نے فرمایا: اگر تُو مجھے نہ پائے تو ابوبکر کے پاس آنا۔

مذکورہ احادیث کی روشنی میں نبی ﷺ کی حیات و ممات اور انبیاء علیہم السلام کی برزخی اور دنیاوی حیات کا معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے اور قاضی صاحب کے پیدا کردہ غلو اور مغالطے کی نفی ہو جاتی ہے۔

امام نوویؒ نے واضح کر دیا کہ فوت شدہ انبیاء علیہم السلام مقام علیین میں ہیں اور اسی مقام کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی مبارک کے آخری لمحات میں دعا فرمائی۔

یہ وضاحت بھی ہو گئی کہ جس طرح بنی اسرائیل میں ایک نبی کے فوت ہونے کے بعد دوسرا نبی آیا کرتا تھا، اسی طرح آپ ﷺ کے بعد خلفاء آتے رہے۔ اگر نبی ﷺ قبر مبارک میں اسی طرح زندہ تھے جس طرح فوت ہونے سے پہلے زندہ تھے تو خلفائے

راشدین آپ کی جگہ لینے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

ایک سائلہ کو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں نہ ہوا تو ابو بکرؓ کے پاس آنا۔ آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا: میری قبر پر آ جانا اور میں تیرا مسئلہ حل کر دوں گا۔

آپ ﷺ نے اپنی زندگی مبارک کے آخری وقت میں جن پر لعنت فرمائی اور ان کی اتباع سے منع فرمایا، قاضی صاحب نے انہی کی راہ دکھانے کے لیے کتاب لکھ ڈالی تا کہ قیامت کے روز سند ہو جائے۔

آپ ﷺ نے جو پیش گوئی فرمائی تھی، قاضی صاحب اور ان کی راہ پر چلنے والوں نے اسی کے مطابق عمل کیا اور آج تک کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ پیش گوئی اس پر عمل کے لیے نہ تھی بلکہ اس سے بچنے کے لیے تھی۔ اللہ تعالیٰ سب کو حق اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

شہداء کی زندگیوں سے استدلال

شہداء کو اللہ کے ہاں جو زندگی ملی ہوئی ہے، اس کے بارے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا اور آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو بتایا اور وہ قرآن و حدیث کا حصہ بن گیا۔

سورۃ البقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۱۵۴)﴾ اور جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔

سورۃ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے اس کی مزید وضاحت یوں فرمائی:

﴿وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ (۱۶۹) فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۱۷۰) یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۷۱)﴾

”جو اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے، ان کو مردہ مت گمان کرو۔ بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور رزق دیے جاتے ہیں۔ اللہ نے اپنے فضل سے ان کو جو عطا کر دیا ہے۔ اس پر بہت خوش ہیں۔ اور جو لوگ ابھی ان کے پیچھے سے انھیں نہیں ملے، ان کے بارے میں بھی خوشیاں منا رہے ہیں کہ ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی نعمت و فضیلت پر بھی خوش ہو رہے ہیں اور (اس پر بھی کہ) بے شک اللہ تعالیٰ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

یہی وہ آیاتِ مبارکہ ہیں جن سے قاضی صاحب نے انبیاء علیہم السلام کی حیات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ شہداء کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی وضاحت فرما دی۔ جبکہ ایسی کوئی وضاحت انبیاء علیہم السلام کی حیات کے بارے میں قرآن و حدیث میں کہیں موجود نہیں۔ لہٰذا انہی آیات سے اپنی غلط سوچ کو صحیح ثابت کرنے میں قاضی صاحب نے اپنا علم صرف کیا ہے۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے:

معلوم ہوا کہ شہداء زندہ ہیں۔ جب شہداء کو یہ فضیلت حاصل ہے تو انبیاء علیہم السلام کو چند وجوہ کی بنا پر بدرجہ اولی حاصل ہوگی:

۱- ایک یہ کہ شہداء کو یہ مرتبہ ان کے اعزاز کے لیے دیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا رتبہ تو شہداء سے بلند ہے تو کیسے ممکن ہے کہ شہداء کو جو اعزاز حاصل ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کو

حاصل نہ ہو۔ خصوصاً جبکہ یہ اعزاز اللہ تعالیٰ سے زیادہ قرب وانس کا ذریعہ ہے۔

۲- دوسرا سبب یہ کہ شہداء کو یہ رتبہ اس لیے حاصل ہوا کہ انہوں نے اپنی جانیں اللہ کے لیے قربان کیں اور نبی ﷺ ہی نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو اس کی دعوت دی اور یہ راہ دکھائی۔ لہٰذا جتنا رتبہ ان کو ملا، وہ آپ کو بھی ملا۔ کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا، اس کو نہ صرف اس کا اجر ملے گا، بلکہ جو اس کے مطابق عمل کرے گا اس کے اجر جتنا ہی اجر ملے گا۔'' دوسری روایت کے مطابق ''جس نے کسی کو ہدایت کی طرف بلایا، اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا کہ جتنا اس ہدایت کے مطابق عمل کرنے والے کو ملے گا۔''

پس اس مفہوم کی رو سے ہر شہیدؓ کو جو اجر ملے گا، اتنا ہی نبی ﷺ کو ملے گا۔ یوں جو اجر آپ کو ملے گا، عقل اس کو شمار نہیں کر سکتی۔

۳- تیسرا سبب نبی ﷺ کا خود بھی شہداء میں داخل ہونا ہے، کیونکہ خیبر میں زہر لگا جو گوشت آپ کو کھلایا گیا، اس کا اثر بھی آپ کی وفات میں شامل تھا، لہٰذا آپ کی ذات میں نبوت اور شہادت جمع ہو گئیں۔

لفظ شہید کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد شاہد و مشہود ہے اور یہ لفظ زندہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

قاضی صاحب کے استدلال کا جائزہ

قاضی صاحب نے شہداء کی زندگی کے حوالے سے انبیاء علیہم السلام اور خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کو جیسے زندہ کیا ہے۔ ایسا استدلال تو رسول اللہ ﷺ نے نہ خود فرمایا اور نہ ہی صحابہ کی سمجھ میں آیا اور نہ ہی ائمہ تفسیر نے اپنی تفاسیر میں ایسی فکر انگیز تشریح کی۔

سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جو قتل کیے

جاتے ہیں، اپنی جانوں کا نذرانہ بارگاہ الٰہ میں پیش کرتے ہیں، ان کے لیے مردہ کا لفظ استعمال نہ کرو۔ کیونکہ کفار و منافق ان کے بارے میں ایسا ہی کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ وہ زندہ تو ہیں، لیکن ان کی زندگی کیسی ہے۔ اس کا تمہیں علم نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ دنیا میں موجود نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک میں جو صحابہ شہید ہوئے، ان کی بیواؤں کی شادیاں ہوئیں، ان کی وراثت ان کے ورثا میں تقسیم ہوئی۔

السدالغابۃ ج 1 ص 14-15 میں اسماء بنت عمیس کے بارے میں مروی ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں، اپنے خاوند کے ساتھ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ عبداللہ، عون اور محمد کو جنم دیا۔ جنگ موتہ میں جب جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوگئی ان کی شادی ابوبکر الصدیق سے ہوئی اور محمد بن ابی بکر ان کے بطن سے پیدا ہوئے۔ جب ابوبکر الصدیق بھی دنیا سے رخصت ہوگئے تو علی رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کرلیا۔

ص 22۔ رسول اللہ ﷺ کی نواسی زینبؓ کی بیٹی امامہؓ بنت العاص کی شادی فاطمہؓ کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق علیؓ سے ہوئی۔ جب علیؓ کوفہ میں شہید ہوئے تو علیؓ کی وصیت کے مطابق امامہؓ نے مغیرہ بن نوفل سے نکاح کرلیا۔

ص 386: ام کلثومؓ بنت عقبۃ بن ابی معیط جب صلح حدیبیہ کے سال ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کرلیا۔ جنگ موتہ میں جب وہ شہید ہو گئے تو زبیر رضی اللہ عنہ نے ان سے شادی کرلی اور ان کے لیے انہوں نے زینبؓ کو جنم دیا۔

ص 126: زینبؓ بنت خزیمہ ام المساکین عبداللہؓ بن جحش کے نکاح میں تھیں جب وہ جنگ احد میں شہید ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا۔ دو تین مہینے آپ

کی زوجیت میں رہتے ہوئے آپ کی حیاتِ طیبہ میں ہی فوت ہوگئیں۔

ایسے بے شمار واقعات ہیں۔ اگر قاضی صاحب کے مفروضہ کو صحیح تسلیم کرلیا جائے اور شہداء کی زندگی کو عین دنیوی زندگی مان لیا جائے تو پھر معاملہ کیا صورت اختیار کرے گا۔ اسی لیے علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے قبرستان کے پاس کھڑے ہوکر اس مسئلے کو بالکل واضح کر دیا تھا کہ شہادت پانے یا طبعی موت مرنے والوں کا تعلق دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے۔

امام ابن جریر الطبری (المتوفی 310ھ) نے اپنی تفسیر جامع البیان (ج2 الجزء 2 ص39) اَحیَآءٌ کی تفسیر میں قتادہ کا قول نقل کیا ہے: اَرْوَاحُ الشُّھَدَآءِ فِی صُوَرِ طَیْرٍ بِیضٍ۔ شہداء کی روحیں سفید پرندوں کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ جبکہ الربیع کے مطابق وہ جنت میں سبز پرندوں کی صورت میں اڑتی پھرتی ہیں، جہاں چاہتی ہیں جاتی ہیں اور جہاں سے چاہتی ہیں کھاتی ہیں۔

عکرمہ کا بھی کہنا ہے کہ وہ جنت میں سبز پرندوں کی صورت میں ہوتی ہیں۔ امام ابن جریر نے یہ بھی نقل کیا ہے۔ مومنین اور کفار برزخ میں زندہ ہوتے ہیں۔ امام جاداللہ محمود بن عمر الزمخشری (المتوفی 528ھ) نے الکشاف (ج1، البقرہ: آیت 154 کی تفسیر) میں لکھا ہے۔ وہ مردہ نہیں، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم ان کی حیات و حال کے بارے میں نہیں جانتے۔

حسن بصری سے انہوں نے نقل کیا ہے۔ شہداء اللہ کے پاس زندہ ہیں۔ ان کی ارواح پر رزق پیش کیا جاتا ہے۔

مجاہد کا قول ہے: جنتی پھلوں کا رزق دیے جاتے ہیں۔ جنتی ہوا پاتے ہیں، حالانکہ جنت میں نہیں ہوتے۔

الِ عمران کی آیت کی تفسیر ص 439 میں امام الزمخشری نے لکھا ہے۔ اللہ نے

جو شہداء کو دیا، اس پر وہ خوش ہیں اور وہ شہادت پانے کی توفیق اور دوسروں کے مقابلے میں ملنے والی فضیلت و کرامت اور اللہ کے قرب میں زندہ ہونا اور جنتی رزق کا قیامت سے پہلے مل جانا ہے۔

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی (التوفی 671ھ) نے اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن (الجزء 4 ص 268) میں الِ عمران والی آیات کی تفسیر میں سنن ابی داؤد (کتاب الجہاد، باب فی فضل الشھادۃ ص 341) کے حوالے سے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تمہارے بھائی جنگ احد میں شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں کے پیٹ میں رکھ دیا۔ وہ جنت کی نہروں کے پاس جنتی پھل کھاتے ہیں۔ پھر عرش کے سایے میں لٹکی ہوئی سونے کی قندیلوں میں رہتے ہیں۔ جب انہوں نے اپنے کھانے، اپنے پینے اور اپنی آرام گاہ کی عمدگی دیکھی تو انہوں نے کہا: ہماری طرف سے ہمارے بھائیوں کو کون پیغام پہنچائے گا کہ ہم جنت میں زندہ ہیں اور ہمیں رزق دیا جاتا ہے تاکہ وہ جہاد سے بے رغبتی نہ کریں اور دشمنوں سے جنگ میں منہ نہ موڑیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا: میں تمہاری طرف سے ان کو پیغام پہنچائے دیتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الِ عمران والی آیات نازل فرمائیں۔ اگر شہداء کی زندگی کو دنیاوی مان لیا جائے تو پھر ان کو چاہیے تھا کہ خود ہی پیغام دے دیتے۔ ابوداؤد کی روایت سے امام القرطبی نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کہ "وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور رزق دیے جاتے ہیں۔" کی وہ تفصیل بیان کر دی جو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کی تھی۔ یعنی قرآن اور حدیث سے ثابت کر دیا کہ شہداء کا دنیوی زندگی سے کوئی رابطہ اور تعلق نہیں ہوتا۔

اس کی مزید وضاحت و تائید جامع الترمذی (ابواب التفسیر ج 2 ص 147)

اور ابن ماجہ (مقدمة ص 17 باب فضل الشهادة ص 201) میں جابر رضی اللہ عنہ کے شہید باپ عبداللہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے یوں ہوتی ہے۔

جابر کا بیان ہے: رسول اللہ ﷺ کی مجھ سے ملاقات ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جابر کیا بات ہے۔ میں تجھے غم میں ڈوبے سر جھکائے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! باپ شہید ہو گئے، اولاد چھوڑ گئے اور ان پر قرض ہے۔

آپ نے فرمایا: کیا میں تجھے اس کی بشارت نہ دوں کہ تیرے باپ سے اللہ نے کس طرح ملاقات کی۔

میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! ضرور فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کو زندہ کیا (یہ جملہ ابن ماجہ میں نہیں ہے) اور بغیر کسی پردہ کے اس سے بات کی، حالانکہ اللہ نے جب بھی کسی سے بات کی تو پردہ کے پیچھے ہی سے کی۔

اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ سے فرمایا: اے میرے بندے! جو بھی تُو نے تمنا کرنی ہے وہ کر، میں تجھے دوں گا۔ تیرے باپ نے عرض کیا: اے میرے رب! مجھے دنیا میں لوٹا دے۔ تاکہ دوسری مرتبہ پھر تیرے لیے قتل کیا جاؤں۔

[تفسیر القرطبی میں فَرُدَّنِيْ اِلَى الدُّنْيَا کا جملہ ہے۔ جبکہ جامع الترمذی اور ابن ماجہ میں تُحْيِيْنِي منقول ہے۔ یعنی مجھے زندہ کر دے۔ یعنی زندہ کر کے پھر سے دنیا میں لوٹا دے۔]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: میری طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ مرنے والے دنیا میں پھر سے واپس نہیں جائیں گے۔

تیرے باپ نے عرض کیا: اے میرے رب! جو میرے پیچھے ہیں، ان تک میری خبر

پہنچادے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آلِ عمران والی آیات نازل فرمادیں۔

اس روایت سے ہر قسم کا شک وشبہ دور ہو جاتا ہے۔ مرنے اور شہادت پانے والوں کا دنیا سے قطعی اور حتمی طور پر رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔

امام القرطبی نے آلِ عمران کی آیات کے شانِ نزول میں ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ شہداء کے عزیز واقارب کو جب نعمت وسرور میسر ہوتا ہے تو حسرت میں وہ کہتے ہیں۔ ہم تو نعمت وسرور میں ہیں، جبکہ ہمارے باپ! ہمارے بیٹے اور ہمارے بھائی قبروں میں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تسلی وتشفی کی خاطر ان کے شہداء کے حال کے بارے میں خبر دے دی۔

امام القرطبی کا کہنا ہے کہ شانِ نزول کچھ بھی ہو، مگر اللہ تعالیٰ نے شہداء کے بارے میں یہ خبر دے دی کہ وہ جنت میں زندہ ہیں اور رزق دیے جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ مر چکے ہیں اور ان کے جسم مٹی میں ہیں، لیکن تمام مؤمنوں کی روحوں کی طرح ان کی بھی روحیں زندہ ہیں۔ جب سے وہ قتل کیے گئے ہیں اس وقت سے ان کو جنتی رزق ملنے کی بنا پر فضیلت دی گئی ہے۔ گویا کہ دنیا کی زندگی ان کے لیے دائمی ہے۔

امام القرطبی نے مجازی اور حقیقی زندگی کے بارے میں چند اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔ صحیح قول یہی ہے کہ شہداء کی ارواح سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہیں اور وہ جنت میں رزق دیے جاتے ہیں۔ وہ کھاتے ہیں اور نعمتوں میں رہتے ہیں۔

قاضی السبکی نے امام القرطبی کی التذکرہ کا حوالہ بھی دیا۔ چنانچہ امام القرطبی نے خود ہی لکھا ہے:

اِنَّ الْاَرضَ لَا تَاْكُلُ الْاَنْبِيَآءَ وَ الشُّهَدَآءَ وَ الْعُلَمَآءَ وَالْمُؤَذِّنِيْنَ الْمُحْتَسِبِيْنَ وَحَمَلَةَ الْقُرْاٰنَ۔ ”بے شک انبیاء علیہم السلام، شہداء، علماء، اللہ سے اجر کی امید رکھتے

ہوئے اذان دینے والے اور قرآن کے حفاظ کو زمین نہیں کھاتی۔"

امام القرطبیؒ نے شہداء کے بارے میں یہ روایت بھی نقل کی ہے:

رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے۔ شہداء کو اللہ تعالیٰ نے عزت و تکریم کے پانچ ایسے مرتبے دیے ہیں جو انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو نہیں دیے اور نہ ہی مجھے۔ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو ملک الموت قبض کرتا ہے اور میری روح عنقریب قبض کرے گا۔ جبکہ شہداء کی ارواح اپنی قدرت سے جیسے چاہتا ہے۔ اللہ خود ہی قبض کرتا ہے اور ان کی ارواح پر ملک الموت کو مسلط نہیں کرتا۔

دوسرا مرتبہ: تمام انبیاء علیہم السلام کو ان کے مرنے کے بعد نہلایا جاتا ہے اور میری موت کے بعد مجھے بھی نہلایا جائے گا۔ مگر شہداء کو نہلایا نہیں جاتا اور نہ ہی ان کو دنیا کے پانی کی حاجت ہوتی ہے۔

تیسرا مرتبہ: تمام انبیاء علیہم السلام کو کفنایا جاتا ہے اور مجھے بھی کفنایا جائے گا، مگر شہداء کو نئے کفن میں کفنانے کے بجائے ان کے اسی لباس میں دفنا دیا جاتا ہے۔

چوتھا مرتبہ: تمام انبیاء علیہم السلام جب فوت ہوتے ہیں تو ان کو "اَمْوَاتًا" یعنی مردے کہا جاتا ہے اور میں بھی جب فوت ہو جاؤں گا تو میرے بارے میں بھی کہا جائے گا: **قَدْ مَاتَ** وہ فوت ہو گئے۔ جیسا کہ (صحیح بخاری: کتاب الجنائز ص 167 کتاب المناقب ج 517) ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی وفات پر اپنے خطبہ میں کہا:

مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ "جو محمد کی عبادت کیا کرتا تھا وہ جان لے محمد ﷺ فوت ہو گئے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا وہ جان لے کہ اللہ زندہ ہے اور اس نے کبھی نہیں مرنا۔" اور شہداء کو مردے نہیں کہا جاتا۔

پانچواں مرتبہ: انبیاء علیہم السلام کو شفاعت کا اختیار قیامت کے روز دیا جائے گا جبکہ شہداء جس کی چاہیں ہر روز شفاعت کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شہداء کا اللہ کے نزدیک اپنا مقام ہے اور انبیاء علیہم السلام کی اپنی شان ہے۔ لہٰذا شہداء کی برزخی زندگی پر قیاس کر کے انبیاء علیہم السلام کی دنیوی زندگی کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔

صحیح مسلم (باب فی بیان ان ارواح الشهدآء فی الجنة و انهم احیاء عند ربهم یرزقون: ج2 ص135)، جامع الترمذی (ج2 ص147) سنن ابوداؤد (ص341) اور ابن ماجة (ص201) میں مسروقؒ سے مروی ہے۔ ہم نے عبداللہ بن مسعود سے سورۃ الِ عمران کی آیت: ﴿وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: ہم نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا اور آپ ﷺ نے فرمایا: ان کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں رکھ دی جاتی ہیں اور ان کا ٹھکانا عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی قندیلوں میں بن جاتا ہے۔ وہ جنت میں جہاں چاہتی ہیں آتی جاتی ہیں۔ پھر ان قندیلوں میں ہی رہتی ہیں۔ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا: کیا تمہیں کسی چیز کی چاہت ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہمیں کس چیز کی چاہت ہو سکتی ہے جبکہ ہم جنت میں جہاں چاہتے ہیں آتے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب تین مرتبہ یہی بات کہی اور انہوں نے سمجھا اور دیکھا کہ کچھ نہ کچھ مانگے بغیر چھٹکارا نہ ہوگا تو انہوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! ہم چاہتے ہیں کہ تُو ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں لوٹا دے تاکہ ہم تیری راہ میں پھر قتل کیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب دیکھا کہ ان کی کوئی چاہت نہیں تو وہ چھوڑ دیے گئے۔ یعنی جس حال

میں تھے اسی حال میں ان کو رہنے دیا گیا۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر شہدا کی برزخی زندگی پر قیاس کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی بھی ویسی ہی زندگی ثابت ہو جائے تو پھر ماننا پڑے گا کہ شہداء کی روحوں کی طرح آپ ﷺ کی روح مبارک بھی اللہ کے پاس جنت میں ہے۔ یوں قبر مبارک کے بارے میں جو مفروضہ قاضی صاحب نے قائم کیا اور اس کو ثابت کرنے میں کتاب لکھ ڈالی، اس کی نفی ہو جائے گی۔

لہٰذا قاضی صاحب کی سوچ کے مطابق شہداء کی برزخی زندگی سے رسول اللہ ﷺ کی دنیوی زندگی ثابت ہو جائے ایسا عقلی اور نقلی طور پر ممکن نہیں اور سیدھی اور سچی بات وہی ہے جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کی وفات کے موقع پر کہی اور سورۃ الِ عمران اور سورۃ الزمر کی یہ آیتیں پڑھیں:

﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ وَ مَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْئًا وَ سَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰکِرِیْنَ (۱۴۴)﴾

اور محمد ﷺ رسول ہی ہیں۔ ان سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں۔ اگر وہ فوت ہو گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے اور جو اپنی ایڑیوں پر پھرے گا تو اللہ کا ہرگز کوئی نقصان نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ عنقریب شکر کرنے والوں کو جزا دے گا۔

﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ (۳۰)﴾

بے شک آپ مرنے والے ہیں اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔

یعنی موت کا قانون آپ پر اور ان پر بھی جاری ہوگا۔ موت کی ضد حیات ہے۔

جب موت واقع ہو جاتی ہے تو حیات کی شمع بجھ جاتی ہے۔ یہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا کہ ایک انسان پر موت اور حیات جمع ہو جائے۔ حق اور سچ یہی ہے کہ اپنی زندگی کے آخری لحات میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس جانے اور اس سے ملنے کی جو دعا کی وہ قبول ہوئی اور آپ اپنے بھیجنے والے کے پاس پہنچ گئے۔

انتہائی غیر معقول استدلال

قاضی السبکی نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد دنیوی زندگی ثابت کرنے کے لیے ایسی دلیل دی ہے کہ معمولی سی عقل رکھنے والا آدمی بھی اس کو قبول نہیں کرے گا، چنانچہ انہوں نے لکھا:

نبی ﷺ کی زندگی کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ ﷺ کا مال آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کی ملکیت میں تھا۔ امام الحرمین نے کہا: جو چیزیں نبی ﷺ کی ملکیت میں تھیں، وہ اسی طرح وصال کے بعد بھی آپ ﷺ کی ملکیت میں تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کو اسی طرح خرچ کرتے تھے۔ جس طرح نبی ﷺ اپنی حیاتِ مبارکہ میں خرچ کیا کرتے تھے اور ان کا یہی خیال تھا۔ چونکہ نبی ﷺ کے لیے زندگی ثابت ہے۔ لہٰذا اس کی ملکیت بھی باقی ہے۔ (یہ ابوبکر پر سراسر بہتانِ عظیم ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ دنیوی احکام کے اعتبار سے بھی باقی ہے اور یہ شہداء کی زندگی سے بڑھ کر ہے، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کہتا ہے: اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (الزمر) ''بے شک آپ مرنے والے ہیں اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔'' نیز نبی ﷺ نے خود بھی فرمایا: میں بھی مرنے والا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کے وصال مبارک کے بعد کہا: محمد ﷺ پر موت واقع ہوگئی ہے۔

قاضی صاحب نے فرمایا: یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ آپ پر واقع ہونے والی موت دائمی نہ تھی بلکہ کچھ وقت کے لیے تھی۔ پھر آپ زندہ کر دیے گئے۔ ملکیت ختم ہونے کا تعلق دائمی موت سے ہوتا ہے۔ نبی ﷺ کی اخروی زندگی شہداء کی زندگی سے اعلیٰ اور اکمل ہے۔ وہ روح کے لیے بلا کسی اشکال اور جسم کے لیے ثابت ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام بوسیدہ نہیں ہوتے اور روح کا جسم میں آنا سب مُردوں کے لیے ثابت ہے۔

شہداء اور انبیاء علیہم السلام کو اس سلسلے میں فضیلت حاصل ہے، لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ آیا وہ روح مستقل طور پر جسم میں آ جاتی ہے اور جسم اسی طرح زندہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ دنیا میں تھا یا وہ جسم روح کے بغیر زندہ رہتا ہے اور روح اللہ کی مشیت کے تحت کسی اور جگہ رہتی ہے۔

روح کے ساتھ زندگی کا تعلق عقلی نہیں بلکہ عادی امر ہے۔ جسم روح کے بغیر زندہ رہے۔ عقل اس کو ممکن سمجھتی ہے اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ روح کی زندگی کے ساتھ جسم کو بھی ایک جداگانہ زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا ہے، کیونکہ نماز کے ارکان کا تعلق جسم کے اعضاء سے ہے۔

شب معراج کے بیان میں انبیاء علیہم السلام کی جو حالتیں بیان کی گئیں وہ جسمانی صفات ہی ہیں، لیکن آخرت میں جسم کی وہ صفات وضروریات نہ ہوں گی جو دنیا میں اس کو حاصل تھیں۔ وہاں بھوک و پیاس نہ ہوگی، لیکن جاننے اور سننے والے ادراک اس کو حاصل ہوں گے۔ ہم اس کا ثبوت تمام مُردوں کے لیے کریں گے اور انبیاء علیہم السلام کو کیوں حاصل نہ ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ کی ملکیت کا مسئلہ

ابوداؤد (کتاب الادب: باب فی الھوی ص 699) مسند احمد (ج 5 ص

194، ج6 ص450) میں ابوالدرداء سے مروی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔امام ابوداوٗد نے اس روایت کو الھوی کے باب میں روایت کر کے واضح کیا ہے کہ انسان جب اپنی سوچ و خواہش اور چاہت کو حق کے مقابلے میں ترجیح دیتا ہے تو وہ اندھوں اور بہروں جیسی صورت اختیار کر لیتا ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ ص میں داوٗد علیہ السلام سے ارشاد فرمایا:

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ(٢٦)﴾

اے داوٗد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔پس لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرنا اور نفسی خواہشات کی اتباع نہ کرنا کیونکہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔بے شک جو لوگ اللہ کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں،ان کو سخت عذاب اس لیے ہوگا کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔

اللہ تعالیٰ نے تقی الدین ابوالحسن علی بن عبدالکافی السبکی کو شام کا قاضی القضاۃ بنایا، لیکن انہوں نے امام ابن تیمیہؒ کی مخالفت میں ایسی کتاب لکھ دی کہ جس میں دینی مسائل کو قرآن وسنت کی تعلیم اور محققین کی تحقیق کو اپنی سوچ اور خواہشات کے تابع کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

قاضی صاحب کو اچھی طرح علم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی میراث آپ کے ورثاء میں کیوں تقسیم نہ ہوئی۔قاضی ہونے کے ناتے وہ احکامِ میراث سے کیسے ناواقف ہو سکتے تھے،لیکن انہوں نے اپنے اختیار کردہ موقف کی خاطر جان بوجھ کر حق کو نظر انداز کر دیا۔

صحیح بخاری (کتاب الخمس ص435،فضائل اصحاب النبی ص526،

المغازی ص 575۔ النفقات ص 806، الفرائض ص 955، الاعتصام ص 1085)، صحیح مسلم (ج2، کتاب الجھاد، ص 90، 91، 92)، سنن ابی داؤد: (کتاب الامارۃ ص 412، 414، 416) سنن النسائی (کتاب الفیٔ ج 2 ص 72) جامع الترمذی (کتاب السیر ج1 ص 230) اور مسند احمد (ج 1 ص 4 ج 2 ص 462 اور ج 6 ص 145) میں متعدد بار یہ روایت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ ہماری میراث ورثا میں تقسیم نہیں ہوتی۔ ہم جو چھوڑیں وہ صدقہ ہوگا۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اللہ نے جو قانون بنایا رسول اللہ ﷺ نے امت کو اس کے بارے میں بتا دیا۔ ابوبکرؓ نے فاطمہؓ، علیؓ، عباسؓ اور ازواجِ مطہرات کو اس سے آگاہ کر دیا۔

کسی بھی حدیث کی کتاب میں کہیں بھی یہ مذکور و منقول نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چونکہ ہماری دنیوی حیات قبر مبارک میں جاری رہے گی۔ لہٰذا ہماری میراث تقسیم نہیں ہوگی۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف جو خیال قاضی صاحب نے منسوب کیا ہے اس کا جواب انہی کو اللہ کے ہاں دینا ہے۔ ابوبکرؓ کو اگر معلوم ہوتا کہ قبر مبارک میں بھی قاضی صاحب کے دعویٰ کے مطابق رسول اللہ ﷺ زندہ ہوں گے تو وہ کبھی خلیفہ نہ بنتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ دفن نہ ہونے دیتے۔ اگر ان کے علم میں ہوتا کہ قبر مبارک میں آپ سے رابطہ ہوسکتا ہے تو ہر موقع پر آپ سے رہنمائی لیتے۔ جبکہ خلفائے راشدین میں سے کسی نے ایسا نہ کیا اور نہ ایسا سمجھا۔

صحیح بخاری (کتاب الخمس ص 435) میں عائشہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فاطمہؓ نے ابوبکرؓ سے رسول اللہ ﷺ کی چھوڑی

ہوئی اس میراث میں سے حصہ مانگ لیا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بن لڑے عطا کی تھی۔

ابوبکرؓ نے ان ؓ سے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہماری میراث ورثاء میں تقسیم نہیں ہوتی۔ جو چھوڑیں وہ صدقہ ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہؓ نے جب یہ بات سنی تو غصے میں آگئیں اور ابوبکرؓ سے ترک ملاقات کردی اور اپنی وفات تک ان سے ملاقات نہ کی۔ وہ چھ ماہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہیں۔

فاطمہؓ نے ابوبکرؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ترکہ میں سے حصہ طلب کیا جو آپ کے خیبر، فدک اور مدینہ میں صدقہ کی صورت میں تھا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا: میں اس میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ مگر میں اسی کے مطابق عمل کروں گا۔ مجھے خطرہ ہے اگر میں نے اس معاملے میں سے کچھ چھوڑا تو گمراہ نہ ہو جاؤں۔

پھر مدینہ میں صدقہ کا جو مال تھا، وہ عمرؓ نے علیؓ اور عباسؓ کے سپرد کردیا اور جو خیبر اور فدک میں تھا اس کو روک لیا اور کہا یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے صدقہ ہیں۔ آپ نے ان کو غیر معمولی حقوق و مصارف کے لیے رکھا ہوا تھا اور ان کا معاملہ اسی کے ہاتھ میں ہوگا جو خلیفہ بنے گا۔

اس روایت میں عجیب نکتے کی بات یہ ہے کہ نہ تو ابوبکرؓ نے فاطمہؓ سے کہا کہ ابا جان کی قبر مبارک پر جائیں اور میراث کے سلسلہ میں اُن سے پوچھ آئیں اور نہ ہی ابوبکرؓ کو خیال آیا کہ پاس ہی قبر مبارک ہے۔ ذرا وہاں جا کر آپ کی خدمت میں عرض کروں کہ آپ کی لخت جگر مجھ سے ناراض ہوگئی۔ ذرا اس کو سمجھا دیں کہ میں نے جو کیا اور کہا ہے وہ عین آپ کے ارشاد کے مطابق ہے۔ کاش کہ قاضی صاحب ہی جب حج پر گئے تھے تو اس

اہم مسئلے کے بارے میں آپ سے کوئی وضاحت کرا لیتے۔

صحیح بخاری (باب نفقة نسآء النبیﷺ بعد وفاته، ص 437) میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ''بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری بیویوں اور میرے عاملوں کے خرچہ کے بعد جو چھوڑ جاؤں، اس میں سے میرے ورثا کو ایک دینار بھی تقسیم نہ کریں، وہ صدقہ ہے۔ اسی باب میں دوسری حدیث عائشہؓ سے مروی ہے۔ ان کا کہنا ہے ''جب رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے تو میرے گھر میں کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ جس کو کوئی جگر والا کھا سکے۔ سوائے آدھا وسق جو کے جو مچان پر پڑے ہوئے تھے۔ میں ایک مدت تک ان میں سے کھاتی رہی۔ پھر میں نے ان کا وزن کیا تو وہ ختم ہو گئے۔''

تیسری حدیث کے راوی عمرو بن الحارث ہیں۔ ان کا قول ہے ''رسول اللہ ﷺ نے اسلحہ، سفید خچر اور زمین کے علاوہ کچھ نہ چھوڑا۔ جو چھوڑا وہ صدقہ تھا۔

جس ملکیت کی بنا پر قاضی صاحب نے آپ کی دنیوی حیات ثابت کرنے کی کوشش کی وہ آپ کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اختیار میں آئی اور ان کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اختیار میں رہی۔ جس میں سے دو سال بعد مدینہ والی ملکیت کا انتظام و انصرام علیؓ اور عباسؓ کی خواہش پر ان کے حوالے کر دیا۔ بعد میں ان کے درمیان بھی اختلاف ہو گیا، لیکن آپ کی قبر مبارک پر جانے کے بجائے وہ عمر فاروقؓ ہی کے پاس آئے۔ جیسا کہ بخاری مسلم نے نقل کیا ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آپ کی وراثت تقسیم کیوں نہ ہوئی اور اس کو صدقہ کیوں کیا گیا اور وہ خلفائے راشدین کے اختیار میں کیوں رہی؟

سورۃ الاحزاب میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (٦)﴾

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے حق دار ہیں اوراس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کوازروئے ادب واحترام مؤمنوں کی مائیں قرار دیا گیا۔ جب ازواجِ مطہرات مائیں بنادی گئیں تو آپ پھرامت کے باپ ہو گئے۔ آپ کی میراث آپ کے چند ورثا کے بجائے ساری امت کا حق ہو گئی۔ جس کو آپ نے صدقہ قرار دے دیا۔ جیسا کہ ابو بکر صدیقؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثا پر واضح کر دیا اور آپ کی وصیت کے مطابق عمل ہوتا رہا۔

قاضی صاحب نے رسول اللہ ﷺ کی دنیوی حیات کے ثبوت میں وقتی موت کا ایسا تصوراپنی کتاب میں پیش کیا ہے جو قرآن وحدیث میں بیان ہونے والی حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ موت دائمی ہی وہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے مرنے والے کا دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ کسی انسان کے جسم کے بوسیدہ نہ ہونے سے اس کی دائمی زندگی ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء میں واضح کر دیا ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشہ زندہ رہنے کا سلسلہ قائم نہیں کیا۔ جو دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے وہ پھر سے دنیا میں نہیں آ سکتا۔ جیسا کہ شہداء نے اللہ سے درخواست کی جو قبول نہ ہوئی۔ سورۃ الروم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا ذکر یوں فرمایا:

﴿اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ (۴۰)﴾

اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی، پھر تمہیں رزق دیا۔ پھر تمہیں مارتا ہے پھر تمہیں زندہ کرے گا۔

سورۃ عبس میں مزید وضاحت یوں ہوتی ہے:

﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۱۷) مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (۱۸) مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ

فَقَدَّرَہٗ(۱۹) ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَہٗ(۲۰) ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ(۲۱) ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَہٗ(۲۲)﴾

ہلاک ہوا انسان کتنا ناشکرا ہے۔ اللہ نے اس کو کس چیز سے پیدا کیا۔ نطفہ سے اس کو پیدا کر کے اس کی تقدیر مقدر کی۔ پھر دنیا میں اس کی راہ آسان کی۔ پھر اس کو فوت کر کے قبر میں دفن کرایا۔ پھر اللہ جب چاہے گا اس کو اٹھائے گا۔

سورۃ البقرہ کے الفاظ ہیں:

﴿کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ کُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ(۲۸)﴾

تم اللہ کا کیسے انکار کرتے ہو۔ حالانکہ تم بے جان تھے۔ پھر اس نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر وہ تمہیں مارے گا۔ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

مذکورہ آیات سے وضاحت ہوتی ہے کہ دنیا میں پیدا ہونے والے انسان کی تخلیق اس کی ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے۔ جب دنیا میں ملنے والی زندگی کے ختم ہونے کا وقت آتا ہے تو اس پر دائمی موت مسلط کر کے اس کو قبر میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ پھر میدانِ حشر میں حاضر ہونے کے لیے اس کو زندہ کیا جائے گا اور تمام انسان اپنے خالق و مالک کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے۔ یعنی کسی انسان کا مرنے کے بعد پھر دنیا کی طرف لوٹنا ممکن نہیں ہوگا۔

صحیح بخاری (کتاب التفسیر ص 711-735)، صحیح مسلم (باب مابین النفختین ج 2 ص 406,407) میں ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دونوں نفخوں کے درمیان چالیس کا وقفہ ہوگا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: چالیس دن ہوں گے یا چالیس مہینے یا چالیس سال تو انہوں نے کہا: مجھے معلوم نہیں،

لیکن آسمان سے بارش ہو گی اور انسان زمین سے ایسے اُگیں گے جیسے سبزا اُگتا ہے۔ سوائے ایک ہڈی جس کو عَجبُ الذَّنبِ کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان مٹی میں مٹی ہو جاتا ہے۔ قیامت کے روز اسی ریڑھ کی ہڈی سے انسان کی پھر سے تخلیق ہو گی۔

انبیاء علیہم السلام کے اجسام کو مٹی پر حرام کرنے سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ ان کی برزخی زندگی بھی ان کی دنیوی زندگی ہی جیسی ہوتی ہے۔ جیسا کہ قاضی صاحب نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فوت ہونے پر ان کو نہلایا، کفنایا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں دفنایا گیا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ان کے بعد ان کا خلیفہ بنایا گیا۔

معراج میں آپ کو جو دکھایا گیا، وہ بھی عالم برزخ کا معاملہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، پھر ان سے چھٹے آسمان پر ملاقات ہوئی تو اس سے کیا ثابت ہو جائے گا کہ وہ دنیا میں زندہ ہیں۔ اسی طرح جو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا وہ سب کچھ ایک عظیم معجزہ تھا۔

سماعِ موتیٰ سے استدلال

قبر مبارک میں تملیک کے بعد قاضی السبکی نے اپنے آخری دلائل میں سے قبروں میں مردوں کے سننے، ان کے بیٹھنے، ان سے سوال کیے جانے اور ان کے جواب دینے کو بھی دلیل بنایا ہے۔ جس کے لیے انہوں نے حسب ذیل احادیث کا حوالہ دیا ہے:

1- انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مردہ قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اس سے جدا ہو کر اتنی دور جاتے ہیں کہ مردہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے تو دو فرشتے اس مردے کے پاس پہنچ جاتے ہیں، اس کو بٹھا کر اس سے سوال کرتے ہیں: تُو اس شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ مردہ جواب

دیتا ہے: میں گواہی دیتا ہوں، یہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں: جہنم میں تیرا ٹھکانا تھا، اس کو دیکھ، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں تجھے جنت میں ٹھکانا دے دیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: وہ دونوں ٹھکانوں کو بیک وقت دیکھتا ہے۔ کافر و منافق اس سوال کے جواب میں کہتا ہے: مجھے معلوم نہیں، لوگ جو کہتے تھے میں بھی وہی کہتا تھا۔ اس سے کہا جاتا ہے تُو نے پڑھا اور سمجھا کیوں نہیں؟ پھر لوہے کا ہتھوڑا اس کے کانوں کے درمیان مارا جاتا ہے۔ جس سے وہ چیختا چلاتا ہے۔ سوائے جنوں اور انسانوں کے آس پاس کے سب سنتے ہیں۔ امام مسلم نے اس روایت سے ملتی جلتی روایت نقل کی ہے۔

2- ترمذی کی روایت کے مطابق دو فرشتے مؤمن سے کہتے ہیں: جیسے نئی دلہن سوتی ہے تُو ویسے ہی سو جا۔ اس کو وہی بیدار کرے گا جو اس کے اہل میں سے اس کو محبوب ہوگا۔

3- ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب جنازہ تیار ہو جاتا ہے اور لوگ اس کو کاندھوں پر اٹھاتے ہیں، اگر وہ نیک ہو، تو کہتا ہے: مجھے جلدی لے چلو۔ اگر وہ بد ہو تو کہتا ہے: ہائے ہائے مجھے کہاں لیے جا رہے ہو۔ اس کی آواز انسانوں کے علاوہ سب سنتے ہیں۔ اگر انسان سن لیں تو بے ہوش ہو جائیں۔

4- جنگ بدر میں قتل ہونے والے کفار جو گڑھے میں پڑے ہوئے تھے، نبی ﷺ نے پکار کر جب ان سے گفتگو فرمائی تو صحابہؓ سے فرمایا: تم میری آواز ان سے زیادہ نہیں سن رہے ہو۔

5- ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: میں نبی ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا اور آپ ﷺ دو کے درمیان میں تھے۔ آپ دو قبروں کے پاس پہنچے تو آپ نے فرمایا: دونوں قبروں والے اس وقت عذاب میں مبتلا ہیں۔ تم دونوں میں سے کون ہے جو کھجور کی

ایک شاخ توڑ کر لائے۔ ہم دونوں دوڑے، لیکن میں ساتھی سے پہلے شاخ توڑ کر لے آیا۔ آپ ﷺ نے اس کو اوپر سے چیر کر دو ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا ایک قبر پر اور ایک ٹکڑا دوسری قبر پر گاڑ دیا اور فرمایا: جب تک ان شاخوں میں تری رہے گی، شاید کہ ان کے عذاب میں کمی کر دی جائے گی۔ آپ نے فرمایا: ایک غیبت کی وجہ سے اور دوسرا پیشاب کرتے ہوئے احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہے۔ امام طیالسی نے اس کو روایت کیا۔ مترجم نے یہاں پر غلطی کی ہے کہ اس روایت کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منسوب کر دیا۔ حالانکہ اس کے راوی ابوبکرۃ ہیں۔

6- براء بن عازب سے مروی ہے۔ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک انصاری کے جنازے کے ساتھ چلے۔ جب قبر پر پہنچے تو آپ ﷺ بیٹھ گئے۔ ہم آپ ﷺ کے چاروں طرف خاموشی سے ایسے بیٹھے گویا کہ ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہوں۔ نبی ﷺ کبھی آسمان کی طرف دیکھتے اور کبھی زمین کی طرف۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: میں قبر کے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ کلمات چند بار دوہرائے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: مؤمن بندہ جب دنیا کے آخری وقت اور آخرت کے ابتدائی وقت میں ہوتا ہے تو ایک فرشتہ اس کے سرہانے آ کر بیٹھتا اور کہتا ہے: اے نفس مطمئنہ! اللہ کی مغفرت اور خوشنودی کی طرف نکل، تو اس کی روح اس پانی کے قطرہ کی مانند نکلتی ہے جو قطرہ لٹکائے ہوئے مشکیزے سے نکلتا ہے۔ پھر سورج کی طرح روشن چہروں والے فرشتے جنتی کفن وحنوط اور خوشبو لے کر آ جاتے ہیں۔ حد نظر تک اس کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ فرشتہ اس کی روح کو قبض کرتے ہی ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ہے۔ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آتا ہے، ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی

روح قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔

اس کی روح بہترین خوشبو کی مانند اس کے جسم سے نکلتی ہے اور اس کو لے کر فرشتے آسمان کی طرف چڑھتے ہیں۔ جب وہ آسمان و زمین کے درمیان کسی گروہ کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ گروہ پوچھتا ہے: یہ کس کی پاک روح ہے؟ فرشتے اس کا بہترین نام لے کر ان کو بتاتے ہیں۔ جب وہ فرشتے دنیا کے آسمان پر پہنچتے ہیں تو ان کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ پھر مقرب فرشتے اس کے ساتھ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ساتویں آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کو حکم ملتا ہے اس کا نام ''علیین'' میں لکھ دو۔

سورۃ المطففین میں ارشاد ہے: تجھ کو کیا خبر ''عِلِّیُّوْنَ'' کیا ہے؟ وہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے اور اس کی گواہی مقربین دیتے ہیں۔

اس کا نام علیین میں لکھ دیا جاتا ہے۔ پھر کہا جاتا ہے: اس کو زمین میں لوٹا دو، کیونکہ میرا ان سے وعدہ ہے۔ سورۃ طٰہٰ :55 کے الفاظ ہیں: اسی سے ہم نے تمہاری تخلیق کی اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں دوسری مرتبہ نکالیں گے۔

وہ روح زمین کی طرف لوٹا دی جاتی ہے۔ پھر دو سخت مزاج فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور اس کو بٹھا کر اس سے سوال کرتے ہیں:

تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کونسا ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ اور میرا دین اسلام ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں تُو ان کے بارے میں کیا کہتا ہے جو تم میں بھیجے گئے۔ وہ جواب میں کہتا ہے: وہ اللہ کے رسول ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں: تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا۔ بندہ کہتا ہے: وہ ہمارے پاس ہمارے رب کی واضح نشانیاں لے کر آئے۔ میں ان پر ایمان لایا اور میں نے ان کی تصدیق کی۔ اس سلسلے میں سورۃ ابراہیم میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''جو لوگ ایمان لائے، اللہ تعالیٰ ان کو مضبوط بات کے ساتھ دنیوی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔'' پھر ایک پکارنے والا آسمان سے اعلان کرتا ہے۔ میرے بندے نے سچ کہا۔ اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے جنت کا بچھونا بچھا دو۔ جنت میں اس کی جو جگہ ہے وہ اسے دکھا دو۔ حکم کی تعمیل ہوتی ہے اور اس کی قبر حد نظر تک کشادہ کر دی جاتی ہے۔ پھر اس کے اعمال ایسے حسین ترین شخص کی صورت میں اس کے پاس لائے جاتے ہیں کہ جس کا لباس بہترین ہوتا ہے اور اس سے بہت ہی اچھی خوشبو آتی ہے۔ وہ آ کر کہتا ہے: بشارت ہو، تجھے ان نعمتوں کی جو اللہ نے تیرے لیے تیار کی ہیں اور بشارت ہو تجھے اللہ کی رضامندی کی اور بشارت ہو تجھے جنت کی دائمی نعمتوں کی۔

مردہ اس سے کہتا ہے: اللہ تجھے خیر کی بشارت دے۔ تُو کون ہے۔ وہ کہتا ہے: یہ وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا گیا تھا اور وہ معاملہ ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ میں تیرا نیک عمل ہوں۔ اللہ کی قسم! میں جانتا تھا کہ تُو اللہ کی اطاعت میں بڑا تیز رو تھا اور گناہ کرنے میں بہت سست تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے جزائے خیر عنایت کی ہے۔ تب وہ مردہ کہتا ہے: اے اللہ! جلد قیامت قائم کر دے تا کہ میں اپنے اہل و عیال کے پاس لوٹ جاؤں۔

اگر وہ بدکار ہے تو آخری وقت میں فرشتہ اس کے سرہانے بیٹھ کر کہتا ہے: اے خبیث روح! نکل اور اللہ کے غضب و ناراضی کا پیغام سن۔ پھر کچھ فرشتے ایسے آتے ہیں جن کے چہرے سیاہ ہوتے ہیں اور ان کے پاس ٹاٹ کا کفن ہوتا ہے۔ جب فرشتہ اس کی روح نکالتا ہے تو وہ فوراً اس کو اس سے لے لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ روح جسم میں چھپتی پھرتی ہے اور فرشتہ اس کو اس طرح نکالتا ہے کہ اس کے ساتھ

رگیں پٹھے بھی کٹ جاتے ہیں۔ جیسے گیلی روئی میں لوہے کا مڑا ہوا سریا ڈال کر نکالا جائے تو اس کے ساتھ روئی بھی آ جاتی ہے۔ ملک الموت سے جب وہ روح لی جاتی ہے تو اس سے بہت بری بو آتی ہے۔ فرشتے ان کو لیے ہوئے جب زمین و آسمان میں کسی مجمع کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں کہ یہ کس کی روح ہے۔ فرشتے اس کے برے نام ان کو بتاتے ہیں اور جب دنیا کے آسمان تک پہنچتے ہیں تو اس کا دروازہ نہیں کھولا جاتا اور حکم ہوتا ہے: اس کو واپس زمین میں لے جاؤ، ہمارا وعدہ ہے کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور پھر اسی سے دوبارہ تم کو اٹھائیں گے۔ فرشتے اس کو زمین کی طرف پھینک دیتے ہیں۔

سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (۳۱)﴾

جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، گویا کہ وہ آسمان سے گرا۔

جب زمین کی طرف اس کو لوٹایا جاتا ہے اور روح جسم میں واپس آ جاتی ہے تو دو سخت مزاج فرشتے اس کے پاس آ جاتے ہیں اور اس سے سوال کرتے ہیں: تیرا رب کون؟ تیرا دین کونسا ہے؟ وہ کہتا ہے: مجھے معلوم نہیں۔ فرشتے پوچھتے ہیں: ان کے بارے میں کیا کہتا ہے جو تم میں بھیجے گئے۔ وہ نبی ﷺ کا نام نہیں لے پاتا اور کہتا ہے: مجھے معلوم نہیں، لوگ کوئی نام لیا کرتے تھے۔ پھر اس کی قبر اس قدر تنگ کر دی جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں اور اس کے اعمال ایک ایسے برے چہرے والے شخص کی صورت میں اس کے پاس آتے ہیں کہ جس کے کپڑے میلے کچیلے اور اس کا بدن بدبودار ہوتا ہے اور وہ اس سے کہتا ہے: اللہ کے عذاب اور اس کے غضب کی تجھ کو بشارت ہو۔ وہ مردہ اس سے کہتا

ہے: تُو کون ہے۔ وہ جواب دیتا ہے: میں تیرا خبیث عمل ہوں۔ اللہ کی قسم! میں جانتا تھا کہ تُو اللہ کی فرمانبرداری میں نہایت سست اور گناہ کرنے میں بڑا چست تھا۔

ایک دوسری سند سے یہ الفاظ بھی ہیں:

اس پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے جو گونگا بہرہ ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھوڑا ہوتا ہے کہ اگر پہاڑ پر مارا جائے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ وہ اس مردے پر ایسی ضرب لگاتا ہے کہ جن وانس کے علاوہ سب سنتے ہیں۔ اس کی روح اس میں پھر لوٹا کر اس پر پھر ضرب لگائی جاتی ہے۔

مترجم کا کمال

مترجم نے ابوداوٗد الطیالسی کے حوالے سے براء بن عازب سے مروی حدیث کا تقریباً ایک صفحہ اس لیے چھوڑ دیا کہ اس میں حدیث کے ایک راوی منھال بن عمرو پر جرح مذکور تھی۔ اگر چہ قاضی صاحب نے خود ہی جرح کا ذکر کر کے اس کا جواب دینے کی کوشش بھی کی، لیکن یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ منھال بن عمرو متکلم فیہ ہے۔ ابن حزم نے اس کی روایت کا انکار کیا ہے۔ حالانکہ اس روایت کے بغیر بھی عذابِ قبر اور قبر میں سوال و جواب کا بخاری و مسلم میں ثبوت موجود ہے۔

سماعِ موتیٰ کی حقیقت

قاضی السبکی نے جن احادیث کا حوالہ دیا ہے، ان سے عالم برزخ میں کلام کرنے اور سننے، بیٹھنے، سوالوں کے جواب دینے، جنت و دوزخ میں اپنے ٹھکانے دیکھنے، نیکو کاروں کے اجر پانے اور بدکاروں کے عذاب میں مبتلا ہونے والی سب

باتیں حق اور سچ ہیں، لیکن قاضی صاحب جو ثابت کرنا چاہتے تھے وہ ثابت نہیں ہوا کہ قبروں میں ملنے والی زندگی اور دنیا والی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور اہل قبور کا اہل دنیا سے رابطہ قائم رہتا ہے۔ مرنے کے بعد وہ فوراً زندہ ہو جاتے ہیں اور جو وہ کہتے ہیں، اہل دنیا اس کو سن لیتے ہیں۔

نیک صالح انسان کی موت واقع ہونے کے بعد اس کے عزیز و اقارب اس کو قبرستان دفنانے کے لیے لے جاتے ہیں اور وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ مجھے جلدی لے چلو۔ علیین میں اس کا نام درج کرایا جاتا ہے۔ ساتویں آسمان تک جانے کا شرف اس کو حاصل ہو چکا ہوتا ہے، لیکن اٹھانے اور قبرستان پہنچانے والوں کو اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

اسی طرح بدکار کہہ رہا ہوتا ہے مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔ یعنی اس کو اپنا انجام نظر آ رہا ہوتا ہے، لیکن اس کے پیارے اس کو اٹھائے اس کی قبر میں دفن کر کے آ جاتے ہیں۔ جب میت کو اٹھانے والے اس کا کلام سن نہیں پاتے تو قبر میں سے اس کی بات کیسے سن لیں گے۔ قبر میں اس کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ وہ چیخ و پکار کرتا ہے، لیکن کوئی اس کی مدد کو نہیں آتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم اس کی بات سن لو تو بے ہوش ہو جاؤ۔

فتح الباری (ج3 ص 236) میں حافظ ابن حجر عقلانی نے ابوداؤد کے حوالے سے نقل کیا ہے: نیک میت کو جہنم میں اس کا گھر دکھا کر کہا جاتا ہے: اللہ عزوجل نے تجھ پر رحم کرتے ہوئے اس سے تجھے بچا لیا اور اس کی بجائے تجھے جنت میں گھر دے دیا۔ وہ نیک بندہ کہتا ہے: مجھے چھوڑ دو میں اپنے اہل میں جا کر ان کو یہ خوشخبری سناؤں۔ اس سے کہا جاتا ہے: چپ ہو جا۔ جامع الترمذی (ابواب الجنائز ج1 ص159) کا حوالہ خود قاضی صاحب نے دیا ہے۔ مؤمن سے کہا جائے گا: نئی بیاہتا دلہن کی نیند جیسی نیند سو جا۔ اس کو وہی بیدار کرے گا جو اس کے اہل میں سے اس کے نزدیک زیادہ محبوب ہو گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی نیک بندے کا مرنے کے بعد اپنے اہل سے کوئی رابطہ نہیں رہتا۔ رسول اللہ ﷺ جب فوت ہوئے تو اس وقت آپ ﷺ کی نو بیویاں تھیں، کسی بیوی نے کبھی خبر نہیں دی کہ آپ ﷺ سے اس کا کوئی رابطہ ہوا تھا۔

جہاں تک جنگ بدر میں مارے گئے مکہ کے سرداروں کو آپ کے پکارنے کا تعلق ہے تو اس بارے میں صحیح بخاری (باب ما جاء فی عذاب القبر ص 183) اور صحیح مسلم (فی اثبات عذاب القبر ج2 ص 387) میں وضاحت موجود ہے: وَلٰكِنَّ لَا يُجِيْبُوْنَ...... وَلٰكِنَّهُمْ لَا يَقْدِرُونَ أَن يُجِيْبُوْنَ لیکن وہ اس پر قدرت نہیں رکھتے کہ میری بات کا جواب دیں۔

صحیح مسلم میں یہ بھی الفاظ ہیں: لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ اَنْ يَرُدُّوْا عَلَيَّ شَيْئاً۔ وہ میری بات کا کچھ بھی جواب دینے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

صحیح بخاری (کتاب الجنائز ص 183، کتاب المغازی ص 567) میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: اِنَّهُمُ الْاٰنَ يَسْمَعُوْنَ بے شک وہ اب سن رہے ہیں، جبکہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: اِنَّهُمُ الْاٰنَ لَيَعْلَمُوْنَ بے شک وہ اس وقت جانتے ہیں جو میں ان سے کہہ رہا ہوں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی دلیل تھی کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النمل میں فرمایا: اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ''بے شک آپ مردوں کو سنا نہیں سکتے'' اور سورۃ فاطر کے الفاظ ہیں: وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ''جو قبروں میں ہیں، آپ ان کو سنا نہیں سکتے۔''

سورۃ نمل کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی تشبیہ مُردوں سے دی ہے، یعنی کفر پر ڈٹے رہنے والے قبروں میں پڑے مُردوں جیسے ہی ہیں۔ جس طرح وہ سن نہیں سکتے، اسی طرح کفار بھی آپ کا کلام نہیں سنیں گے یعنی آپ کی دعوت قبول نہیں کریں گے۔

قتادہ رضی اللہ عنہ نے انس رضی اللہ عنہ سے حدیث قلیب نقل کرنے کے ساتھ اس کی بہترین وضاحت بھی کردی۔

اَحۡیَاھُمُ اللّٰہُ حَتّٰی اَسۡمَعَھُمۡ قَوۡلَہٗ تَوۡبِیۡخًا وَّ تَصۡغِیۡرًا وَّ نِقۡمَۃً وَّ حَسۡرَۃً وَّ نَدَمًا۔ (کتاب المغاری ص566)

"اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا، یہاں تک کہ آپ کی بات ان کو سنائی جوان کے لیے ملامت، ذلت، سزا اور حسرت وندامت تھی۔"

چونکہ بدر میں قتل ہونے والے متکبر ومغرور سرداروں نے آپ کی دعوت حق کو نہ صرف ٹھکرایا، بالکل شمع توحید کو بجھانے میں پوری طرح کوشاں رہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ان کو معجزانہ طور پر سنا دیا۔ اسی لیے اس روایت کو امام ولی الدین ابوعبیداللہ خطیب تبریزی نے اپنی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کے باب المعجزات میں نقل کیا ہے۔

فوت ہونے والوں کا فوت ہونے کے بعد نہ کوئی ان کا کلام سنتا ہے اور نہ ہی قبر میں جوان کا معاملہ ہوتا ہے، اس سے کوئی آگاہ ہوتا ہے۔ ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ اصل میں اسلام میں جب سے ممکنات، احتمالات اور تاویلوں کا سلسلہ شروع ہوا، تب سے دین کی سیدھی سادی تعلیم کو مختلف گروہوں میں تقسیم ہونے والوں نے اپنے اپنے مسلک اور سوچوں کے مطابق ڈھالنے میں خوب زور لگایا ہے۔ قاضی السبکی بھی ان میں سے ایک تھے، اللہ ان پر رحم کرے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کا بہترین تبصرہ

حافظ ابن حجر عسقلانی (المتوفی 852ھ) اپنے زمانے میں قاضی القضاۃ، مفسر،

محدث، فقیہ، مؤرخ، شاعر اور نثر نگار تھے، لیکن علم الحدیث میں اللہ نے ان کو جس عزت وعظمت سے نوازا، اسلامی تاریخ میں وہ بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہوئی۔ انہوں نے تقریباً 150 بڑی اور چھوٹی کتابیں لکھیں، لیکن سب سے زیادہ مقبول ہونے والی کتاب صحیح بخاری کی شرح فتح الباری ہے جو چودہ جلدوں میں ہے۔ ان کی زندگی میں اس کا مخطوطہ 300 دینار میں فروخت ہوتا تھا۔ فن الرجال کے موضوع پر ان کی تہذیب التہذیب 12 جلدوں میں، الاصابة فی تمیز الصحابة 8 اجزاء: 4 جلدوں میں، الدرر الکامنة 2 جلدوں میں اور لسان المیزان 7 جلدوں میں اہل علم کے لیے بہت ہی مفید کتابیں ہیں۔ انہوں نے امام الرافعی کی الکبیر کی 4 جلدوں میں بہت ہی عمدہ تلخیص و تخریج "تلخیص الحبیر" کے نام سے کی ہے۔

وہ بھی شافعی تھے، لیکن قبر میں سوالوں کے جواب دینے کے لیے میت کو جو زندگی ملتی ہے، اس کے بارے میں انہوں نے فتح الباری (ج 3 ص 240-241) میں لکھا ہے کہ اس سے مراد دنیا کی وہ معروف زندگی نہیں ہوتی جس میں روح اپنے بدن و تدبیر اور تصرف سے قائم ہوتی ہے اور دنیا میں زندہ انسان جس کے محتاج ہوتے ہیں، اس کی وہ بھی محتاج ہوتی ہے۔ بلکہ وہ تو زندگی کا اعادہ محض قبر میں ہونے والے امتحان کے لیے ہوتا ہے اور وہ اعادہ بھی عارضی ہوتا ہے۔ جیسا کہ کئی چیزوں کے بارے میں بہت سے نبیوں کے سوالوں کے لیے مخلوق کو زندہ کیا گیا، لیکن پھر وہ مردہ ہو گئے۔

بنی اسرائیل کے ایک مردہ کا واقعہ

سورۃ البقرہ میں موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں دھوکے سے قتل کیے جانے اور اس کے زندہ ہو کر پھر مر جانے کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَ اِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِيۡهَا وَ اللّٰهُ مُخۡرِجٌ مَّا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ (۷۲) فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا كَذٰلِكَ يُحۡيِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى وَ يُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (۷۳)﴾

اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا، پھر اس میں تم نے اختلاف کیا اور اللہ وہ ظاہر کرنے والا ہے جو تم چھپا رہے تھے۔ پھر ہم نے کہا اس گائے کے ایک حصے کو مقتول کے جسم سے لگاؤ (اور وہ زندہ ہو جائے گا) اور اسی طرح ہم مردوں کو زندہ کریں گے اور اللہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل کرو۔

اس واقعہ کی پوری تفصیل تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن کثیر میں یوں منقول ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک مالدار شخص تھا، اس کی ایک لڑکی کے سوا کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک بھتیجا اس کے پاس رہتا تھا۔ جس کو لالچ وطمع نے اندھا کر دیا تھا۔ شیطان نے اس کے ذہن میں یہ ڈالا، چچا کو قتل کرو۔ اس کی بیٹی سے شادی کر کے چچا کی کل جائیداد و مال کے مالک بن جاؤ۔ چنانچہ اس نے ایک رات چچا کو قتل کر کے قوم کے قلعے کے دروازے پر پھینک دیا اور دن کی روشنی ہونے پر اپنے چچا کی تلاش میں دکھاوے کے لیے نکلا۔ اس لاش کو قلعے کے دروازے پر دیکھ کر ان پر قتل کرنے کا الزام لگا دیا۔ دیت نہ ملنے کی صورت میں قتل وغارت کا بازار گرم کرنے کی دھمکی دے دی۔

قلعے والے موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور پیش آنے والی مشکل میں ان سے مدد چاہی۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے وہ حکم قوم کو سنا دیا۔ قوم نے کہا: آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔ یعنی ہم تو قتل کا معاملہ آپ کے پاس لے کر آئے ہیں اور آپ گائے ذبح کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جہلاء میں سے ہو جاؤں۔ مجھے جو حکم ملا ہے میں

نے تمہیں سنا دیا ہے۔ پھر انہوں نے گائے کے بارے میں سوال کرنے شروع کر دیے اور موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان کو جواب دیتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ گائے ذبح کرنے پر تیار ہو گئے، لیکن جب گائے خریدنے نکلے تو گائے ایک ایسے نیک لڑکے کے پاس تھی جو ماں باپ کی بڑی خدمت کرنے والا تھا اور وہ گائے فروخت کرنے پر کسی بھی قیمت پر تیار نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے گائے کے وزن کے برابر سونا جب اس لڑکے کو دیا گیا تو اس نے گائے قلعہ والوں کے حوالے کر دی۔ جو ذبح کر دی گئی اور اس کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کے جسم کے ساتھ جیسے ہی لگایا گیا تو وہ زندہ ہو کر بیٹھ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی موجودگی میں جب اس کے قاتل کے بارے میں اس سے پوچھا تو اس نے بتایا: میرا قاتل میرا بھتیجا ہی ہے۔ یہ جواب دینے کے بعد وہ پھر مردہ ہو گیا۔

ابو العالیہ کے تفسیر ابن جریر الجزء الاول ص 360 میں الفاظ ہیں:

اَمَرَهُمْ مُوسٰى اَنْ يَّاخُذُوا عَظْمًا مِّنْهَا فَيَضْرِبُوْا بِهِ الْقَتِيْلَ فَفَعَلُوا فَرَجَعَ اِلَيْهِ رُوْحَهٗ فَسَمّٰى لَهُمْ قَاتِلَهٗ ثُمَّ عَادَ مَيِّتًا كَمَا كَانَ۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کو حکم دیا، گائے کی ایک ہڈی لو اور اس مقتول کے جسم سے لگاتے رہو۔ انہوں نے ویسا ہی کیا۔ جس سے اس کے جسم میں اس کی روح لوٹ آئی اور اس نے قاتل کا نام بتا دیا۔ پھر اسی طرح مردہ ہو گیا جس طرح پہلے تھا۔

انسانی تاریخ میں ایسے اور بھی واقعات ہیں جن کی طرف حافظ ابن حجر عسقلانی نے اشارہ کیا ہے۔ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو غائب کی ان خبروں کے بارے میں ہی علم ہوتا تھا جتنا ان کو بتایا جاتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے وقت کے بہت بڑے نبی بلکہ کلیم اللہ تھے، لیکن قتل کا مقدمہ جب ان کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے اللہ سے رہنمائی کی دعا کی جو قبول ہوئی اور نہ صرف مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا بلکہ مردوں کو عارضی زندگی

ملنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا اور اللہ نے اپنی مخلوق پر یہ بھی واضح کر دیا کہ قیامت کے روز مردے زندہ ہوں گے۔

قبروں میں عذاب کی خبر

قاضی السبکی نے دو ایسی بھی روایتیں نقل کی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے قبروں میں عذاب پانے والوں کے بارے میں صحابہ کو خبر دی۔ یہ بھی آپ ﷺ کا معجزہ ہی تھا۔ اللہ نے آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے بتایا اور آپ ﷺ نے صحابہ کو قبر کے عذاب سے ڈرایا۔

شفاء السقام کے اُردو ترجمہ میں مترجم نے بڑی رنگ آمیزی کا مظاہرہ کیا ہے۔ قاضی صاحب کی عربی کتاب میں ابواب اور فصلوں کا ذکر تو ہے، لیکن جس طرح مترجم نے اُردو کتاب میں عنوان قائم کیے ہیں، وہ اصل کتاب میں معدوم ہیں۔

قاضی صاحب نے لکھا ہے: صحیح مسلم میں زید بن ثابت کی روایت ہے۔ نبی ﷺ بنونجار کے ایک باغیچہ میں خچر پر سوار تھے کہ اچانک آپ کا خچر اتنا بدکا کہ آپ گرنے کے قریب ہو گئے۔ دیکھا تو وہاں چند قبریں ہیں۔ آپ نے فرمایا: کوئی ان قبروں کے بارے میں جانتا ہے کہ کب مرے۔ ایک نے عرض کیا: شرک کی زندگی میں مرے۔ آپ نے فرمایا: یہ عذاب میں مبتلا ہیں۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ تم مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ تم کو عذابِ قبر کی وہ کیفیت سنا دے جو میں سن رہا ہوں۔

مترجم نے اس روایت پر عنوان قائم کر دیا "جانوروں کا عذابِ قبر سننا" یہ عنوان قائم کرنے کا نہ امام مسلم کو خیال آیا اور نہ قاضی السبکی کے ذہن میں یہ بات آئی، لیکن مترجم نے یہ کمی پوری کر دی۔

یہاں بھی یہ وضاحت ہوتی ہے کہ نبی ﷺ کو عذابِ قبر کی خبر تو دے دی گئی، لیکن

مدفون کون تھے اور کب دفن ہوئے، یہ آپ کو نہ بتایا گیا۔ اگر بتایا جاتا تو آپ ﷺ کو صحابہؓ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

قاضی السبکی کی حق بات

مردے کو قبر میں زندہ کرنے یا کیے جانے اور سوال کے لیے اس کی روح کو اس کے جسم میں لوٹائے جانے کے بارے میں جمہور کا جو عقیدہ و قول ہے، اس سے وہ اچھی طرح واقف تھے اور اس کا ذکر بھی انہوں نے کیا ہے، لیکن ان کی مجبوری یہ تھی کہ انہوں نے امام ابن تیمیہ کی مخالفت میں اس چیز کو صحیح ثابت کرنے کی ذمہ داری لے رکھی تھی جسے امام ابن تیمیہؒ نے قرآن وسنت کی عین تعلیم کے مطابق غلط ثابت کیا تھا۔

قاضی صاحب نے روح کے بارے میں غیر متعلقہ اور غیر ضروری بحث کرتے ہوئے آخر حق بات لکھ ہی دی۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے:

خلاصہ یہ ہے کہ روح جسم میں واپس آتی ہے اور سوالات کے وقت مردے کو زندہ کر دیا جاتا ہے اور اس وقت سے قیامت تک عذاب یا راحت میں ہوتا ہے۔ یہ بات مسلسل ہے یا وقفہ وقفہ سے ہے اور یہ معاملہ صرف روح کے ساتھ ہے یا روح اور جسم دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس میں سے ہر بات عقلاً جائز ہے، لیکن اس سلسلہ میں شرعاً کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس سے کسی خاص پہلو پر صحیح طور پر استدلال کیا جا سکے۔

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: مرنے کے بعد انسان کا ریڑھ کی ہڈی کے علاوہ سارا جسم بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر جسم کا کوئی حصہ باقی رہتا ہے تو زندگی اس کے متعلق ہو سکتی ہے اور اگر سارے کا سارا بوسیدہ ہو جائے تو پھر زندگی کا تعلق صرف روح سے رہے گا۔ ایک وقت میں وہ فنا بھی ہو گی اور اس کو دوبارہ لوٹایا جائے گا۔

مناسب تو یہی ہے کہ قاضی صاحب کے اس اقرار کے بعد بحث کو ختم کر دیا جائے، کیونکہ یہی حق اور سچ ہے۔ مردوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اُن کے بارے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور اس میں کسی پہلو پر خاص کوئی شرعی دلیل بھی نہیں ہے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے جلد 3 کے صفحات 233 سے 241 تک میں عذابِ قبر اور روح کے بارے میں لمبی بحث میں تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے امام القرطبی سے نقل کیا ہے کہ یہ معاملہ عالم برزخ میں ہوگا اور اس سے عذابِ قبر ثابت ہو جاتا ہے۔ یعنی عالم برزخ اور عالم دنیا کا معاملہ الگ الگ ہے۔ جو عالم برزخ منتقل ہو جاتے ہیں ان کا تعلق عالم دنیا سے ٹوٹ جاتا ہے۔

قاضی السبکی نے خود ہی نقل کیا ہے کہ مؤمن مردے کی قبر ستر ہاتھ کشادہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ دفنانے اور اس کے دعا کرنے کے لیے آنے والوں کو قبر اتنی ہی نظر آتی ہے جتنی اس کو دفنانے کے وقت تھی۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا نشان بھی مٹ جاتا ہے۔ اگر قبر والے کا تعلق دنیا سے قائم رہتا ہے تو اس کی قبر کی کشادگی کا معاملہ بھی اہل دنیا سے مخفی نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے ہی قبر کا تنگ ہونا اور پسلیوں کے پسلیوں میں داخل ہونا بھی کسی کو نظر نہیں آتا۔

ارواح کی بحث

اللہ تعالیٰ نے جب ارشاد فرما دیا اور آپ سے اعلان کروا دیا: **الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّی**۔ ''روح میرے رب کے امر سے ہے''، تو پھر امام الغزالی اور اطباء کے حوالے سے کی گئی بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اتنا ہی کافی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ملا ہے۔ اسی طرح عذابِ قبر کے بارے میں معتزلہ اور ملحدوں کے عقائد و

نظریات سے بھی ہماری کوئی بحث وسروکار نہیں۔

قاضی صاحب نے بغیر حوالہ یہ بھی تحریر کیا ہے کہ شہید اور جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات جوفوت ہوگا، اللہ اس کو قبر کے فتنہ سے بچالے گا۔شہید کے بارے میں تو قرآن نے واضح کردیا ہے۔ جبکہ جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات فوت ہونے والے کے بارے میں جو روایت ہے امام ترمذی نے اس کو اپنی جامع کے ابواب الجنائز: باب ما جاء فیمن یموت الجمعة (ج 1 ص 160) میں عبداللہ بن عمرو سے نقل کیا ہے۔ ان سے بیان کرنے والے کا نام ربیعہ بن سیف ہے۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ روایت غریب اور غیر متصل ہے کیونکہ ربیعہ بن سیف جس سے روایت کرتا ہے۔ اس کا نام ابو عبدالرحمٰن الحبلی ہے اور ہم نہیں جانتے کہ ربیعہ بن سیف نے عبداللہ بن عمرو کو سنا تھا۔

اس روایت کی سند میں ایک راوی سعید بن ابی ھلال ہے جس کے بارے میں ابن حزم کا کہنا ہے وہ قوی نہیں۔ جیسا کہ میزان الاعتدال (ج2 ص162) اور تھذیب التھذیب (ج4 ص 95) میں منقول ہے۔ جابر کو انہوں نے پایا نہیں، لیکن ان سے مرسلاً روایت بھی کردی۔ ایک روایت کے مطابق ان کی وفات 135ھ میں جبکہ دوسری کے مطابق 149ھ میں ہوئی۔

قاضی صاحب نے کعب احبار سے حوالہ کے بغیر جو روایت فرشتوں کے نزول کے بارے میں نقل کی ہے کہ آپ ﷺ کی قبر مبارک پر صبح وشام ستر ستر ہزار فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ستر ہزار فرشتوں کی معیت میں ہی قیامت کے روز زمین میں سے آپ نکلیں گے۔

یہ روایت سنن الدارمی کے مقدمہ (ص25)، کتاب الزھد لابن المبارک رقم 1600 اور التذکرہ لامام القرطبی (ج1 ص 217) میں مذکور ہے۔ نبیہ بن وہب سے

مروی ہے کہ کعبؒ حضرت عائشہ ﷝ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہونے پر انہوں نے کہا: ہر روز صبح ہونے پر ستر ہزار فرشتے نازل ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کی قبر مبارک کو گھیر لیتے اور اپنے پَر پھڑ پھڑاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں، یہاں تک کہ رات ہو جاتی ہے...... پھر وہ آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں اور اتنے ہی اور نازل ہو جاتے ہیں۔ زمین آپ ﷺ پر جب پھٹے گی تو آپ ﷺ ستر ہزار فرشتوں کی معیت میں ہی نکلیں گے۔

اس حدیث کے متن پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور سند میں ابن لھیعۃ اور سعید بن ابی ھلال بھی ہیں جو ضعیف ہیں اور کعب احبار عمر فاروق ﷛ کی خلافت میں مسلمان ہوئے اور روایت رسول اللہ ﷺ کی زوجہ مطہرہ ام المؤمنین کے سامنے بغیر کسی حوالے کے بیان کر رہے ہیں۔ جن کے حجرہ میں رسول اللہ ﷺ مدفون تھے ان کو کعب احبار ایسی حدیث کے بارے میں خبر دے رہے ہیں جو ان کے سوا کوئی بیان کرنے والا نہیں تھا۔

اصل میں جب عمر فاروق ﷛ کی خلافت میں اسلامی سلطنت بہت وسیع ہو گئی اور بہت سے یہود و نصاریٰ اور مجوسی اسلام میں داخل ہو گئے تو اپنے نبیوں اور رسولوں کے بارے میں ان کے جو عقائد اور عقیدت کی بنیاد تھی، انہوں نے اسلامی عقائد میں اس کی آمیزش کر دی۔

امام الحاکم اور امام البیہقی

امام الحاکم: شذرات الذھب (ج2ص176) میں امام ابوعبداللہ الحاکم محمد بن عبداللہ النیسابوری کے بارے میں منقول ہے۔ وہ 331ھ میں پیدا ہوئے اور 405ھ میں ،ن کی وفات ہوئی۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، لیکن سب سے زیادہ شہرت

پانے والی المستدرك ہے۔اس میں انہوں نے ان روایات کو جمع کیا ہے جو بخاری مسلم یا بخاری یا مسلم کی شرط پر پوری اترتی تھیں،لیکن انہوں نے اپنی حدیث کی کتابوں میں ان کو روایت نہیں کیا۔

خطیب بغدادی کا قول ہے کہ ان کا شیعیت کی طرف میلان تھا۔امام الذہبی کا کہنا ہے وہ ابوبکرؓ،عمرؓ اور عثمانؓ کی تعظیم کرتے،لیکن امیر معاویہ کے بارے میں گفتگو اچھی نہ کرتے۔جس بنا پر ان پر سختی بھی ہوئی۔

ان کی المستدرك میں یہ جملہ بڑی کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ یہ حدیث بخاری ومسلم یا دونوں میں ایک کی شرط پر ہے اور وہ کتاب کا آدھا حصہ بن جاتا ہے۔ایک چوتھائی حصے کی سندیں صحیح ہیں۔مگر ان میں بھی بعض ایسی ہیں جن میں کوئی نہ کوئی علت پائی جاتی ہے۔بقیہ چوتھا حصہ منکر و واہیات روایات پر مشتمل ہے۔ان میں بھی بعض موضوع (من گھڑت) ہیں۔امام الذہبی کا کہنا ہے: مجھے یہ معلوم اس وقت ہوا جب میں نے المستدرك کی تلخیص کی۔

تذكرة الحفاظ (ج3 ص1043) کے الفاظ ہیں: اس میں کوئی شک نہیں کہ المستدرك میں بہت سی احادیث صحت کی شرط پر صحیح نہیں، بلکہ اس میں من گھڑت روایات بھی ہیں۔

امام البیھقی: امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی کے بارے میں تذكرة الحفاظ (ج3 ص 1132) میں منقول ہے کہ ان کی پیدائش 384ھ میں اور وفات 458ھ میں ہوئی اور وہ امام الحاکم کے کبار شاگردوں میں سے تھے کیونکہ انہوں نے اپنے اساتذہ میں سے سب سے زیادہ مدت انہی کے ساتھ گزاری۔اسی لیے انہوں نے زیادہ تر روایات امام الحاکم سے لی ہیں۔

امام الذہبی کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کے پاس سنن النسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ نہ تھیں۔ بلکہ مستدرك الحاکم تھی۔ جس سے انہوں نے زیادہ اخذ کیا۔

ان کی مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں:

(1) السنن الکبیر، (2) الاسماء والصفات، (3) السنن والاثار، (4) شعب الایمان، (5) دلائل النبوہ، (6) السنن الصغیر، (7) الزهد، (8) البعث، (9) المعتقد، (10) الآداب، (11) نصوص الشافعی، (12) المدخل، (13) الدعوات، (14) الترغیب والترهیب، (15) کتاب الخلافیات، (16) اربعون الکبری، (17) اربعون الصغری، (18) مناقب الشافعی، (19) مناقب احمد، (20) کتاب الاسری۔

قاضی تقی الدین السبکی کے بیٹے تاج الدین السبکی نے طبقات الشافعیہ میں دونوں اماموں کی روایات پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، لیکن اعتراض وارد کرنے والے قاضی تاج الدین السبکی کے استاد امام الذہبی ہیں۔ جن کا فن الرجال میں بہت بلند مقام ہے۔ لہٰذا اعتراضات اپنی جگہ موجود ہیں۔ ان کا رَد کرنے کے بجائے ان کا صحیح جواب یہ ہے کہ دونوں اماموں نے جو ضعیف روایات نقل کی ہیں، ان کے بارے میں ان کی نیت نیک ہی تھی۔ انہوں نے ان کو صحیح ہی سمجھا، لیکن علم الجرح والتعدیل کے مطابق ان کی صحت درست نہ تھی اور فن الرجال اتنا وسیع علم ہے کہ اس میں غلطی کا سرزد ہو جانا ناممکن ومحال نہ تھا۔ بلکہ بڑے بڑے محدثین سے ایسی غلطیاں ہوئیں۔ چونکہ اس وقت روایات کی پرکھ کرنے کی وہ سہولت بھی عام میسر نہ تھی جو بعد میں عام ہوگئی۔ لہٰذا اماموں پر خطاء کا بوجھ ڈالے بغیر ضعیف وموضوع روایات کو ترک کرکے صحیح روایات کو اپنا لینا چاہیے۔

قاضی تاج الدین السبکی کی مجبوری یہ تھی کہ ان کے والد محترم نے المستدرك اور دلائل النبوۃ اور حیاۃ الانبیاء کی جن روایات کو اپنی کتاب میں نقل کیا، ان میں سے اکثر ضعیف وموضوع ہیں۔ امام الحاکم اور امام بیہقی دونوں ہی شافعی تھے اور دونوں ہی مسلک شافعی کی حمایت میں اہم کردار ادا کرنے والے تھے۔ لہٰذا ان کا دفاع کرنے کا ان کو حق تھا۔ اس میں وہ کامیاب ہوئے یا نہیں یہ الگ بات ہے۔

دلائل النبوۃ اور حیاۃ الانبیاء کا پس منظر

امام بیہقی کی ان دونوں کتابوں کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جس میں سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کے بارے میں شکوک وشبہات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور ان میں پیش پیش اسلامی سلطنت کے اندر پھیلے ہوئے عیسائی اور ان کی مدد کرنے کے بہانے اس وقت کے عیسائی حکمران تھے۔ جنہوں نے صلیبی جنگوں کا آغاز کرتے ہوئے 351ھ میں بیت المقدس پر قبضہ کرلیا اور اہل اسلام اپنے باہمی افتراق وانتشار کی بنا پر کچھ نہ کر سکے۔ تقریباً نوے سال بیت المقدس عیسائی تسلط میں رہا۔ اللہ کے مجاہد بندے صلاح الدین ایوبی نے کئی سخت جنگی معرکوں کے بعد اللہ کا پرچم بیت المقدس پر پھر سے لہرا دیا۔

صلیبی جنگوں کی وجہ سے عیسائیوں میں ایک عقیدہ پھیل گیا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہو کر تمام دنیا پر ایک سو سال حکمرانی کریں گے۔ جس کا آغاز فلسطین ہی سے ہو گا۔ صلاح الدین ایوبی نے ان کے اس عقیدہ کو غلط تو ثابت کر دیا، لیکن عیسائیوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ اور بااختیار ہونے کی نفی نہ ہو سکی۔ لہٰذا اس عقیدہ کے مقابلے میں انبیاء علیہم السلام اور خاص طور پر محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ برزخیہ کو دنیاوی حیات کے برابر

کرنے اور دنیا میں ان کے صاحب تصرف ہونے والی احادیث نے بھی جنم لے لیا اور بعض علماء کی کتابوں کا وہ حصہ بھی بن گئیں۔ حالانکہ قرآنِ حکیم اہل اسلام کے پاس ایسا معجزانہ کلام ہے جس کی حقانیت پر نہ کبھی کوئی حرف آیا ہے اور نہ ہی قیامت تک ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔ اہل اسلام جب تک اس کی تعلیم کے مطابق عمل کرتے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کا ناصر و حامی اور مددگار رہے گا۔ ہمیں کسی ایسے عقیدے کی ضرورت نہیں جس میں غیر اسلامی عقائد کی آمیزش ہو۔

یہود و نصاریٰ اور مشرکوں کی پیروی کرتے ہوئے اہل اسلام نے بہت سے رسم و رواج ایسے اپنا لیے ہیں جن کی اسلام میں صریحاً ممانعت ہے اور ان کی نشاندہی کرنے اور ان کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ اپنے بندے پیدا کرتا رہتا ہے اور ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ دلائل النبوۃ اور حیاۃ الانبیاء اور ان کی مثل اگر دوسری کتابوں میں ضعیف و موضوع روایات مذکور ہیں تو وہ ایک ردّعمل کی صورت تھی جس کا حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

قبر میں کلام کرنا

جامع الترمذی (ابواب صفة القیامة، ج2 ص 82) میں ابوسعید الخدری سے مروی غریب حدیث ہے کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ اپنے مصلی میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے چند لوگوں کو دیکھا کہ وہ بہت ہنس رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم لذتوں کو توڑنے والی موت کا ذکر کثرت سے کرتے تو وہ تمہیں یوں ہنسنے نہ دیتی جیسا کہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: فَاكْثِرُوا مِنْ ذِكْرِ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتَ۔ ''پس

لذتوں کو توڑنے والی موت کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔'' کیونکہ قبر پر کوئی ایسا دن نہیں آتا مگر وہ کہتی ہے: میں اپنوں سے جدا کرنے والا گھر ہوں، میں تنہائی والا گھر ہوں، میں مٹی والا گھر ہوں اور میں کیڑوں مکوڑوں والا گھر ہوں۔

جب مؤمن بندے کو دفن کیا جاتا ہے تو قبر اس کو خوش آمدید کہتی ہے اور اس کو بشارت دیتی ہے: مجھ پر چلنے والوں میں سے تو میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب تھا۔ آج جب تو میرے حوالے کر دیا گیا ہے تو عنقریب دیکھے گا کہ میں تیرے ساتھ کیا سلوک کرتی ہوں۔ پھر جہاں تک اس کی نظر جاتی ہے، وہاں تک اس کے لیے فراخ ہو جاتی ہے اور اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔

جب کوئی کافر فاجر بندہ دفن کیا جاتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے کہ مجھ پر چلنے والوں میں سے سب سے زیادہ برا تو ہی تھا۔ لہٰذا تیرے لیے کوئی خوش آمدید نہیں۔ آج جب تو میرے سپرد کر دیا گیا ہے تو عنقریب تو دیکھے گا کہ میں تیرے ساتھ کیا سلوک کرتی ہوں۔ پس قبر اس کے لیے اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی ایک طرف والی پسلیاں دوسری طرف والی میں گھس جاتی ہیں پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈال دیا اور فرمایا: اس پر پھر ستر اژدھے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک زمین پر پھونک دے تو قیامت تک کچھ نہ اُگے۔ جو اس کو نوچتے اور کاٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ حساب کے لیے اس کو آگے کر دیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسی لیے قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

امام ابن الجوزی نے بھی اپنی کتاب مثیر الغرام الساکن الی اشرف الاماکن (باب کلام القبر ص 283) میں بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

امام القرطبی نے التذکرۃ (ج 1 ص 119) اور علامہ سیوطی نے اسی باب کے تحت اپنی کتاب شرح الصدور میں ترمذی والی روایت اور اس سے ملتی جلتی ابن ابی الدنیا، طبرانی الاوسط اور ابن مندہ کی روایات کو بھی جمع کر دیا ہے۔

ترمذی کی روایت میں مذکور حصہ کہ ''لذتوں کو توڑنے والی موت کا ذکر کثرت سے کیا کرو'' کو سنن ابن ماجہ: کتاب الزھد ص 314، المستدرك (ج 4 ص 321) سنن نسائی (کتاب الجنائز رقم 1825)، ابن حبان (الجنائز ج 2 ص 281 اور کتاب الزھد (زیادات الزھد حماد ص 32) نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔

قاضی السبکی نے مردوں کے کلام کرنے اور سننے سے ان کی دنیاوی زندگی ثابت کرنے کی کوشش فرمائی۔ اگر عالم برزخ میں ان کے کلام کرنے سے ان کی دنیاوی زندگی کا ثابت ہونا تسلیم کر لیا جائے تو پھر قبر کے کلام کرنے سے قبر کی زندگی بھی ثابت ہو جائے گی۔ جو کسی بھی سلیم العقل انسان کے لیے قابل قبول نہ ہو گی۔ لہٰذا عالم برزخ والے معاملے کو جمہور کے فیصلے کے تابع کرنے میں ہی عقل مندی اور دین کی عافیت ہے۔

المستدرك (ج 1 ص 371 اور ج 4 ص 330-331) کی صحیح روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ہانی سے مروی ہے کہ جب عثمان رضی اللہ عنہ کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اتنا روتے کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہو جاتی ان سے کہا جاتا کہ آپ جنت دوزخ کا ذکر کرتے ہوئے نہیں روتے، لیکن قبر پر آ کر روتے ہیں تو وہ کہتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے جو اس میں سے نکل گیا اس کے لیے بعد والا معاملہ آسان ہو جاتا ہے اور جو اس میں سے نجات نہ پا سکا اس کے لیے اگلا معاملہ بہت سخت ہو گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قبر والے معاملے سے بڑھ کر میں نے خوف و

گھبراہٹ طاری کرنے والا اور کوئی معاملہ نہ دیکھا۔

قاضی السبکی نے امام القرطبی کی التذکرة فی احوال الموتی وامور الاخرة کے چند حوالے تو دیے، لیکن شاید انہوں نے یہ کتاب پڑھی نہیں تھی اور اگر پڑھی ہوتی تو اپنی کتاب میں برزخ والی زندگی کو دنیا والی زندگی ثابت کرنے کی کوشش کبھی نہ کرتے کیونکہ آٹھ سو سے اوپر صفحات پر مشتمل اس کتاب میں نبی ﷺ کی برزخی زندگی سے جو کچھ قاضی صاحب نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس بارے کچھ بھی منقول نہیں۔ "التذکرة" کے پہلے ہی باب میں امام القرطبیؒ نے امام مسلم کے حوالے سے انس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت نقل کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمُوْتَ وَ لَا يَدْعُ بِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّأْتِيَهٗ اِنَّهٗ اِذَا مَاتَ اَحَدُكُمْ اِنْقَطَعَ عَمَلُهٗ وَ اِنَّهٗ لَا يَزِيْدُ الْمُؤْمِنَ عُمُرُهٗ اِلَّا خَيْرًا۔

(رقم حدیث 2682)

"تمہارا کوئی ایک موت کی تمنا ہرگز نہ کرے اور نہ ہی اس کے آنے سے پہلے اس کے آنے کی دعا کرے۔ کیونکہ جب تمہارا کوئی ایک مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے اور مؤمن کو اس کی عمر نیک اعمال میں زیادہ ہی کرتی ہے۔"

امام القرطبیؒ نے پھر علماء کے حوالے سے موت کی وضاحت یوں فرمائی:

الموت لیس بعدم محض ولا فناء صرف۔ وانما هو انقطاع تعلق الروح بالبدن ومفارقته و حیلولة بینهما و تبدل حال و انتقال من دار الی دار وهو من اعظم المصائب و قد سماه الله تعالی مصیبة فی قوله تعالی فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ (المائدہ:106) و الموت هو المصیبة العظمی و الرزیة الکبری۔

موت عدم محض اور صرف فناء ہی نہیں بلکہ وہ تو بدن سے روح کے تعلق کو منقطع کرنے اور اس کو اس سے جدا کرنے اور دونوں کے درمیان حائل ہونے اور حال کو تبدیل کرنے اور ایک گھر سے دوسرے گھر یعنی دنیا سے برزخ میں منتقل کرنے کا ذریعہ و سبب ہے اور وہ عظیم مصائب میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد مبارک میں اس کا نام مصیبت رکھا ہے جو سورۃ المائدہ میں فرمایا ہے "پس تم کو موت کی مصیبت پہنچی" چنانچہ موت بہت ہی عظیم و کبیر مصیبت پر مصیبت ہے۔

ابوعبداللہ الترمذی الحکیم کی نوادر الاصول میں مروی یہ روایت بھی نقل کر دی:

آدم علیہ السلام کا بیٹا جب مر گیا تو انہوں نے حواء سے کہا: تمہارا بیٹا مر گیا ہے۔ حواء نے پوچھا: مَا الْمَوْت موت کیا ہوتی ہے۔ آدم علیہ السلام نے بتایا: لَا يَأْكُلُ وَلَا يَشْرَبُ وَ لَا يَقُومُ وَ لَا يَقْعُدُ نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، نہ کھڑا ہوتا ہے اور نہ ہی بیٹھتا ہے۔

یہ سنتے ہی حواء نے بلند آواز سے رونا شروع کر دیا۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا: ایسے وقت پر چلانا اور رونا تم اور تمہاری بیٹیاں ہی کیا کرو گی۔ جبکہ میں اور میرے بیٹے اس سے بری ہیں۔ یعنی ہم ایسا نہیں کیا کریں گے۔

نہج البلاغۃ: (خطبہ 226) فراقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں: اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ کی وفات سے نبوت و احکام الٰہی اور آسمانی اخبار کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

قاضی السبکی نے جو کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ درست ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خبر (نعوذ باللہ) غلط ہو گی۔

اسی خطبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا: اگر آپ نے رونے چلانے، شور مچانے سے منع نہ کیا اور صبر کرنے کا حکم نہ دیا ہوتا تو ہم رو رو کر آنکھوں میں آنسوؤں کے

چشمے خشک کر دیتے، مگر حزن وغم پھر بھی رہتا، لیکن موت وہ چیز ہے جس کا روکنا اور دفع کرنا ممکن نہیں۔

میرے ماں باپ آپ پر قربان: اپنے پروردگار کے ہاں اور اپنے دل میں ہمیں یاد رکھیں۔

سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کا ادب واحترام

قاضی السبکی صاحب نے بالکل درست فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ادب واحترام اسی طرح ہر مسلمان پر واجب ہے جس طرح آپ ﷺ کی زندگی مبارک میں واجب تھا۔ ابوبکرؓ صدیق اور عمرؓ فاروق کے علاوہ صحابہؓ وصحابیات آپ ﷺ کی قبر مبارک کا جو احترام کیا کرتے تھے، وہی قرآن وسنت کی تعلیم کے عین مطابق تھا، لیکن ان میں سے کسی نے آپ ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر کبھی کسی قسم کا کوئی استغاثہ کیا، نہ کسی معاملے کو سلجھانے کی درخواست کی۔

قاضی صاحب نے حکایات اور خوابوں کے کئی حوالے دیے، لیکن عائشہ ؓ جو آپ ﷺ کی پیاری اور چہیتی زوجہ مطہرہ تھیں۔ ان کو قصاصِ عثمانؓ کے سلسلے میں بصرہ جانے سے خواب ہی کے ذریعے کیوں نہ روکا گیا۔ اگر آپ روک دیتے تو اہل اسلام کے درمیان خون خرابہ نہ ہوتا۔ اسی طرح کے بے شمار مسائل کا اہل اسلام کو سامنا کرنا پڑا، لیکن مدینہ طیبہ میں مدفون ہوتے ہوئے آپ نے ان کا سدباب نہ فرمایا۔ حضرت عثمان ؓ کو چالیس دن مدینہ میں محصور رکھ کر شہید کر دیا گیا۔ پیارے نواسے کو میدانِ کربلا میں ان کے پیاروں سمیت بڑی بے دردی سے خونِ شہادت میں نہلا دیا گیا، لیکن خوابوں کے ذریعے کسی ظالم وشقی اور بدبخت کو ڈرایا نہ گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت یقینی طور پر مستحب ہے، لیکن جو زیارت

نہیں کرتا یا آپ ﷺ سے کسی سفارش کی درخواست نہیں کرتا تو آپ ﷺ کی شان میں بے ادبی نہیں۔ ادب واحترام کرنے والے جن صحابہؓ وصحابیاتؓ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کسی نے کبھی آپ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت نہ کرنے والوں کو گستاخ و بے ادب نہ کہا تھا۔ نہ ہی ان کو قید میں ڈالا یا سزا دی تھی۔

راقم نے اپنی کتاب کے آغاز ہی میں مدینہ جانے والے ہر مسلمان کی دلی اور ذہنی کیفیت کا ذکر کیا ہے۔ اہل اسلام کو جو کچھ ملا، وہ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ ہی کے ذریعہ ملا۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جو آپ ﷺ سے قرآن وسنت کی تعلیم کے مطابق عملی محبت کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔ آپ ﷺ کے منع کردہ کاموں سے بچتا ہے۔ یہود ونصاریٰ اور مشرکوں کے رسم ورواج سے اجتناب کرتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے قبر مبارک کے بجائے مسجد نبوی کی نیت کرتے ہوئے مدینہ جانے کا جو فتویٰ دیا تھا، اس میں انہوں نے دو قول نقل کیے تھے: ایک ان کا تھا کہ جو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد مبارک کے تابع تھا۔ یعنی مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ سفر کے لیے کجاوے نہ باندھے جائیں۔

اس ارشاد مبارک کے مطابق فتویٰ دینے والوں میں کسی نے یہ نہ کہا تھا کہ میں یہ کہتا ہوں۔ جیسا کہ قاضی صاحب نے اپنی رائے کو جہاں چاہا ترجیح دے دی۔

دوسرا قول تھا کہ قبر مبارک کی نیت سے بھی سفر ہو سکتا ہے۔ جبکہ تیسرا قول یہ تھا کہ مسجد نبوی کی نیت کی جائے تو اس میں قبر مبارک کی بھی نیت ہو جائے گی۔ کیونکہ قبر مبارک مسجد نبوی میں ہے۔

چونکہ امام ابن تیمیہؒ پہلے قول والوں کے ساتھ تھے۔ لہٰذا قاضی تقی الدین السبکی جیسے قضاۃ نے اس کو بے ادبی پر محمول کر کے ان کو جیل میں ڈال دیا اور ان سے ان کی

کتابیں اور قلم دوات بھی ہٹوا دیئے۔ جہاں دو سال سے اوپر قید میں رہتے ہوئے وہ اپنے رب سے جا ملے۔ ان کی سیرت سے آگاہی کے لیے راقم کی کتاب امام ابن تیمیہؒ۔ ایک عظیم مصلح دیکھی جا سکتی ہے۔

سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی وفات پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بے مثال خطبے میں جو کہا تھا اگر اس کو سمجھ لیا جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور ہر قسم کے شکوک و ابہام سے صحیح العقیدہ مسلمان محفوظ ہو جاتا ہے۔

صحیح بخاری کی روایت ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حمد وثناء کے بعد فرمایا:

جو محمد ﷺ کی عبادت کیا کرتا تھا، وہ جان لے کہ محمد ﷺ فوت ہو گئے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ اللہ زندہ ہے اور اس نے کبھی مرنا نہیں۔

صحابہؓ میں سے کسی نے اس کی تردید نہ کی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت ہو گئی۔

جہاں تک برزخی زندگی کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون بیان فرما دیا۔ خطاب اگرچہ رسول اللہ ﷺ سے ہے، لیکن قیامت تک ساری امت اس میں شامل ہے۔ ارشادِ مبارک ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ''اور آپ اس زندہ پر توکل کریں کہ جس نے مرنا نہیں اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتے رہیں۔''

عجیب بات یہ ہے کہ ابن الجوزی اور ابن عساکر کے حوالے سے بدو کی جس حکایت کا ذکر شفاء السقام میں ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ابن عساکر نے شیخ ابوطیب مقدسی کے جو اشعار نقل کیے ہیں، ان کا آخری شعر یہ ہے:

اِنْ مَّاتَ اَحْمَدُ فَالرَّحْمٰنُ خَالِقُهٗ
حَیٌّ وَ نَعْبُدُهٗ مَا اَوْرَقَ السَّلَمُ

اگر احمد ﷺ فوت ہو گئے تو ان کے خالق الرحمٰن تو زندہ ہیں اور جب تک سلم درخت پر پتے لگتے رہیں گے ہم اس [رحمٰن] کی عبادت کرتے رہیں گے (سلم درخت کے پتے چمڑے کے رنگ جیسے ہوتے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کو خالصتاً پکارنے اور اسی پر توکل کرنے کی تعلیم دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ شروع ہوا جو سید الانبیاء پر آ کر پایہ تکمیل کو پہنچا اور میدانِ عرفات میں حج الوداع کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ کی آیت نازل فرما دی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا(۳)﴾

”آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کے تمہارے دین ہونے پر میں راضی ہو گیا۔“

لہٰذا مسلمانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ دین اسلام کو ہر قسم کے شرک و بدعت اور خرافات سے پاک رکھیں۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

قاضی السبکی نے ادب و تعظیم کے سلسلے میں احکام القرآن کے حوالے سے یہ بھی نقل کر دیا کہ کسی آدمی نے کہا: جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوں گے تو میں آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ سے نکاح کروں گا تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب کی یہ آیت نازل فرما دی:

﴿وَ لَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا(۵۳)﴾

آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے نکاح کبھی نہ کرنا۔

معمر کی روایت کے مطابق ایسا کہنے والے طلحہ بن عبید اللہ تھے، جو ان دس میں سے ایک تھے جن کو ان کی زندگی میں رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت دے دی تھی۔ فلاں زوجہ سے مراد عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

یہ آیت درحقیقت حجاب کے بارے میں نازل ہونے والی آیت کا حصہ ہے۔ جو یوں ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْكُمْ وَ اللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمًا(۵۳)﴾

اے ایمان والو! نبی ﷺ کے گھروں میں اس وقت داخل ہوا کرو کہ جب تمہیں کھانا کھانے کی اجازت دی جائے۔ اس کے تیار ہونے سے پہلے ہی نہ پہنچ جاؤ، لیکن جب تمہیں بلایا جائے تو داخل ہو جاؤ اور جب کھانا کھا چکو تو واپس چلے جاؤ۔ آپس میں باتیں کرنے کے لیے بیٹھے نہ رہا کرو۔ بے شک اس سے نبی ﷺ کو تکلیف ہوتی ہے۔ وہ تو تم سے شرم کرتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے نہیں شرماتا۔ جب تم ازواجِ مطہرات سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے بہتر ہوگا اور تمہارے لائق نہیں کہ تم رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دو، اور آپ کے بعد تم آپ کی ازواجِ مطہرات سے نکاح کبھی نہ کرنا۔ بے شک یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہوگا۔

یہ آیت زینب بنت جحش کے نکاح کے موقع پر نازل ہوئی۔ جب دعوت کھانے کے بعد بھی چند صحابہ آپ ﷺ کے حجرۂ مبارکہ میں باتوں میں لگے بیٹھے رہے اور ان کے

اس رویے سے آپ ﷺ کو دلی تکلیف ہوئی۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی اور یہ خطاب اہل ایمان سے ہے۔ کسی صحابیؓ کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے کہ اس نے ایسی بات کہی ہو؟ اسی لیے امام ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی (المتوفی 543ھ) اور امام القرطبی (المتوفی 671ھ) نے اپنی اپنی احکام القرآن میں لکھا ہے:

وَ مَا لَكُمْ اَنْ تُوذُوا رَسُوْلَ اللّٰه۔ هٰذَا تَكْرَارٌ لِلْعِلَّةِ وَ تَاكِيْدٌ لِحُكْمِهَا وَ تَاكِيْدُ الْعِلَلِ اَقْوٰى فِى الْاَحْكَام۔

یہ علیت اور اس کے حکم کی تاکید کا تکرار ہے اور علتوں کی تاکید احکام میں زیادہ قوی ہوتی ہے۔ (احکام القرآن ج3 ص1579۔ الجامع لاحکام القرآن ج7 ص228)

قاضی السبکی کی نقل کردہ روایت رُوِیَ سے منقول ہے، جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ امام القرطبی نے بالکل صحیح کہا کہ ایسی بات کوئی منافق ہی کہہ سکتا تھا لیکن قاضی صاحب نے اس کو دلیل بنا لیا۔ ساری کتاب میں قاضی صاحب کا یہی انداز رہا ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی مبارک میں نازل ہونے والی آیت کو آپ کی قبر مبارک کی تعظیم سے جوڑ دیا۔

❀❀❀

۱۴

شفاء السقام کا دسواں باب

اس آخری باب میں قاضی السبکی نے احادیث شفاعت کو جمع کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر قیامت کے دن لوگ انبیاء علیہم السلام سے شفاعت کی درخواست کر سکتے ہیں تو دنیا میں کیوں نہیں کر سکتے۔ قاضی صاحب بھول گئے کہ مسئلہ زندہ سے زندہ کی شفاعت و توسل کا نہیں، بلکہ اصل مسئلہ تو اہل قبور سے شفاعت وتوسل کی درخواست و چاہت کا ہے۔ آخرت میں انبیاء علیہم السلام بھی زندہ ہوں گے اور شفاعت چاہنے والے بھی وہاں زندہ ہوں گے۔ لہٰذا اس میں کوئی اشکال نہیں۔

قاضی صاحب نے شفاعت کے بارے میں مروی احادیث سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ جب تمام انبیاء شفاعت کبریٰ سے معذرت کریں گے اور سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر شفاعت فرمائیں گے اور آپ ؐ کی شفاعت قبول ہو گی۔ اس اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ وغیرہ پر فوقیت وفضیلت حاصل ہو گی۔ لہٰذا ایسی شخصیت کی زیارت کے لیے قدموں کے بجائے سر کے بل چل کر جانا چاہیے۔

قاضی صاحب نے یہ بھی فرما دیا۔ جب مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یا اللہ کی کسی اور مقرب شخصیت سے توسل چاہتے ہیں تو وہ اس کی پرستش نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ توسل ان کو اللہ کی توحید سے خارج نہیں کرتا۔ کیونکہ نفع وضرر رسانی میں اللہ ہی منفرد ہے اور جب یہ جائز ہے تو ایک مؤمن کہہ سکتا ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے اللہ سے درخواست کرتا

ہوں۔اس میں کوئی شرک نہیں۔کیونکہ وہ غیر اللہ کے بجائے اللہ ہی سے سوال کرتا ہے۔

قاضی صاحب نے اپنی کتاب کو درود وسلام کے بارے میں مروی روایات کا ذکر کرنے کے بعد مسند احمد (ج2ص108) کی اس روایت کے ساتھ ختم کیا ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مجھ پر درود بھیجا اور دعا کی کہ اے اللہ! آپ کو قیامت کے روز اپنے ہاں مقرب مقام عطا فرمانا، تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

اختتامی کلمات

قاضی القضاۃ علامہ تقی الدین ابو الحسن علی بن عبدالکافی السبکی کی کتاب شفاء السقام کے جواب میں لکھی گئی ہماری کتاب ''سفر مدینہ کی صحیح نیت'' کے اختتامی کلمات لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ وضاحت کردی جائے کہ یہ کتاب تلاشِ حق کی ایک علمی صورت ہے۔اس میں جن بزرگوں کی روایات کو ضعیف و موضوع ثابت کیا گیا ہے، اس سے ان کی تنقیص وتحقیر ہرگز مقصود ومطلوب نہیں ہے۔خاص طور پر جنہوں نے سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ سے محبت وعقیدت کی بنا پر ضعیف وموضوع روایات کو بھی اپنی کتابوں کا حصہ بنالیا یا غیر مسلموں کے اعتراضات کے رد میں یا سید الانبیاء ﷺ کی عظمت وشان کو اجاگر کرنے کے لیے ایسی روایات کو بھی اپنالیا جن کی صحت میں ائمہ حدیث نے کلام کیا تھا۔یہ ان کی اپنائی ہوئی روایات کی حقیقت انہی جیسے اہلِ علم کی آراء اور قرآن کی روشنی میں واضح کرنے کی ایک کوشش ہے۔

راقم نے حدیث شفاعت چونکہ کتاب کے چوتھے باب کے عنوان ''مسئلہ شفاعت'' کے تحت نقل کردی ہے۔لہٰذا تکرار سے بچتے ہوئے اس میں مذکورہ چند نکات کو ہی زیر

بحث لایا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید الانبیاء ﷺ کا مقام بہت اونچا ہے اور قیامت کے روز امت کی نجات آپ ﷺ کی شفاعت سے ہوگی۔ اسی لیے ہر مسلمان دعا کرتا رہا ہے اور کرتا ہے اور کرتا رہے گا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز آپ ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے اور حوضِ کوثر سے پانی پلوائے اور آپ کے ساتھ جنت میں داخل فرمائے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ شرک کی ابتداء محبت وعقیدت ہی سے ہوئی۔ سورۃ نوح میں جن بتوں کے نام اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں۔ وہ قوم کے نیک صالح لوگ تھے۔ ان کے فوت ہونے پر ان کے بت بنا لیے گئے اور شرک اللہ کی مخلوق میں رائج ہو گیا۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ مکہ پہنچ گیا۔ جس کی بیخ کنی کے لیے سید الانبیاء ﷺ کو مبعوث کیا گیا۔

اہل مکہ اللہ تعالیٰ کو ہی خالق و مالک مانتے تھے۔ قربِ الٰہی کے لیے اپنے بتوں کو سفارشی بنایا کرتے تھے۔ مصائب میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو پکارا نہ کرتے تھے۔ بیت اللہ پر ہاتھیوں والا حملہ آور ہوا تو عبدالمطلب نے اللہ کو ہی پکارا تھا۔

سورۃ العنکبوت میں مشرکین کے بارے میں ہے:

”جب کشتیوں میں سوار ہوتے تو خالصتاً اللہ کو پکارا کرتے تھے۔“ (۶۵)

سورۃ یونس میں اللہ نے خود ان کا عقیدہ بیان فرمایا:

”ان کا کہنا تھا کہ جن کی عبادت ہم کرتے ہیں، یہ اللہ کے نزدیک ہمارے سفارشی ہیں۔“ (۱۸)

سورۃ الزمر میں اللہ کا فرمان ہے، کافروں و مشرکوں کا بیان ہے: ”ہم اپنے معبودوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کرتے ہیں۔“ (۳)

اس کے باوجود ابراہیم علیہ السلام یا اسماعیل علیہ السلام کو اپنی دعاؤں یا مصائب میں سفارشی نہیں بناتے تھے۔ سیدھا اللہ کو پکارا کرتے تھے۔ اللہ کو سیدھا نہ پکارنے پر وہ مشرک و کافر قرار پائے۔

اللہ تعالیٰ نے جب حکم دے دیا: ''مجھ کو پکارو، میں تمہاری پکار سنوں گا۔'' (غافر:۶۰)

''مجھے جو بھی پکارتا ہے، اس کا جواب دیتا ہوں۔'' (البقرہ:۱۸۶)

اہل مکہ بھی جانتے تھے کہ نفع ونقصان کا مالک صرف اللہ ہے، لیکن اللہ تک پہنچنے کے لیے سفارشی تلاش کرتے تھے۔ جو بات قاضی صاحب کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ بھی ویسے ہی عقیدہ پر قائم تھے۔ یہاں تک کہ اللہ نے ان کے دلوں میں حق ڈال دیا اور وہ راہِ حق پر آگئے۔

رسول اللہ ﷺ کی قیامت کے روز شفاعت سے آپ کی فضیلت وفوقیت ثابت کر کے قاضی صاحب نے فرمایا: آپ ﷺ کی زیارت کے لیے سر کے بل جانا چاہیے۔

پہلی بات تو یہاں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے نبیوں پر اپنے آپ کو فضیلت دینے سے منع فرمایا۔ جیسا کہ صحیح مسلم (فضائل موسیٰ ج 2 ص 267) میں منقول ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲۸۵)﴾

رسول اللہ ﷺ اور مومن اس پر ایمان لائے جو ان کے رب کی طرف سے رسولؐ کی طرف نازل کیا گیا۔ تمام اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئے اور رسولوں میں ہم کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے۔

چلیے فضیلت وفوقیت والی بات کو تسلیم کر بھی لیں تو سوال شفاعت والی حدیث کے حوالے سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب آدم، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام

معذرت کرلیں گے تو میں بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونے کی اجازت چاہوں گا جو مل جائے گی۔ پھر اللہ کی وہ حمد وثنا بیان کروں گا جو اس وقت میرے دل میں ڈالی جائے گی۔ پھر میں سجدے میں گر جاؤں گا اور مجھ سے کہا جائے گا: سر اٹھائیں، شفاعت کریں، قبول ہوگی۔

چنانچہ آپ ﷺ اپنی امت کی بات کریں گے تو آپ ﷺ سے کہا جائے گا: جہنم میں سے اس کو نکال لائیں کہ جس کے دل میں گیہوں یا جو کے دانے برابر ایمان ہے۔ آپ جہنم میں سے ان کو نکال لائیں گے۔

پھر آپ دوسری، تیسری مرتبہ کے بعد جب چوتھی مرتبہ ان کی شفاعت کرنے کی درخواست کریں گے تو جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ ہی کہا تھا تو آپ سے کہا جائے گا یہ تمہارا کام نہیں۔ قسم ہے مجھے میری عزت و کبریائی اور اپنی بڑائی کی، میں ان لوگوں کو جہنم سے نکال لوں گا جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا تھا۔

سوال یہ ہے کہ سفارش کرنے والا زیادہ عزت وعظمت والا ہوتا ہے یا وہ جس کے پاس سفارش کی جاتی ہے۔

خالق و مالک حاضر ہونے کی اجازت دے۔ اسی کے سامنے سید الانبیاء ﷺ سجدہ ریز ہو جائیں۔ شفاعت کی درخواست کریں اور قبول ہو جائے۔ جو لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کو شفاعت کے بغیر ہی جہنم سے نکال لے وہ بڑا عزت وعظمت والا ہوگا یا درخواست کرنے والا۔

ظاہر ہے کہ خالق و مالک سے بڑا کوئی ہو ہی نہیں سکتا تو پھر اسی کے حکم کے مطابق اسی کو کیوں نہ پکارا جائے۔ جب اس نے پکار سننے کے لیے کوئی شرط عائد نہیں کی اور نہ ہی سید الانبیاء ﷺ نے اس کی کوئی نشاندہی کی تو پھر ایک غیر متنازع مسئلہ کو متنازع بنا کر امت کو راہِ حق سے کیوں دور کیا جائے۔

رسول اللہ نے اپنی دعوتِ حق کا آغاز اس جملہ سے فرمایا تھا کہ **قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا۔** لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہو فلاح پا جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ قیامت کے دن اسی جملہ کا اقرار کرنے والوں کو بغیر کسی شفاعت کے خود ہی جہنم سے نکالے گا، کیونکہ وہ بڑا ہی رحیم و کریم ہے۔

صحیح بخاری (رقم 5999) اور صحیح مسلم (رقم 2754) میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ کے پاس چند قیدی لائے گئے۔ ان میں ایک عورت تھی جو اپنے بچے کو تلاش کر رہی تھی۔ اس نے جب بچے کو پایا تو اس کو اٹھایا، سینے سے لگایا اور اپنا دودھ پلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینکے گی؟ ہم نے عرض کیا: اللہ کی قسم! اگر اس کو بچانے پر قادر ہو تو کبھی نہیں پھینکے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَلّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ هٰذِهٖ لِوَلَدِهَا۔

جتنی یہ اپنے بیٹے پر مہربان ہے۔ اللہ اس سے بہت زیادہ اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح بخاری (رقم 3445) میں اپنا ارشاد مبارک ہے: ”میرے بارے میں اس طرح غلو نہ کرنا جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا۔“

لہٰذا حق یہی ہے کہ مدینہ جانے کے لیے مسجد نبوی کی نیت کی جائے اور وہاں پہنچ کر تحیۃ المسجد کے بعد قبر مبارک پر جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا جائے اور آپ کے دو رفیقوں کو بھی سلام کہا جائے۔

مصادر و مراجع

۱- تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ، القران الحکیم

۲- الامام ابو جعفر محمدؒ بن جریر الطبری، جامع البیان، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر

۳- الامام فخر الدین محمد الرازی، التفسیر الکبیر، مطبعۃ عامرہ، استنبول

۴- علامہ علاؤ الدینؒ علی بن محمد الخازن، تفسیر الخازن، دار الکتب العربیہ پشاور

۵- الامام محمودؒ بن عمر الزمخشری، الکشاف، نشر ادب الحوزہ

۶- الامام عبداللہ بن احمد بن محمود، مدارک التنزیل، دار الکتب العربیۃ پشاور

۷- الامام ابو عبداللہ محمد بن احمد القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت

۸- الامام ابو بکرؒ محمد بن عبداللہ ابن العربی، احکام القرآن، دار الجید، بیروت

۹- الامام الحافظ ابو الفداء اسمٰعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، سہیل اکیڈمی، شاہ عالم لاہور

۱۰- العلامہ محمد بن احمد المحلی، جلالین، دار المعرفۃ، بیروت

۱۱- العلامۃ عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی، جلالین، دار المعرفۃ، بیروت

۱۲- العلامۃ جلال الدین السیوطی، الدر المنثور، محمد امین درج، بیروت

۱۳- الامام محمد بن اسمٰعیل البخاری، صحیح البخاری، مطبع نور محمد، کراچی

۱۴- الامام مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری، الصحیح لمسلم، مطبع اصح المطابع، کراچی

۱۵- الامام ابو عبدالرحمٰن احمدؒ بن شعیب النسائی، سنن النسائی، المکتبہ السلفیہ، لاہور

۱۶- الامام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی، جامع الترمذی، قرآن محل، کراچی
۱۷- الامام ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ، سنن ابن ماجه، مطبع نور محمد، کراچی
۱۸- الامام سلیمانؒ بن الاشعث ابوداؤد السجستانی، سنن ابو داؤد، مطبع اصح المطابع، کراچی
۱۹- الامام احمد بن حنبلؒ، مسند احمد بن حنبل، دار صادر، بیروت
۲۰- الامام محمدؒ عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل، سنن الدارمی، مطبع النظام الواقع، کانپور
۲۱- الامام ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی، السنن الکبری، دار صادر، بیروت
۲۲- علامہ احمد عبدالرحمٰن البنا ساعاتی، الفتح الربانی، دار الحدیث، القاہرہ
۲۳- الحافظ ابوعبداللہ الحاکمؒ نیشاپوری، المستدرک، مکتب المطبوعات الاسلامیہ، بیروت
۲۴- علامہ محمد بن علی بن محمد الشوکانی، نیل الاوطار، مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر
۲۵- علامہ جلالؒ الدین السیوطی، تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک، مطبعہ مصطفیٰ محمد، مصر
۲۶- الامام ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب، مشکوۃ المصابیح، مطبع اصح المطابع، کراچی
۲۷- الشیخ علیؒ بن سلطان محمد القاری، مرقاۃ شرح مشکوۃ، مکتبہ امدادیہ، ملتان
۲۸- امام محمد بن ادریس الشافعی، الام، دار المعرفۃ، بیروت
۲۹- الامام الامیر علاء الدین علیؒ بن بلبان الفارسی، صحیح ابن حبان، المکتبۃ الاثریۃ، سانگلہ ہل
۳۰- الشیخ ابوعبداللہ محمد الحکیم الترمذی، نوادر الاصول، المکتبۃ العلمیۃ، المدینہ المنورہ
۳۱- الامام الحافظ احمدؒ بن علی بن حجر عسقلانی، فتح الباری، المطبعۃ السلفیہ، القاہرہ
۳۲- علامہ ابوالعباس احمد بن محمد القسطلانی، ارشاد الساری، دار احیاء التراث، بیروت
۳۳- علامہ محمد بن یوسفؒ بن علی الکرمانی، البخاری بشرح الکرمانی، دار احیاء

التراث العربی، بیروت

۳۴- علامہ بدرالدین ابو محمد محمودؒ بن العینی ،عمدة القاری، مکتبہ مدینہ اردو بازار، لاہور

۳۵- الامام ابوداوٗد سلیمانؒ بن الجارود الفارسی، ابو داؤد الطیالسی، انجمن اہلحدیث، گجرات

۳۶- الامام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ، صحیح ابن خزیمة، المکتب الاسلامی، بیروت

۳۷- الامام علیؒ بن عمر الدارقطنی ،سنن الدارقطنی، دارالمحاسن للطباعۃ، القاہرہ

۳۸- الامام ابوبکر عبدالرزاق ابن ھمام، المصنف عبدالرزاق، المکتب الاسلامی، بیروت

۳۹- الامام ابوبکر عبداللہؒ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان بن ابی شیبہ، مصنف بن ابی شیبہ، مولانا ابوالکلام اکادمی، حیدرآباد

۴۰- الامام ابومحمد علی بن احمد بن سعد بن حزم، المحلیٰ، ادارۃ الطباعۃ المنیر یۃ، مصر

۴۱- الحافظ علی بن ابی بکر الھیثمی، مجمع الزوائد و منبع الفوائد، دارالکتاب العربیہ، بیروت

۴۲- الحافظ نورالدین علیؒ بن ابی بکر الھیثمی، موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان، المطبعۃ السّلفیہ، القاہرہ

۴۳- الحافظ عبدالعظیمؒ بن عبدالقوی المنذری، الترغیب و الترھیب، مطبعۃ مصطفیٰ البابی، مصر

۴۴- الحافظ ابوالفضل احمدؒ بن علی بن محمد بن حجر عسقلانی، تلخیص الحبیر، دارالکتب العلمیہ، بیروت

۴۵- الامام ابوزکریا یحییٰؒ بن شرف النووی، شرح الکامل للنووی، مطبع اصح المطابع، کراچی

۴۶- الامام الکبیر ابوبکر عبداللہ بن الزبیر الحمیدی، المسند للحمیدی، المکتبہ السّلفیہ، المدینہ المنورہ

۴۷- الحافظ ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، المعجم الکبیر، مکتبۃ ابن تیمیۃ،

القاہرہ

۴۸- الحافظ ابوالقاسم سلیمانؒ بن احمد الطبرانی، المعجم الصغیر، دارالکتب العلمیۃ، بیروت

۴۹- الامام الحافظ ابوجعفر الطحاوی، شرح معانی الآثار، المطبع الاسلامی، لاہور

۵۰- الشیخ نصیرالدین محمد بن عبداللہ السامری، المستوعب، مکتبۃ المعارف، الریاض

۵۱- الامام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن محمد بن علی الجوزی الشافعی، مثیر الغرام الساکن الی اشرف الاماکن، دارالکتب العلمیۃ، بیروت

۵۲- الشیخ ابوعبداللہ عبیداللہ بن محمد بن بطۃ ، الابانۃ عن شریعۃ الفرقۃ الناجیۃ، دارالکتب العلمیہ ، بیروت

۵۳- الامام ابوبکر محمدؒ بن الحسین الآجری، کتاب الشریعۃ، دارابن حزم، بیروت

۵۴- الامام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن محمد بن علی الجوزی، العلل المتناہیۃ، مکتبۃ المثنیٰ، بغداد

۵۵- الامام ابوعبداللہ محمدؒ بن اسماعیل البخاری، الادب المفرد، مکتبۃ محب الدین الخطیب، القاہرہ

۵۶- ڈاکٹر صبحی صالح، علوم الحدیث، ملک برادرز کارخانہ بازار، فیصل آباد

۵۷- الامام الحافظ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی، کتاب الکفایۃ، المکتبۃ العلمیۃ، المدینہ المنورہ

۵۸- الامام ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامۃ، المغنی، مکتبۃ الجمہوریۃ العربیہ، مصر

۵۹- الحافظ ابونعیم احمدؒ بن عبداللہ الاصبہانی، حلیۃ الاولیاء، دارالکتب العربیۃ، بیروت

۶۰- العلامۃ محمدؒ بن عبدالباقی الزرقانی المالکی، الزرقانی علی المواہب اللدنیۃ، دارالمعرفۃ، بیروت

۶۱- شیخ رجال السیرۃ محمد بن اسحاق، السیرۃ النبویۃ لابن ہشام، مطبعۃ مصطفیٰ البابی مصر

۶۲- القاضی ابوالفضل عیاض الیحصبی، الشفآء، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر

۶۳- الامام ابومحمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ، المعارف، نور محمد اصح المطابع، کراچی

۶۴- الامام ابو المواھب عبدالوہاب بن احمد بن علی الانصاری المعروف بالشعرانی، المیزان الکبری، مطبعۃ مصطفیٰ البابی، مصر

۶۵- الامام سحون بن سعید التنوخی عن الامام ابن القاسم، المدونۃ الکبری، دارالفکر، بیروت

۶۶- الفاضل الفقیہ ابواللیث السمرقندی، فتاوی النوازل، مطبعۃ شمس الاسلام، حیدر آباد، دکن

۶۷- العلامۃ مولانا الشیخ نظام و جماعۃ، الفتاوی الھندیہ، نورانی کتب خانہ، پشاور

۶۸- العلامۃ السید محمد امین ابن عابدین، رد المحتار، المطبعۃ الکبری الامیریۃ، مصر

۶۹- الشیخ الامام کمال الدین محمد بن عبدالواحد، فتح القدیر، المکتبہ الرشیدیہ، کوئٹہ

۷۰- مولانا جلال الدین الخوارزمی، الکفایۃ، المکتبۃ الرشیدیہ، کوئٹہ

۷۱- السید علی بن عثمان ہجویریؒ، کشف المحجوب، مطبع شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور

۷۲- العلامۃ تاج الدین ابونصر عبدالوہاب، طبقات الشافعیۃ الکبری، المطبعۃ الحسینیۃ، مصر

۷۳- الامام القاضی ابوالحسین محمدؒ بن محمد بن الحسین ابن ابی یعلی الحنبلی، طبقات الحنابلۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت

۷۴- الحافظ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عبدالہادی، العقود الدریۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت

۷۵- الشیخ مرعی بن یوسف الکرمی الحنبلی، الکواکب الدریۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت

۷۶- الحافظ الامام احمد بن علی بن محمد ابن حجر عسقلانی، الدرر الکامنۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت

۷۷- الامام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان الذھبی، میزان الاعتدال، داراحیاء الکتب العربیہ، مصر
۷۸- الامام ابوعمر بن عبدالرحمٰن الشہر زوری، علوم الحدیث لابن صلاح، المکتبۃ العلمیۃ، المدینہ المنورۃ
۷۹- الامام ابومحمد عبدالرحمٰنؒ الرازی، علل الحدیث، مکتبۃ المثنیٰ، بغداد
۸۰- الامام ابوعبداللہ شمس الدین الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، داراحیاء التراث العربی، بیروت
۸۱- الحافظ ابوالفضل احمدؒ بن علی بن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب، دائرۃ المعارف، حیدرآباد، دکن
۸۲- الامام ابو احمد عبداللہ بن عدی الجرجانی، الکامل فی ضعفآء الکبیر، المکتبۃ الاثریۃ، سانگلہ ہل
۸۳- الامام ابو جعفر محمد بن عمرو بن موسیٰ بن محمد العقیلی، کتاب الضعفآء الکبیر، دارالکتب العلمیۃ، بیروت
۸۴- الامام الجلیل ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل البخاری، کتاب التاریخ الکبیر، دارالباز، مکہ مکرمہ
۸۵- العلامۃ علی بن محمد بن سلطان ملا القاری، الموضوعات الکبری، المکتبہ الاثریۃ، سانگلہ ہل
۸۶- الامام ابو الفرج عبدالرحمٰنؒ بن علی بن الجوزی، کتاب الموضوعات، محمد عبدالمحسن، المدینہ المنورہ
۸۷- الشیخ الامام محمدؒ بن علی الشوکانی، الفوائد المجموعۃ، مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ، مصر
۸۸- الامام احمدؒ بن عبداللہ الخزرجی، خلاصۃ تہذیب لتہذیب الکمال، المکتبہ

الاثریۃ، سانگلہ ہل

۸۹- الحافظ الامام ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابی حاتم الرازی، کتاب الجرح والتعدیل، دائرۃ المعارف، حیدرآباد، دکن

۹۰- الامام ابو العباس احمدؒ بن محمد بن ابی بکر بن خلکان، وفیات الاعیان، منشورات الشریف الرضی، قم

۹۱- الامام ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد البستی، کتاب الثقات، دائرہ المعارف حیدر آباد، دکن

۹۲- الحافظ ابوالفضل احمدؒ بن علی بن حجر عسقلانی، لسان المیزان، دارالکتب العلمیۃ، بیروت

۹۳- الامام ابو حاتم محمدؒ بن حبان بن احمد البستی، کتاب المجروحین، دارالصمیعیۃ، السعودیہ العربیہ

۹۴- الامام جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی، اللآلی المصنوعۃ، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر

۹۵- الامام ابوزرعۃ عبداللہ بن عبدالکریم بن یزید الرازی، کتاب الضعفآء، مکتبۃ ابن قیم، المدینہ المنورہ

۹۶- الامام ابوالحسن علی بن الدارقطنی، کتاب الضعفآء والمتروکین، مؤسسۃ السلفیۃ، القاہرہ

۹۷- العلامۃ الحافظ ابوالفضل محمد بن طاہر بن احمد القدسی، تذکرۃ الموضوعات، المطبعۃ السلفیۃ، القاہرہ

۹۸- الامام ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی، کتاب الضعفآء، دارالثقافۃ مطبعۃ النجاح

۹۹- الامام ابوعبداللہ محمدؒ بن اسمٰعیل البخاری، کتاب الضعفآء الصغیر، دارالوعی، حلب

۱۰۰- الامام الحافظ ابوعبدالرحمٰنؒ احمد بن شعیب النسائی، کتاب الضعفاء والمتروکین، دارالوعی، حلب

۱۰۱- الامام شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذہبی، سیر اعلام النبلاء، موسسہ الرسالۃ، بیروت

۱۰۲- الحافظ ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی، تاریخ بغداد، دارالکتاب العربی، بیروت

۱۰۳- الحافظ ابوالفداء اسمٰعیل بن عمر بن کثیر الشافعی، البدایۃ والنہایۃ، مکتبۃ المعارف، بیروت

۱۰۴- المورخ، الفقیہ والادیب ابوالفلاح عبدالحی ابن العماد، شذرات الذہب، داراحیاء التراث العربی، بیروت

۱۰۵- الامام محمدؒ بن احمد بن عثمان الذہبی، العبر فی خبر من غبر، دارالکتب العلمیۃ، بیروت

۱۰۶- الحافظ المورخ ابوالقاسم علیؒ بن الحسن المعروف ابن عساکر، تہذیب تاریخ ابن عساکر

۱۰۷- العلامۃ المورخ ابوالحسن علیؒ بن ابی الکرم المعروف ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، دارالکتاب العربیہ، بیروت

۱۰۸- الامام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر القرطبی، التذکرۃ فی احوال الموتیٰ، المکتبۃ العصریۃ، بیروت

۱۰۹- الشریف الرضی شرحہ الاستاذ محمدؒ عبدہ، نہج البلاغۃ، دارالمعرفۃ، بیروت

۱۱۰- المحدث المورخ محمدؒ بن سعد، الطبقات الکبریٰ، دارالفکر، بیروت

۱۱۱- الامام الحافظ قاضی القضاۃؒ ابن حجر عسقلانی، کتاب الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، مطبعۃ السعادۃ، مصر

۱۱۲- الامام ابوعمر یوسف بن عبداللہ المعروف بابن عبدالبر، کتاب الاستیعاب، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

۱۱۳- العلامہ ابو المعالی محمود شکری آلوسی، غاية الامانی فی الرد علی النبهانی (انگریزی ترجمہ)، جمعیت العلوم الاثریۃ، جہلم

۱۱۴- الامام الحافظ یوسف بن الزکی عبدالرحمٰن بن یوسف المزی، تحفة الاشراف، دارالباز، مکۃ المکرّمۃ

۱۱۵- الامام الحافظ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عبدالهادی، الصارم المنكی، ادارة الترجمة والتاکیف، فیصل آباد

۱۱۶- الامام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی، دلائل النبوة

۱۱۷- الحافظ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی، حسن المحاضرة فی تاریخ مصر، داراحیاء التراث العربی، مصر

۱۱۸- ڈاکٹر فرید ایم شافعی، Egyptan Islamic Heritage، منسٹری آف انفرمیشن، قاہرہ

۱۱۹- لجنۃ الاشراف: الاستاذ الدکتور محمد الاسعدی، الاستاذ الدکتور عزالدین اسماعیل، الاستاذ سعد درویش، الازهر الشریف القاهره، مطابع الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب

۱۲۰- تقی الدین ابوالعباس احمد بن علی المقریزی، المواعظ والاعتبار المعروف بالخطط المقريزية، مؤسسۃ الحلبی وشرکاوٗہ القاہرہ

مصنف کی دیگر تصنیفات

۱- تفسیر فضل القرآن......(5 جلدیں)
۲- اسلام میں عورت کی سربراہی کا کوئی تصور نہیں
۳- سیرت مولانا ثناء اللہ امرتسری
۴- جنازے کے احکام
۵- انکم ٹیکس کی شرعی حیثیت
۶- رجب کے کونڈے
۷- آخری چہار شنبہ
۸- پریس پر پابندی کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر
۹- کفن پر دعائیہ کلمات لکھنے کی اصل
۱۰- رجم کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کا علمی جائزہ
۱۱- امام ابن تیمیہ عظیم مصلح
۱۲- معاشرے کو مثالی بنانے والے دس احکام
۱۳- عیسائیوں کے دلائل واعتراضات اور ان کے جوابات
۱۴- زنا کی شرعی سزا
۱۵- قادیانی لاہوری مرزائی دائرہ اسلام سے خارج کیوں ہے

سفر مدینہ کی آئینی حیثیت

زیارت قبر مبارک، سفر زیارت، شفاعت

توسل، انبیاء اور صالحین کے حقوق وغیرہ